ڈاکٹر قدیر خان اور ایٹمی پاکستان

شاہد نذیر چوہدری

محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر کی زندگی انتھک محنت اور لگن کی ایک عظیم داستان۔ ایک ایسے شخص کی داستان جس نے ایٹمی پاکستان کی تکمیل کیلئے اپنی زندگی کو وقف کر دیا۔ شاہد نذیر چوہدری کی یہ کتاب اُردو پوائنٹ کے قارئین کی خدمت میں حاضر ہے جسے روزانہ قسط وار شائع کیا جائے گا۔ آپ بھی محسن پاکستان کی اس عظیم داستان کو پڑھیے اور جانئے کہ کن مصائب اور مشکلات سے گزر کر ایٹمی پاکستان کے خواب کی تکمیل ہوئی! اور محسن پاکستان کے ساتھ کیا سلوک برتا گیا۔

قائداعظم کے بعد اگر پاکستان کی بقا سلامتی اور تحفظ کے لئے کسی ایک فرد نے بے لوث حب الوطنی کے جذبے سے قوم پر احسان کیا تو اس کا نام ہے ڈاکٹر عبدالقدیر خاں۔ ڈاکٹر صاحب کی زندگی اور خدمات کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جاتا رہے گا۔ یہ قوم اپنے محسنوں کو کبھی فراموش نہیں کرتی خواہ ان جیسی عظیم شخصیات کو دھندلانے کے لئے کوئی کیسی بھی کوشش کرتا رہے۔
شاہد نذیر چوہدری "ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور ایٹمی پاکستان" اس بارے میں ایک تحقیقی اور ٹھوس کوشش ہے جس میں محض جذباتیت کو پیش نظر نہیں رکھا گیا بلکہ دستاویزی ثبوت اور شہادتوں کے ذریعے حقائق پیش کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت اس کا چوتھا ایڈیشن شائع ہو چکا ہے۔ شاہد نذیر چوہدری نے ہر ایڈیشن میں مفید اور معلومات افزا اضافے کئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کام کے طریقہ کار اور ان کی ان تھک جدوجہد کو بہت تفصیل کے ساتھ اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔ کتاب میں بعض چونکا دینے والے حقائق بھی پیش کئے گئے ہیں۔ اس کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس کتاب کے مندرجات میں خود ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے ذاتی تاثرات اور ان سے حاصل کردہ معلومات بھی شامل ہیں۔ ایک احسان مند قوم کی جانب سے اپنے عظیم فرزند کے لئے اس سے بڑا اخراج تحسین اور نہیں ہو سکتا۔ قاری کے سامنے اس موضوع پر جملہ معلومات اور تصویر کے تمام رخ پیش کر دیئے گئے ہیں۔
اس کتاب کو مختلف ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں ان کے بارے میں صاحب رائے حضرات کے تاثرات پیش کئے گئے ہیں دوسرا باب خود ڈاکٹر صاحب کے تحریر کردہ مضامین پر مشتمل ہے۔ تیسرے باب میں ان کاوشوں، تلخیوں، آزمائشوں اور رکاوٹوں کا ذکر کیا گیا ہے جن سے خود انہیں دو چار ہونا پڑا۔ اس طرح باقی ابواب میں بھی اس موضوع کے ہر ممکن پہلو کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کتاب کی تیاری کے دوران میں مصنف بذات خود ڈاکٹر عبدالقدیر خان سے ملاقات کا شرف بھی حاصل کرتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کے بارے میں کتابیں اور بھی لکھی جائیں گی لیکن زیر نظر کتاب کی اہمیت ہمیشہ قائم رہے گی۔
اس کتاب کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس کتاب کو ڈاکٹر عبدالقدیر خاں نے مستند قرار دیا ہے۔
ڈاکٹر قدیر خاں کے اس کتاب کے بارے میں تاثرات۔
"شاہد نذیر چوہدری ایک جرأت مند باریک بین اور محب وطن صحافی ہیں۔ انہوں نے اپنی اس تصنیف کے ذریعے پاکستان کی ایٹمی صلاحیتوں کو جہاں اجاگر کیا ہے وہاں ایسے مخفی اور سچائی پر مبنی واقعات کو بھی منظر عام پر لے آئے ہیں جن سے آگاہی ہر محب وطن پاکستانی کو ہونی چاہئے تا کہ انہیں معلوم ہو کہ پاکستان ایٹمی قوت بننے سے قبل کن مسائل، مصائب اور سازشوں کے دور سے گزرا ہے۔ اس کتاب میں درج واقعات کہوٹہ پراجیکٹ اور میری ذات کے بارے میں مستند تاریخ کا درجہ رکھتے ہیں۔ پاکستان کو ایٹمی صلاحیتوں سے محروم رکھنے کی سازشیں اگر کامیاب ہو جاتیں تو آج پاکستان کی حالات کیا ہوتی؟ اس کا اندازہ ہر پاکستانی بخوبی لگا سکتا ہے۔ شاہد نذیر چوہدری نے ایسی سازشوں اور خدشات کی بڑے جاندار اور بولڈ انداز میں تصویر کشی کی ہے۔"

معروف صحافی شاہد نذیر چوہدری کی معرکۃ الآرا تصنیف " ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور ایٹمی پاکستان " کی پہلی قسط ملاحظہ فرمائیے ۔۔۔اور ملاحظہ فرمائیے ہر روز ایک نئی قسط!

شاہد نذیر چوہدری ایک جرات مند باریک بین اور محب وطن صحافی ہیں ۔انہوں نے اپنی اس تصنیف کے ذریعے پاکستان کی ایٹمی صلاحیتوں کو جہاں اجاگر کیا ہے وہاں ایسے مخفی اور سچائی پر مبنی واقعات کو بھی منظر عام پر لے آئے ہیں ۔اس کتاب میں درج واقعات کہوٹہ پراجیکٹ اور ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی ذات کے بارے میں مستند تاریخ کا درجہ رکھتے ہیں ۔یہ ہمارے نہیں بلکہ خود ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے الفاظ ہیں ۔

☆☆☆

ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور ایٹمی پاکستان

شاہد نذیر چوہدری:

ایٹمی ترقی کا خواب اور پاکستان

(سائنسی وسماجی موضوعات پر لکھے گئے ڈاکٹر خان کے مضامین)

آج ترقی یافتہ ممالک اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں کہ ہم نے ایٹمی دھماکے واقعی اپنے زور بازو پر کیے ہیں ۔وہ یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ایسا ملک جس کی خواندگی کی شرح صرف 32 فیصد ہے ایک ایٹمی قوت کیونکر بن سکتا ہے؟ وہ آئے دن ہم پر الزامات لگاتے رہتے ہیں ۔کبھی وہ کہتے ہیں کہ ہم نے یورپی ممالک سے ایٹمی راز اور نقشہ جات چوری کیے ہیں ۔کبھی کہتے ہیں کہ ہم نے میزائل سازی اور ایٹمی ٹیکنالوجی کے حصول میں کسی ملک سے مدد لی ۔دراصل حقیقت یہ ہے کہ:

جب اس انگارہ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کرلیتا ہے یہ بال و پر روح الامیں پیدا

غور طلب بات یہ ہے کہ جب ہم 32 فیصد شرح خواندگی ہونے کے باوجود ایک ایٹمی قوت بن سکتے ہیں تو 100 فیصد شرح خواندگی ہونے پر ہمارا ملک ترقی کی کن منازل کو طے کرسکتا ہے؟

آج سے 26 سال قبل جب میں نے اس اہم اور حساس پراجیکٹ پر کام کا آغاز کیا تھا تو اس وقت نہ تو ہمیں تربیت یافتہ عملہ دستیاب تھا اور نہ اس بڑے پراجیکٹ کے لئے کوئی انفراسٹرکچر موجود تھا ۔ہم نے اپنے کام کا آغاز صفر سے کیا تھا اس لئے ہم میں سے بیشتر لوگ اسے دیوانے کا خواب سمجھتے تھے ،ان کا خیال تھا کہ ایٹمی قوت بننے کے لئے پاکستان کو کم از کم نصف صدی درکار ہے ۔آج ماضی کے وہ تمام واقعات میرے سامنے ایک فلم کی صورت چل رہے ہیں ،اس موقع پر مجھے اکثر علامہ اقبال کا وہ شعر یاد آجاتا ہے ۔

کبھی عرش پر کبھی فرش پر کبھی ان کے در کبھی دربدر
غم عاشقی تیرا شکریہ میں کہاں کہاں سے گزر گیا

لیکن خدا کے فضل وکرم سے ہم نے 1978ء میں یورینیم کی افزودگی میں کامیابی حاصل کی اور صرف 3 سال کے قلیل عرصے میں یورینیم کی افزودگی کی مطلوبہ صلاحیت حاصل کر لی ۔دسمبر 1984ء میں اگر چاہتے تو بآسانی نیوکلیئر ٹیسٹ کرسکتے تھے لیکن جنرل ضیاء الحق مرحوم نے بین الاقوامی حالات کے پیش نظر جوہری دھماکہ کرنا مناسب نہیں سمجھا ۔(اس کی تصدیق سابق صدر غلام اسحاق خان کے خط سے ہو جاتی ہے جو کتاب کے آخر میں شامل ہے ۔)

1998ء کا سال کے۔آر۔ایل کے لئے کامیابوں کا سال تھا ۔خدا کا شکر ہے کہ اس سال پاکستان نے نہ صرف 28 مئی کو ایٹمی دھماکے کیے بلکہ 6 اپریل کو پاکستان کے پہلے زمین سے زمین تک 1500 کلومیٹر تک مار کرنے والے بلیسٹک میزائل غوری 1 کا کامیاب تجربہ بھی کیا ۔غوری 11 کا کامیاب تجربہ 14 اپریل 1999ء کو کیا گیا ۔میں خدا کا شکر گزار ہوں کہ اب تک حکومت نے کے۔آر۔ایل کو جو بھی مشن دیا اس نے کامیابی کے ساتھ پورا کیا اور میں حکومت کو یقین دلاتا ہوں کہ آئندہ بھی ہمیں جو ذمہ داری سونپی جائے گی اسے ہم احسن طریقے سے پوری کریں گے ۔

سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد عالمی سطح پر کئی انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں اور سپر طاقتوں کے معیار کو ماپنے کی کسوٹی ٹھہری کہ ترقی یافتہ قوم ہونے کا اندازہ اس کی عسکری قوت یا اس کے جغرافیہ کو دیکھ کر نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس

کے ترقی یافتہ ہونے کا معیار اس کی برآمدات، زرمبادلہ کے ذخائر اور اس کی فی کس آمدنی ہے جاپان کی مثال ہمارے سامنے ہے جو ایٹمی یا عسکری قوت نہیں لیکن وہ اقتصادی طور پر اتنا مضبوط ہے کہ بین الاقوامی سطح پر کسی بھی دباؤ کو وہ خاطر میں نہیں لاتے اور اپنا نقطہ نظر منوانے کی جرات رکھتے ہیں۔

وہ قوم جو ایک دور میں ایک تہائی دنیا پر قابض تھی آج وہ پسماندگی کا شکار ہے آخر وہ کیا وجوہات ہیں جن کی بناء پر آج ہم تمام اقوام عالم سے پیچھے رہ گئے ہیں؟

اسلامی نشاۃ ثانیہ کا دور عالم اسلام کا عظیم دور تھا۔ تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ اس دور میں عرب میں ایسی ایسی درسگاہیں قائم کی گئی تھیں کہ جہاں دنیا کے تمام علوم پر تحقیقی کام ہوتا تھا اور یہی وہ دور ہے کہ جب عالم اسلام نے الفارابی، ابن سینا، ابن رشد، خوارزمی، رازی، ابن الہیثم، مسعودی، ابوالوفا، البیرونی، طوسی نصیرالدین، ابن نفیس، ابن طفیل، الکندی جیسے عظیم مفکر اور فلاسفر اور سائنسدان پیدا کیے تھے ان کے تحقیقی کاموں سے آج بھی دنیا فیضیاب ہو رہی ہے یہاں تک کہ ایک وہ شہر جسے لوگ دنیا کے کسی گوشے کا گمنام شہر کہتے ہیں وہاں بھی 16 ویں صدی میں 25 ہزار طلباء تعلیم حاصل کرتے تھے میرا مطلب مالی کے شہر ٹمبکٹو سے ہے۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آج عالم اسلام میں ان جیسا ایک بھی قابل قدر مفکر موجود نہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ ہم میں صلاحیت موجود نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان سمیت تمام اسلامی ممالک میں کوئی بھی ایسی تعلیمی درسگاہ موجود نہیں جہاں سائنسی و دیگر علوم کے شعبوں پر کوئی تحقیق کا کام ہو رہا ہو، جس کو بین الاقوامی سطح پر کوئی پذیرائی حاصل ہو آج ہماری پسماندگی کی بڑی وجہ بھی یہی ہے کہ ہم نے علم سے جو ہماری میراث تھی پہلوتہی کی ہے۔

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

حالانکہ دنیا میں اسلام واحد مذہب ہے جس نے علم کے حصول پر سب سے زیادہ زور دیا اور جس کے بارے میں رسول اکرم ﷺ کی بے شمار احادیث ملتی ہیں۔ سائنس و ٹیکنالوجی کے فروغ کے بارے میں ہم باتیں تو بہت زیادہ کرتے ہیں لیکن اس شعبے میں عملی کام نہ ہونے کے برابر ہے۔

میں نے پچھلے سال بھی پورے عالم اسلام کے رہنماؤں کی توجہ اس حقیقت کی جانب مبذول کرائی تھی کہ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ سائنس و ٹیکنالوجی کے فروغ پر زیادہ سے زیادہ توجہ دی جائے اور اگر ان کے ممالک میں سائنس و ٹیکنالوجی کو فروغ دینے کے لئے انفراسٹرکچر موجود نہیں تو وہ امیر ترین اسلامی ممالک کو فنڈز مہیا کریں جہاں اس شعبے پر کام ہو رہا ہے تا کہ عالم اسلام اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکے۔ مثال کے طور پر میں کچھ عرصہ قبل اسلامی ترقیاتی بینک میں تقریر کرنے کے سلسلے میں گیا تو میں بینک کے صدر ڈاکٹر احمد محمد علی سے عرض کیا کہ آپ کسی کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر نیچے دیکھیں، آپ کو کئی ہزار گاڑیاں کھڑی دکھائی دے رہی ہیں لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان میں سے ایک بھی گاڑی کسی مسلم ملک کی بنی ہوئی نہیں ہے اب اگر گاڑیوں کی ایک فیکٹری ہی بنالی جائے تو اس میں کم از کم دس ہزار آدمیوں کو نوکری ملتی ہے اور ایک کار کے اندر جتنی اقسام کی ٹیکنالوجی استعمال ہوتی ہے اس سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ آپ یہ دیکھیں کہ مراکش سے انڈونیشیا تک ہزاروں اقسام کے ٹرک چلائے جاتے ہیں۔ ٹرک نقل و حمل کے لئے اتنی اہم چیز ہے کہ اگر ہم ایک ہی قسم کا ٹرک بنائیں اور مراکش سے انڈونیشیا تک وہی استعمال کریں تو اس کے بے شمار فوائد ہونگے۔ اگر اسلامی ممالک اس طرح کی بڑی بڑی صنعتیں لگائیں تو اس سے نہ صرف سائنس و ٹیکنالوجی کے شعبے سے متعلق پیشہ ور لوگوں کو روزگار حاصل ہو سکے گا بلکہ وہ اپنی قابلیت کا بھی مکمل مظاہرہ کر سکیں گے۔ ہم آج بھی جوس نکالنے کی مشین سے لے کر بجلی کی استری تک درآمد کرتے ہیں۔

میری ہمیشہ سے یہی خواہش رہی ہے اور میں ہمیشہ سے یہی مشورہ دیتا رہا ہوں کہ اسلامی ممالک میں اعلیٰ درجے کے ادارے بنائے جائیں جہاں اعلیٰ سائنسی تعلیم دی جا سکے۔ ماہرین تعلیم اور پروفیسر صاحبان ان اداروں سے مستفید ہو کر اپنی توانائیاں تحقیقی کاموں میں صرف کر سکتے ہیں۔ پاکستان میں جینیٹک انجینئرنگ اور بایوٹیکنالوجی کا ایک اعلیٰ درجے کا ادارہ بن سکتا ہے۔ اس کے ماہرین ہمارے پاس موجود ہیں۔ اس طرح ہم کمپیوٹر سائنس اور میٹالرجی کے سلسلے میں بہت سا کام کر سکتے ہیں۔ دوسرے ممالک میں بھی ایسے ہی انسٹی ٹیوٹ قائم کیے جا سکتے ہیں یہ ضروری نہیں کہ ہر ملک ہر ڈسپلن میں مہارت حاصل کرے۔ یوں ہو سکتا ہے کہ ایک ملک ایک طرح کا تعلیمی ادارہ بنا لے اور دوسرا دوسری طرح کا۔ اور اس طرح ایک دوسرے کے تعاون سے عالم اسلام اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کر سکتا ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ رب العزت نے مسلم ممالک کو معدنیات سے مالا مال کیا ہے جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت پوری دنیا کو 50 فیصد خام تیل 40 فیصد قدرتی گیس 90 فیصد قدرتی ربڑ اور 75 فیصد جوٹ مسلم ممالک فراہم کرتے ہیں لیکن مسلم ممالک سائنس و ٹیکنالوجی میں ترقی یافتہ ہونے کی وجہ سے اس خام مال کو

قابل استعمال نہیں بنا پاتے نتیجتاً ترقی یافتہ مغربی ممالک جدید ٹیکنالوجی سے استفادہ کرتے ہوئے اسی خام مال سے بے پناہ اشیاء بناتے ہیں اور مجموعی عالمی تجارت کا 95 فیصد حصہ اپنی جیب میں ڈالتے ہیں جبکہ مسلم ممالک عالمی تجارت کا صرف 5 فیصد حصہ حاصل کر پاتے ہیں۔ اسی طرح مسلم ممالک کی مجموعی قومی پیداوار 1100 بلین امریکی ڈالر بنتی ہے جو صرف ایک یورپی ملک فرانس کی مجموعی قومی پیداوار سے بھی کم ہے جس کی مجموعی قومی پیداوار 1500 بلین امریکی ڈالر کے برابر ہے۔ یہ اعداد و شمار اس حقیقت کی چغلی کھاتے ہیں کہ مسلم ممالک میں سائنس و ٹیکنالوجی کے فروغ پر بالکل توجہ نہیں دی جا رہی۔ علامہ اقبال نے کیا خوب کہا تھا۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

ایٹمی ترقی کا خواب اور پاکستان

سائنسی و سماجی موضوعات پر لکھے گئے ڈاکٹر خان کے مضامین

ہم خدا کا شکرادا کرتے ہیں کہ اگر چہ آج ہم دفاعی میدان میں نا قابل تسخیر بن چکے ہیں لیکن ابھی ہماری منزل بہت دور ہے۔ یہ دور اقتصادی ترقی کا دور ہے اور اقتصادی ترقی سائنس وٹیکنالوجی کی ترقی کے بغیر ناممکن ہے۔ میں نے 1998ء میں اپنی تقریر میں حکومت کی توجہ اس جانب مبذول کرائی تھی اور آج ایک مرتبہ پھر یہ گوش گزار کرنا چاہتا ہوں کہ ابھی ہم نے پانچ مزید دھماکے کرنے ہیں یہ سن کر شاید آپ پریشان ہوں گے۔ مگر میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ابھی ہم نے

1- صنعت وحرف

2- زراعت

3- تعلیم

4- صحت عامہ

5- آبادی

ایسے مسائل پر قابو پانے کیلئے بھی دھماکے کرنا ہیں، جس کے لئے ہمیں سب سے پہلے ملک میں سائنس وٹیکنالوجی کو عام کرنا ہوگا۔ضرورت اس امر کی ہے کہ ملک میں سائنسی اداروں کو قائم کیا جائے۔جگہ جگہ پولی ٹیکنیک انسٹی ٹیوٹ اوراعلیٰ سائنسی مراکز قائم کئے جائیں کیونکہ ہمیں پڑھے لکھے کلرکوں کے بجائے تربیت یافتہ فنی ورکروں اور ماہرین کی ضرورت ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر عطاء الرحمٰن جو ہمارے وزیر برائے سائنس وٹیکنالوجی ہیں۔ان کا نام دنیائے سائنس میں بھی بطور لائق وفطین سائنس دان کے عزت واحترام سے لیا جاتا ہے۔روزنامہ ''ڈان'' میں مورخہ 15-16 اور 17 مئی 1998ء کوان کا ایک مضمون سلسلہ وار شائع ہوا جس میں پروفیسر عطاء الرحمٰن نے بڑی خوبصورتی سے پاکستان کے سائنسی منظر نامے پر روشنی ڈالی اوراس ضمن میں انسانی وسائل کی شدید کمی کی طرف نشاندہی کی میرے خیال میں حکومت کے پاس اس سے زیادہ تفصیلی رپورٹ موجودہ حالات پر نہیں ہوسکتی اوراگر موجودہ حکومت اپنے ایک اہم رکن وزیر سائنس کے ان خیالات کی رہبری میں موثر کارروائی کرے تو کوئی شبہ نہیں کہ حالات میں بہتری پیدا نہ ہو۔

درحقیقت پروفیسر عطاء الرحمٰن کے اس مضمون نے نہ صرف حالات کی سنگینی کی نشاندہی ہی کی ہے بلکہ اس سوچ کی نئی راہیں بھی متعین کی ہیں۔سائنس سے ہماری لاتعلقی، سائنسی اداروں کی بے توقیری اور علم وفن سے ہماری ناآشنائی کچھ ایسی نہج پر پہنچ گئی ہے کہ اس کا اثر ہر شعبہ زندگی میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔

خدامعلوم تعلیم سے ہمیں کیا بیر ہے کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ترقی کا ہر راستہ اسی زینے سے جاتا ہے ہمارا تعلیمی نظام اورشرح خواندگی مسلسل انحطاط کا شکار ہے۔آج وطن عزیز میں کم ازکم دوتہائی آبادی علم سے بے بہرہ ہے جبکہ جو افراد خواندہ شمار بھی ہوتے ہیں ان کی بھی واضح اکثریت ان افراد پر مشتمل ہے جو فقط اپنا نام لکھ اور پڑھ سکتے ہیں، لیکن اس کے باوجود ہم تعلیم پر اپنی کل آمدنی کا 2.4 فیصد سے زائد خرچ کرنے کو تیار نہیں ہے۔آج ملک کی آدھی سے زائد آبادی صحت کی بنیادی سہولتوں حتیٰ کہ پینے کے صاف پانی سے بھی محروم ہے لیکن صحت کا حصہ ہماری قومی آمدنی میں ایک فیصد سے بھی کم ہے۔

آج پاکستان کی کم وبیش 76 ملین کی کل بالغ آبادی کا دوتہائی یعنی کم وبیش 49 ملین تعلیم سے نابلد ہے۔ملک میں پیدا ہونے والے 37 فیصدلڑکے اور 55 فیصد لڑکیاں کبھی سکول نہیں گئے اور جو 63 فیصد لڑکے اور 45 فیصد لڑکیاں سکول چلے بھی گئے ان کی بھی نصف سے زائد تعداد سکول سے بھاگ گئی۔

وطن عزیز میں انسانی وسائل کی ترقی کا یہ عالم ہے کہ پاکستان اورسری لنکا کی فی کس آمدنی ایک ہے لیکن انسانی وسائل کی ترقی میں سری لنکا اور پاکستان میں 45 درجوں کا فرق ہے۔جس کی واحد وجہ پاکستان کی خواندگی کی شرح ہے۔

12 فیصد آبادی غربت کی لکیر سے نیچے اور کم ازکم 30 فیصد عین اس لکیر پر زندہ ہے۔

25 فیصد پاکستانی فقط ایک کمرے گھر میں رہتے ہیں۔
53- فیصد نکاسی آب یعنی Sanitation سے محروم ہیں۔
کم از کم 38 فیصد 5 سال سے کم عمر بچے خوراک کی کمی کا شکار ہیں۔ لیکن ان سب حقائق کے باوجود سماجی ترقی کے میدان میں ہم سائنس سے استفادہ کرنے کو تیار نہیں۔
شعبہ بہبود آبادی اور بڑھتی ہوئی آبادی کو قابو میں لانے پر بڑا زور دیا گیا مگر درحقیقت یہ تمام شور زبانی جمع خرچ ہے کہ ہم آج 2.9 فیصد کی شرح سے آبادی میں اضافہ کا شکار ہیں۔ اس حساب سے نہ تو وسائل میں ترقی ہوئی اور نہ ہی دستیاب وسائل کو اس انداز سے بروئے کار لانے کی سعی کی گئی جو بڑھتی ہوئی آبادی کے بوجھ کو نہ صرف سنبھال سکیں بلکہ اس میں مزید اضافے کو روکنے کی طرف کوئی عملی قدم بھی اٹھا سکیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ایسا صرف اور صرف تعلیم سے ممکن ہے۔
اس موقع پر میں عظیم ماہر اقتصادیات مرحوم ڈاکٹر محبوب الحق کے تحقیقی ادارے کی ایک رپورٹ کا حوالہ دینا چاہوں گا جس نے بڑی خوبصورتی سے تعلیم اور آبادی میں کمی کو ہم آہنگ کیا۔ اس رپورٹ کے مطابق اگر 1000 عورتوں کی تعلیم پر 40 ہزار ڈالر خرچ کئے جائیں تو 660 زچگیوں سے گریز کیا جا سکتا ہے اور یوں وہ 2 لاکھ پچاس ہزار ڈالر بچائے جا سکتے ہیں جو ان زچگیوں پر اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بچوں پر صرف ہوتے ہیں۔ جس کا مطلب ہے کہ ہر اس ایک ڈالر کے بدلے جو آپ نے ایک عورت کی تعلیم پر صرف کیا آپ نے 6 ڈالر بچا لئے۔ علم سے دوستی کیجئے مسائل کا ہر حل ممکن ہے۔ چاہے سماجی ترقی ہو یا معاشرتی، زراعت ہو یا انڈسٹری، غرضیکہ کوئی بھی شعبہ ہو تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوئے بغیر ترقی کرنا ناممکن ہے۔
جہاں تک سائنسی ترقی کا تعلق ہے آج ہمارے پاس کے۔ آر۔ ایل جیسا جدید اور مکمل ادارہ موجود ہے جہاں اس وقت جدید ترین مشینری کے ساتھ ساتھ وہ تمام سہولیات اور آسائشات موجود ہیں جو ترقی یافتہ ممالک کو حاصل ہیں۔ علاوہ ازیں کے۔ آر۔ ایل ہر سال سائنس سے متعلق بین الاقوامی معیار کی کئی کانفرنسیں، سیمپوزیم اور ورکشاپس وغیرہ کا بھی اہتمام کرتا ہے۔ جس میں نہ صرف ملک کے کونے کونے سے سائنسدانوں اور انجینئروں کی بڑی تعداد شرکت کرتی ہے بلکہ پوری دنیا سے بھی سائنسدان جوق در جوق حصہ لیتے ہیں اور اس طرح ہمارے ملکی سائنسدانوں اور انجینئروں کو سائنس کے شعبے میں ہونے والی ایجادات اور تحقیقات سے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں۔
ملک کو ایٹمی قوت بنانے کے بعد اب میرا مشن ملک کو تعلیم اور سائنس و ٹیکنالوجی کے زیور سے آراستہ کرنا ہے۔ اپنے اس مشن پر میں نے 13 سال قبل ہی کام کا آغاز کر دیا تھا۔ جس کے نتیجے میں آج جی۔ آئی۔ کے انسٹی ٹیوٹ جیسی بین الاقوامی معیار کی جدید تعلیم درسگاہ موجود ہے۔ مختصر عرصے میں جس طرح جی۔ آئی۔ کے انسٹی ٹیوٹ نے بین الاقوامی سطح پر اپنی شناخت کروائی ہے وہ اس کے معیار کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ انسٹی ٹیوٹ میں پروفیسر صاحبان تعلیمی میدان میں ہی نہیں بلکہ عملی میدان میں بھی تعلیم یافتہ ہوں جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی بیشتر تعداد کوالیفائیڈ، پی ایچ ڈی کی سند یافتہ ہے۔ علاوہ ازیں میری ہمیشہ ہی دلچسپی رہی ہے کہ ملک میں ایسے اعلیٰ تعلیمی ادارے قائم کئے جائیں جہاں صرف اور صرف میرٹ کی بنیاد پر داخلہ مل سکے اور جہاں ٹیوشن فیس اتنی معقول ہو کہ متوسط گھرانے کے چشم و چراغ بھی ان سے استفادہ کر سکیں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے بڑی خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ میں اس میں کسی حد تک کامیاب رہا ہوں۔ اس وقت ملک کے لئے پولی ٹیکنیک انسٹی ٹیوٹ کا قیام بھی نہایت ضروری ہے تاکہ ہم اپنے سائنسی مراکز کو تربیت یافتہ ورکر اور اسٹاف مہیا کر سکیں۔ ان اداروں میں سے چند ایک جن کی میں نے حتی المقدور مدد کی ہے ان کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔
1- غلام اسحاق خان، انسٹی ٹیوٹ آف انجینئرنگ سائنسز اینڈ ٹیکنالوجی (ٹوپی)
2- پاکستان اکیڈمی آف سائنسز، اسلام آباد
3- ڈاکٹر اے کیو خان انسٹی ٹیوٹ آف ہائی ٹیکنالوجی
4- کہوٹہ انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی، کہوٹہ
5- ڈاکٹر اے کیو خان انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی، میانوالی
6- قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد
7- گومل یونیورسٹی، ڈیرہ اسماعیل خان
8- سرسید یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی، کراچی
ان اداروں کے علاوہ میں اپنی مصروفیات میں سے کچھ وقت چند ایسے سائنسی اور فنی اداروں کو بھی دیتا ہوں جن میں چیئرمین، صدر، بورڈ آف گورنرز کا رکن وغیرہ بھی منتخب ہوا ہوں۔ جس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

1- صدر، ہومیو پیتھک فاروقی ایڈووائسمنٹ آف کمیونٹی ہیلتھ، ایجوکیشن اینڈ ٹریننگ (Sachet) پاکستان، اسلام آباد
2- رکن، بورڈ آف گورنرز، ہمدرد یونیورسٹی، اسلام آباد
3- رکن، بورڈ آف گورنرز، سرسید یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی، کراچی
4- رکن، سنڈیکیٹ، قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد
5- بورڈ آف گورنرز، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد

میں سمجھتا ہوں کہ اگر آپ یقین کی دولت سے سرفراز ہوں اور آپ کی نیت نیک، منزل ایک اور ارادہ پختہ ہو تو ہر کام آسان ہو جاتا ہے۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

قسط 3

ایٹمی دھماکوں کا سفر

28 مئی 1998ء کے روز سہ پہر 3 بجکر 16 منٹ پر بلوچستان کے ایک اندرونی علاقے میں ایک خوش نصیب پاکستانی نے ایک بٹن دبا کر نیوکلیئر تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا۔ لیفٹیننٹ جنرل ذوالفقار علی خان، چیئرمین پاکستان اٹامک انرجی کمیشن اور اس کے دوسرے ساتھی اور سائنس دان اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ اس اقدام کی کیا اہمیت تھی۔ اور دوسرے افراد جو اس وقت وہاں موجود تھے وہ بھی اس حقیقت سے آگاہ تھے چند سیکنڈوں میں ہمارے پیروں کے نیچے زمین نے تھرتھرانا شروع کر دیا اور اس کوہ کی پہاڑیوں نے اپنا رنگ بدل لیا۔ یہ لمحہ ایک قوم کی خودداری کا عکاس تھا۔ جس نے بین الاقوامی طاقتوں کو خوش کرنے کیلئے گھٹنے ٹیکنے سے انکار کر دیا۔ یہ ایک واضح ثبوت تھا اور 130 ملین پاکستانیوں کے ولولے کا نشان تھا۔ جس نے وطن عزیز کے ایک ایک انچ کا دفاع کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ یہ بھارت کے ایٹمی دھماکوں کیلئے ایک مؤثر جواب تھا، کہ ہم کیا کر سکتے ہیں۔ المختصر، اس کا مطلب تھا نیوکلیائی پاکستان، کرۂ ارض پر ساتواں ایٹمی طاقت۔ عصر حاضر کی تاریخ میں 28 مئی 1998ء کا دن ایک ایسے واقعے کے طور پر یاد رکھا جائے گا جب دنیا ایک بہت بڑے تبدیلی کے عمل سے گزری۔

میرے نزدیک 28 مئی کا دن اس سے بھی کہیں زیادہ اہم ہے۔ میرے لئے یہ کامیابی کے سرور کا دن تھا۔ جب 25 سال قبل وزیراعظم ہاؤس میں مجھے ملنے والا ایک اہم کام تکمیل کو پہنچ گیا۔ اس پروگرام کا مقصد پاکستان آرمی کیلئے ایٹمی پروگرام اور قوم کو تحفظ فراہم کرنا تھا۔ 31 جولائی 1976ء کو انجینئرنگ ریسرچ لیبارٹریز کے نام سے ایک خودمختار ادارے کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس کا مقصد یورینیم کی افزودگی کا ایک پلانٹ قائم کرنا تھا، تاکہ پاکستان کو نیوکلیائی صلاحیت فراہم کی جا سکے۔ اس وقت ہمارے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ تو قابل بھروسا انفراسٹرکچر ورنہ ہی تربیت یافتہ لوگ۔ ہمیں صفر سے کام شروع کرنا تھا۔ لیکن ہم بلند حوصلے اور ولولے جیسی دولت سے مالا مال تھے اور ہم نے تہیہ کر لیا تھا کہ ہم پاکستانی قوم کو ایک محفوظ مستقبل ضرور دے کر رہیں گے۔ آج جب میں گردن گھما کر ماضی میں دیکھتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں کہ ہم نے یہ مقصد صرف 8 سال میں حاصل کر لیا تھا۔ اور یہ بات کسی معجزے سے کم نہ تھی۔ کہوٹہ کی عظیم کامیابیوں کے بارے میں میں پہلے بھی کئی جگہ ذکر کر چکا ہوں۔ اس لئے اس وقت میں اپنے آپ کو 28 مئی 1998ء کے ایٹمی دھماکوں تک محدود رکھوں گا۔

ابتدائی کامیابیاں 1976-1986:

جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ یورینیم کی افزودگی کی صلاحیت کہوٹہ کی ٹیم نے صرف پانچ سال کے عرصے میں حاصل کر لی تھی۔ پہلی بڑی کامیابی 1978ء میں ہوئی۔ جب ہم نے انتہائی کامیابی کے ساتھ دو سال کے عرصے میں ریکارڈ حد تک یورینیم افزودہ کرنے کی صلاحیت بھی حاصل کر لی تھی ...... جب 1981ء میں اس کامیابی کے متعلق سب سے پہلے صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق کو بتایا گیا تو وہ یکم مئی 1981ء کو پہلی مرتبہ لیبارٹریز میں تشریف لائے اور "انجینئرنگ ریسرچ لیبارٹریز" کو ڈاکٹر اے کیو خان ریسرچ لیبارٹریز کا نام دیا یہ ایک بہت بڑا امتیاز تھا، جس کی مثال دنیا میں کہیں نہیں ملتی آج تک دنیا کی تاریخ میں ایسا نہیں ہوا کہ کسی زندہ سائنس دان کے نام سے کوئی ادارہ موجود ہو۔ گو کہ یہ قومی دفاع میں خود انحصاری کی طرف ایک قدم تھا، لیکن سربراہ مملکت کا یوں اعتراف کرنا میرے لئے اور میرے ساتھیوں کیلئے ایک بہت بڑی بات تھی۔ اس سے ہمارا مورال بہت بلند ہوا۔

جنوبی ایشیا میں طاقت کا توازن:

اس وقت تک ہماری کامیابی کے بارے میں دنیا کو کافی سدھ بدھ ہو چکی تھی اور وہ جانتے تھے کہ ہم نے یہ صلاحیت بھی حاصل کر لی ہے اور ساتھ ہی سرحد کے اس پار یہ اشارہ بھی دیا جا چکا تھا کہ پاکستان کا جارحانہ نیوکلیائی حیثیت اپنانے کا کوئی ارادہ نہیں اور اس کا پروگرام دفاعی اور امن کی نوعیت کا ہے۔ لیکن پاکستان کی سالمیت کو خطرے کی صورت میں برابر کا جواب دیا جائے گا۔ ہمارا نقطۂ نظر سمجھا جا چکا تھا اور ساتھ ہی برصغیر میں "ڈیٹرنس کی تھیوری" نے اپنا کام شروع کر دیا تھا یہی وجہ ہے کہ 1971ء سے لے کر آج تک کوئی بڑا حادثہ پیش نہیں آیا۔ 1987ء کے اوائل میں بھارت نے "براس ٹیک مشقوں" کے بھیس میں پاکستان کی سرحدوں پر افواج جمع کرنا شروع کر دیں۔ ان کے متعلق بہت سی پریشان کن خبریں موصول ہو رہی تھیں کہ بھارت اس دوران کوئی سمارٹ ایکشن کر سکتا ہے۔ اس تناؤ کی صورت حال میں مشاہد حسین، جو کہ اس وقت "دی مسلم" کے ایڈیٹر تھے۔ میرے ساتھ میرے ڈرائنگ

روم میں چائے پر موجود تھے۔ وہ مجھے اپنی شادی کی دعوت دینے آئے تھے اور ان کے ساتھ ہی ایک بھارتی صحافی "کلدیپ نیئر" بھی تھا۔ بات چیت دونوں ملکوں کے نیوکلیئر پروگراموں پر مرکوز ہوگئی۔ وہ غیر رسمی بات چیت "کلدیپ نیئر" نے غیر اخلاقی طور پر میرے انٹرویو کے طور پر برطانیہ کے اخبار "دی آبزرور" میں چھاپ دی اور میرے حوالے سے یہ بات کہی کہ پاکستان نے ایٹمی صلاحیت حاصل کرلی ہے۔ اس کے انکشاف کے بعد بین الاقوامی ردعمل ایک فطری امر تھا اور عیار بنیا اپنا کام دکھا گیا۔

حکومت پاکستان اور خود میں نے اس رپورٹ کی تردید کی مگر "نقصان پہنچ چکا تھا" اس نام نہاد انٹرویو کی بنیاد پر بھارت نے پاکستان پر تنقید کا دائرہ بے پناہ حد تک وسیع کردیا تھا۔ جب میں اس واقعے پر ایک نظر ڈالتا ہوں تو یہی محسوس کرتا ہوں کہ وہ واقعہ دراصل ایک پوشیدہ حکمت لئے ہوئے تھا۔ اس کی وجہ سے بھارت کے عزائم خاک میں مل گئے۔ براس ٹیک مشقیں فوراً ملتوی کردی گئیں اور افواج کو سرحد سے ہٹالیا گیا۔ نئی دہلی نے واضح طور پر پیغام پڑھ لیا تھا۔ اسی سال اپریل کے مہینے میں جنرل محمد ضیاء الحق نے جن کو ایک بار پھر بوتل سے نکال دیا، جب انہوں نے جریدے "ٹائم" کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے یہ اقرار کیا کہ پاکستان کے پاس ایٹمی صلاحیت موجود ہے۔ چاغی کے تجربات تک حکومت پاکستان کی سرکاری لحاظ سے یہی پوزیشن تھی۔

1998ء۔۔۔۔ جب تاریخ تخلیق ہوئی:

خطے میں "نیوکلیئر ڈیٹرنٹ" کے ذریعے طاقت کا ایک ایسا توازن پیدا ہوگیا جس کی وجہ سے بھارت دو دہائیوں تک پاکستان پر کسی قسم کی جارحیت کرنے کی ہمت نہ کرسکا۔ نیوکلیئر فری زون ساؤتھ ایشیا" کیلئے بھی سنجیدہ قدم اٹھائے گئے۔ 1998ء میں پاکستان کے وزیر اعظم نواز شریف نے بھارتی وزیر اعظم نرسمہا راؤ کو اعتماد میں لے کر پانچ ممالک پر مبنی ایک سربراہی کانفرنس کے انعقاد کی تجویز پیش کی تا کہ ایٹمی مسئلہ پر بات چیت ہو سکے اور ایک دوسرے کی ایٹمی تنصیبات پر حملہ نہ کیا جائے۔ حالات یہاں سے بہتر ہوسکتے تھے اور معلوم امن کے قیام کیلئے کس قدر کامیابی حاصل ہوجاتی، لیکن بھارتیہ جنتا پارٹی "اسٹیٹس کو" کے حق میں نہ تھی۔ بابری مسجد کی شہادت کے تقریباً ساڑھے پانچ سال کے بعد ہندو انتہا پسند بی جے پی نے وہ کیا جس کی توقع تھی۔ بھارت نے 11 مئی 1998ء کو ایٹمی دھماکہ کردیا۔

مارچ 1998ء۔ بی جے پی اقتدار سنبھالتی ہے:

اس سال میں پیش آنے والے واقعات 11 مئی 1998ء کے بھارتی دھماکوں سے بہت پہلے بھارت کے سیاسی انتشار کی نشاندہی کر رہے تھے جہاں مستحکم حکومت کی عدم موجودگی کسی بڑے واقعے کا سبب بن سکتی تھی۔ بالآخر مارچ 1998ء میں بی جے پی کی حکومت مختلف جماعتوں کے ساتھ اتحاد بنا کر اقتدار تک جا پہنچی۔ اس کی قیمت کے طور پر پاکستان کے خلاف جنگ کا فوبیا پیدا کیا گیا "اکھنڈ بھارت" اور "رام راج" قائم کرنے اور بحیثیت قوم طاقت حاصل کرنے کیلئے ووٹروں سے ہر قسم کے وعدے کئے گئے۔ 18 مارچ کو بی جے پی نے 12 جماعتوں کے ساتھ مل کر ایک "قومی ایجنڈا برائے حکومت" پیش کیا اور اس میں بھی ایٹمی صلاحیت کے متعلق اپنے ارادے کو واضح کیا۔ بھارت کے وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی نے واضح طور پر یہ کہا کہ "جب بھی وقت آئے گا یا ضرورت محسوس ہوگی، بھارت اپنی ایٹمی صلاحیت کا اظہار کرے گا"۔ سرحد کے اس پار موجود عدم استحکام، بھارت کے انتہائی خطرناک ہتھیاروں کا ذخیرہ، پاکستان کی سرحد پر تھوی میزائلوں کی تنصیب اور بھارتی رہنماؤں کے بیانات پاکستان کیلئے دفاعی لحاظ سے پریشان کن تھے۔

اپریل 1998ء۔۔۔۔ پاکستان کا غوری میزائل کا تجربہ:

جب سے بھارت نے اپنے میزائل کے پروگرام کو وسیع کیا تھا پاکستان میں دفاع کے ماہرین خطرے کے مقابلے کیلئے مصروف ہوگئے۔ بھارت نے کم فاصلے تک مار کرنے والے پرتھوی، دور تک مار کرنے والے اگنی اور بیلسٹک میزائل کا پروگرام زور شور سے شروع کر رکھا تھا۔ کہوٹہ ریسرچ لیبارٹریز میں ہم نے میزائل ٹیکنالوجی میں کچھ پیش رفت کی اور زمین سے فضا میں کم فاصلے تک مار کرنے والے کندھے پر رکھ کر چلانے والے میزائل عنزہ اور زمین سے زمین پر اینٹی ٹینک بکتر شکن میزائل بنانے میں کامیاب ہوگئے۔ ان کامیابیوں پر حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ مجھے ایک درمیانی فاصلے تک مار کرنے والے بیلسٹک میزائل بنانے کیلئے کہا گیا تھا۔ نتیجتاً 1993ء میں غوری کے پراجیکٹ پر کام شروع کیا اور صرف 5 سال کے عرصے میں پاکستان نے پہلا میزائل بنالیا اور 6 اپریل 1998ء کو پاکستان نے کامیابی کے ساتھ اس درمیانی فاصلے تک مار کرنے والے میزائل کا کامیاب تجربہ کیا۔ یہ میزائل "غوری" آرمی کے ٹلہ جوگیاں کے فائر رینج سے چھوڑا گیا۔ 16 ٹن وزنی یہ میزائل جو 1000 کلوگرام تک وزن لے کر 1500 کلومیٹر تک جا سکتا تھا اور ایٹمی ہتھیار لے جانے کی صلاحیت رکھتا تھا 1100 کلومیٹر دور بلوچستان کے علاقے نوکنڈی میں کامیابی کے ساتھ اپنے ٹارگٹ تک پہنچ گیا۔

غوری کے تجربے پر بھارتی رد عمل:

بھارتی ردعمل کوئی نئی بات نہ تھی۔ بھارتی وزیر دفاع جارج فرنانڈس نے پرزور انداز سے کہا کہ وہ مزید ہتھیار حاصل کریں گے اور ساتھ ہی یہ کہا کہ پرتھوی اور اگنی کی صورت میں ان کے پاس غوری کا جواب موجود ہے۔ اگر یہی صورت حال تھی تو انہیں اتنا زیادہ شور مچانے کی کیا ضرورت تھی۔ جنگی جنون بھارتی پالیسی سازوں کی عام زبان تھی۔ مشہور اسٹر یٹجسٹ پریم شنکر جھا نے "ہندوستان ٹائمز" میں شائع ہونے والے اپنے ایک مضمون بعنوان "بھارت نیوکلیئر ٹیسٹ" میں لکھا:

"غوری کے تجربے کے جواب میں ہمارا ردعمل واضح ہونا چاہئے۔ بجائے اس کے ہم یہ کہیں کہ کچھ نہیں ہوا بھارت کو چاہئے کہ وہ اپنے نیوکلیائی ڈیٹرنس کو بحال کرے۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ اگنی پر کام جاری رکھا جائے اس نیت کے ساتھ کہ اس کی تعیناتی کرنی ہے۔ دوسرے یہ کہ سیکنڈ سٹرائیک صلاحیت حاصل کی جائے اور تیسرے یہ کہ یہ انتہائی ضروری ہے کہ ایٹمی تجربات شروع کئے جائیں"۔

وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ اگنی کا نشانہ پاکستان نہیں ہے ان کی آنکھیں کھولنے کیلئے درج بالا الفاظ کافی ہیں۔ اگنی کا مقصد واضح طور پر سامنے آگیا۔

11 مئی 1998ء۔ بھارت کا عالمی امن کو دھچکا:

11 مئی 1998ء کو ایک ایسے ملک جس کی 30 فیصد آبادی غربت کی لائن سے نیچے رہتی ہے کے وزیراعظم نے اپنی سرکاری رہائش گاہ 7 ریس کورس روڈ دہلی سے بھارتی پرچم کے سایہ تلے سے یہ اعلان کیا کہ ان کا ملک ایک ایٹمی طاقت بن گیا ہے۔ ایک بلین بدحال قوم کیلئے واجپائی نے سمجھا کہ ایٹمی امن جنگ سے مرنے سے قبل ضروری ہے۔ واجپائی کا واضح اعلان ایک بم کی مانند تھا جو سو چنے کو بہت کچھ دے گیا۔ اپنے پیش روؤں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے بجائے اس کے کہ پارلیمنٹ میں اپنا نقطہ نظر بیان کرتے انہوں نے واشنگٹن کے لیڈروں کی مانند میڈیا کے نمائندوں سے خطاب کرتے ہوئے اپنے پالیسی بیانات دینے شروع کئے اور یہ ظاہر کرنا شروع کیا کہ بھارت ایک بڑی قوت بن گیا ہے۔

کو کہ انہوں نے ان تجربات کو "پرامن مقاصد" سے متعلق بیان کیا ان کی باتوں کا کھوکھلا پن واضح تھا۔ یہاں تک کہ ان کے اپنے معاشرے میں دانشندلوگوں نے ان کا یہ دعویٰ مسترد کردیا۔ اپنے وزیراعظم کے "پرامن مقاصد" کے تجربات پر اظہار خیال کرتے ہوئے کالم نگاری مانی شنکر آئر نے "انڈیا ٹوڈے" میں اپنے کالم اشاعت مورخہ یکم جون میں لکھا۔

"اٹل بہاری واجپائی اپنی نوعیت کے پہلے سیاستدان ہیں جنہوں ایک ہائیڈروجن بم میں امن دریافت کیا ہے" نیو کلیئر انڈیا میں منطق کہیں دکھائی نہیں دیتی اور منافقت کی انتہا پریشان کن حد تک ہے۔ یہ وا ہگہ کے آگے دکھائی دیتی ہے۔ برصغیر پر حکمرانی کی خواہش پوری طرح سامنے آگئی۔ "آہنسا" کے پجاری اور گاندھی کے شاگرد پاکستان پر "بڑا بم" گرانے کے درپے تھے۔ اور "بگ بوائز کلب" میں جانے کے خواہشمند تھے۔ بھارت نے اپنی "نیوکلیئر فری ورلڈ" کی تکرار کو پس پشت ڈال کر رائیل پولیٹک کی حقیقی تصویر پیش کی۔

پاکستان کیلئے خطرناک، صاف اور واضح پیغام:

بھارت دھماکوں کے فوراً بعد فتح کے احساس کی تمازت سے سرخ رو، سینہ پھیلائے بی جے پی کے گدھوں نے پاکستان کے خلاف نعرے بازی اور بیانات شروع کردیئے تھے۔ جبکہ ان کے لیڈروں نے یکے بعد دیگرے اشتعال انگیز بیانات دینے شروع کردیئے تھے جو بغل میں چھری منہ میں رام رام کا جاپ کررہے تھے۔ دھماکوں کے دوسرے راؤنڈ سے اگلے دن 14 مئی کو سرکاری رہائش گاہ کے باہر مشتعل مجمع سے واجپائی نے خطاب کے دوران اپنے عظیم بم سے خبردار کیا تھا۔

واجپائی کے مقلدین اس سے بھی ایک قدم آگے چلے گئے۔ جس دن بھارتی وزیراعظم واجپائی نے بھارتی ایٹمی دھماکوں کے مقام پر پوکھران کا دورہ کیا۔ ان کے وزیر داخلہ ایل کے ایڈوانی نے پاکستان کو خبردار کیا اور کہا کہ "پاکستان کشمیر میں جنگ بند کردے یا پھر بھارت کا مقابلہ کرنے کیلئے تیار ہوجائے" ایک اور موقع پر ایڈوانی نے آزاد کشمیر پر قبضے اور پاک بھارت تعلقات میں ایک نئی صورتحال کی دھمکی دیتے ہوئے کہا "پاکستان کیلئے بہتر ہے کہ وہ اپنی بھارت دشمن پالیسیوں کا صفایا کردے خصوصاً جن کا تعلق کشمیر سے ہے۔ اور اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو بھارتی حکومت ٹھوس اقدام کرے گی"۔

پارلیمانی امور کے وزیر مدن لال کھرانا نے جموں میں ایک میٹنگ کے دوران "اب بہت ہو چکا" کے پیرائے میں اعلان کیا کہ بھارت پاکستان کے ساتھ چوتھی جنگ کیلئے تیار ہے۔ بلکہ ان کے الفاظ میں "جہاں اور جب

چاہیے" کے الفاظ بھی شامل تھے۔ان بھارتی لیڈروں کا لہجہ اتنا جارحانہ اور قابل اعتراض تھا کہ امریکی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے ترجمان جیمز روبن یہ کہنے سے باز نہ رہ سکے کہ "بھارت احمقانہ اور خطرناک طور پر اپنے پڑوسیوں سے کھچاؤ میں اضافہ کررہا ہے" دراصل کشمیر کے مسئلہ سے ایٹمی تجربات نتھی کرکے بھارتی لیڈر یہ امر واضح کررہے تھے کہ وہ اپنی ایٹمی قوت کو بلیک میلنگ کیلئے استعمال کرنے پر تلے بیٹھے ہیں۔اس جانب لائن آف کنٹرول کے پار موجود بھارتی دفاع افواج کے بارے میں یہ اطلاع بھی تھی کہ انہوں نے وادی کشمیر اور سیاچن میں محدود کارروائی کی تیاری شروع کردی ہے۔اس سے زیادہ حیرتناک خبر یہ تھی کہ کہوٹہ لیبارٹریز پر رات کے اندھیرے میں شب خون مارنے کا امکان ہے۔پاک فضائیہ کے لڑاکا طیارے آسمانوں کی حفاظت کرتے رہے اور کسی بھی چیلنج کے مقابلے کیلئے غوری میزائلوں کی تنصیب کے احکامات بھی دیئے گئے تھے۔اخبارات میں آدھی رات کو بھارتی ہائی کمشنر کے دفتر امور خارجہ طلب کئے جانے کی خبریں شائع کی گئیں جہاں انہیں لگی لپٹی رکھے بغیر بتادیا گیا کہ "آپ کی حکومت کی طرف سے سے کسی قسم کی مہم جوئی کا جواب برابر سے دیا جائے گا۔" ملک میں شدید بے چینی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پاکستانیوں کے ذہن میں جنگ کا احساس بیدار ہونا شروع ہوگیا تھا۔

بھارتی دھماکوں پر بین الاقوامی رد عمل:

اس امر میں کوئی مبالغہ نہیں کہ اگر بھارتی دھماکوں کی بین الاقوامی طور پر فوری مذمت کی جاتی تو شاید پاکستان ایٹمی دھماکوں کا فیصلہ نہ کرتا اور "تحمل سے کام لینے" کا مشورہ دیا جاتا۔اگرچہ کہ نئی دہلی کے اقدام کی فوری مذمت کے بیانات ضرور آئے۔لیکن ایسے تادیبی اقدامات بالکل ناپید اور انتہائی سست تھے۔جن سے مغربی دنیا کی طرف سے بھارتی دھماکوں کی دیرپا مذمت کا اشارہ ملتا ہے۔یہ بہرحال ایک بحرانی کیفیت تھی اور ایسی غیر موزوں صورتحال میں وزیراعظم پاکستان نے مثالی کردار کا اظہار کیا انہوں نے گیند دنیا کے کورٹ میں پھینک دی، اپنے کارڈ پوشیدہ رکھے۔بھارتی دھماکوں سے دو دن کے اندر ہی ایک اعلیٰ امریکی وفد اسلام آباد آپہنچا۔اس وفد کی قیادت ڈپٹی سیکرٹری آف سٹیٹ سٹروب ٹالبوٹ کے ہاتھ میں تھی اور اس میں امریکی سنٹرل کمانڈ کے کمانڈر جنرل انتھونی بھی شامل تھے۔اس وفد نے 15 مئی 1998ء کو وزیراعظم محمد نواز شریف سے ملاقات کی اور پاکستان کے ایٹمی تجربات کے امکانات کے مدنظر قرضوں کی ادائیگی میں سہولت دینے پر آمادگی ظاہر کی۔وزیراعظم نے یقین دہانی کرائی کہ پاکستان کو ایٹمی تجربات کی کوئی جلدی نہیں لیکن ساتھ ہی واضح کردیا کہ ہم پاکستان کی سالمیت کو درپیش خطروں کے مدنظر اپنے دفاع اور ملکی مفادات کے تحت فیصلہ کریں گے۔

بہت جلد یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ وفد کوئی ایسی ٹھوس تجاویز لے کر نہیں آیا جو پاکستان کی سالمیت کو درپیش مسائل کا حل پیش کرتی ہوں اور اس کا تمام تر مقصد پاکستان پر دباؤ ڈالنے کے علاوہ کچھ نہیں۔مزید افسوسناک ردعمل جی ایٹ ممالک کے قائدین کا تھا۔جنہوں نے برمنگھم میں سربراہی کانفرنس میں بھارت کے خلاف اقدامات سے انکار کیا۔سلامتی کونسل کی طرف سے بھارت کے خلاف کوئی مذمتی قرارداد نہ آئی۔یہاں اس امر کا تذکرہ غیر مناسب نہ ہوگا کہ واشنگٹن نے بھارتی دھماکوں سے صرف پانچ دن پہلے ہی 6 مئی کو ہماری کہوٹہ ریسرچ لیبارٹریز کے خلاف شمالی کوریا سے نام نہاد تعاون کے الزامات کے تحت پابندیاں عائد کردی تھیں جب کہ اس قسم کی کوئی پابندیاں بھارتی تنصیبات کے خلاف نہیں لگائی گئیں اگرچہ کہ وہ ایٹمی تجربات بھی کرچکا تھا۔بھارت اور امریکہ کے مابین بڑھتے ہوئے ایٹمی تعاون کی خبریں بھی اپریل کے بھارتی اخبار ٹائمز آف انڈیا میں شائع ہوچکی تھیں۔مغربی دنیا کی طرف سے پاکستان کے خلاف تعصب واضح ہوچکا تھا۔

اندرونی طور پر عمومی رجحان تلخ ہورہا تھا۔عوامی دباؤ اس حد تک غضبناک ہوچکا تھا کہ سوال "اگر" نہیں تھا بلکہ (وزیر خارجہ گوہر ایوب خان کے مطابق) "کب" تھا۔سڑکوں پر مظاہرے ہورہے تھے اور اخبارات ملکی دفاع اور سلامتی کا غوغا مچارہے تھے۔حزب مخالف کی پارٹیوں نے لاہور میں 24 مئی کو گول میز کانفرنس میں متفقہ طور پر قرارداد منظور کرتے ہوئے بھارتی اقدام کے مساوی ردعمل کا مطالبہ کیا تھا۔جبکہ پارلیمنٹ میں سب سے بڑی حزب مخالف کی پارٹی پاکستان پیپلز پارٹی بھی اس مطالبے میں شامل تھی۔پیپلز پارٹی کے سیکرٹری جنرل نے 15 مئی کو پریس کانفرنس سے خطاب کیا اور بھارتی دھماکوں کے فوری جواب کا مطالبہ کیا۔حکومت سخت مشکل اور اعصاب شکن امتحان سے دوچار تھی۔میں اپنے وزیراعظم کو انتہائی تحسین کے قابل قرار دیتا ہوں جنہوں نے پاکستانی تاریخ کی مشکل ترین صورتحال میں مثالی کردار کا ثبوت دیا۔انہوں نے پورے 17 دن انکار کیا اور آخری فیصلے سے قبل بین الاقوامی قائدین بشمول امریکہ کے صدر کلنٹن کو ایٹمی دھماکہ نہ کرنے اور بھارتی حملے کی صورت میں پاکستان کے تحفظ کی ضمانت دینے کی تجویز تک پیش کی۔ایسی کوئی ضمانت فراہم نہ کی گئی اب پاکستان کو جائز حق حاصل تھا کہ وہ اپنی حفاظت اور سلامتی کیلئے ضروری اقدامات کرے۔یہ کہنا جائز ہوگا کہ وزیراعظم محمد نواز شریف کی قیادت میں پاکستان ایک باوقار اور بالغ النظر ریاست بن کر ابھرا۔

قسط 5

28 مئی ..... دھماکے کا جواب دھماکہ

28 مئی ہماری قومی تاریخ میں ایک اہم ترین دن کے طور پر شامل ہو چکا ہے۔ جو ہماری آزادی کے بعد دوسرا اہم قومی دن ہے۔ کابینہ کی دفاعی کمیٹی کا اجلاس 13 مئی کو ہوا جس دن بھارت اپنے ایٹمی دھماکوں کی دوسری سیریز مکمل کر رہا تھا۔ اس اجلاس میں متغیر صورتحال کا تفصیلی جائزہ لیا گیا۔ میں نے بھی وزیر اعظم محمد نواز شریف کی خصوصی دعوت پر اس میٹنگ میں شرکت کی اور حاضرین کو آگاہ کیا کہ ہم ایٹمی صلاحیت کے حامل ہیں اور اگر حکومت چاہے تو ایٹمی دھماکہ کرنے کے قابل ہیں۔ ایٹمی تجربے کے حتمی وقت کا فیصلہ بعد پر چھوڑ کر سائنس دانوں کو تجربے کیلئے ضروری تیاریوں کا حکم دے دیا گیا اور پھر چاغی کی سنگلاخ پہاڑیوں میں 17 دن کے اعصاب تھکا دینے والے امتحان کا آغاز ہو گیا۔ جس کی انتہا 28 مئی کو ہوئی۔ بلوچستان کا یہ پہاڑی علاقہ نقل و حرکت کا مرکز بن گیا۔ ٹرکوں کی ایک بڑی تعداد وہاں پہنچی اور ہیلی کاپٹروں کی گھن گرج میں سائنس دانوں اور کارکنوں کی ایک فوج و آلات اور ساز و سامان کی بھاری مقدار بھی یہاں پہنچا دی گئی تا کہ وزیر اعظم کے حکم "بھارتی کو موزوں ترین جواب دیا جائے" کی تعمیل میں دھماکے کے جواب میں دھماکہ کیا جا سکے۔

اس کا تمام سہرا ہمارے سائنس دانوں اور انجینئروں کے سر ہے۔ جنھوں نے بھارتی دھماکوں کے بعد صرف دو ہفتوں کے مختصر وقت میں تمام دنیا میں اپنا جوابی پیغام پہنچا دیا۔ ان کی اجتماعی کارکردگی رنگ لائی اور زمین ایک بار پھر پاکستان کے نام سے کانپ اٹھی۔ پاکستان نے ثابت کر دیا کہ اس کی ایٹمی صلاحیت اپنے اظہار سے فقط سکریو کے ایک گھماؤ کے فاصلے پر تھی۔ اب تک یہی سوال کیا جاتا ہے کہ کیا یہ تجربات واقعی ضروری تھے؟ میں ایک قابل صحافی اور سابقہ سفیر ملیحہ لودھی کے مقالے کا ایک حصہ پیش کرنا چاہتا ہوں جو دی نیوز میں 25 جون 1998ء کو شائع ہوا۔ ان کے مطابق:

"جوابی کارروائی کی ضرورت کے پیچھے کئی باہم منسلک عوامل تھے، سٹرٹیجک بھی اور ملٹری بھی، ایٹمی توازن کیلئے اپنی صلاحیت پر اعتبار کا اظہار۔ تکنیکی ایٹمی اسلحہ کے ڈیزائن کے معیار کی بہتری دشمن کی جیو پولیٹیکل اور علاقائی اجارہ داری کی خواہش کا سدباب اور نفسیاتی جارحیت سے بچاؤ کیلئے اعتماد کی بحالی۔ یہ سب کچھ بغیر ایٹمی تجربے کے حاصل کرنا ممکن نہیں تھا۔ جبکہ بھارت برصغیر میں ایٹمی غیر توازن پیدا کر چکا تھا۔"

اس میں تعجب نہیں کہ ایٹمی تجربات کے سٹرٹیجک نتائج ٹیکنیکل ڈیٹا کے مرتب ہونے سے پہلے ہی حاصل ہو چکے تھے۔ بھارتی پارلیمنٹ کے وہی ارکان جو بھارت کے 13 مئی کے دھماکوں پر بغلیں بجا رہے تھے 30 مئی کے لوک سبھا کے اجلاس میں بیٹھے لڑ رہے تھے اور ایک دوسرے کو ایٹمی خطرے کا ذمہ دار قرار دے رہے تھے۔ جنتا پارٹی کے ایک ممبر پارلیمنٹ نٹور سنگھ نے اپنے ہم منصبوں کو بتایا کہ ان کے "عظیم بم" نے دراصل ایک بڑے سائکو پلائزر کا کام کیا ہے اور وزیر اعظم واجپائی کی زبان تب خاصی نرم ہو گئی۔ جب انہوں نے کہا کہ "ہم پاکستان کی برائی میں کچھ نہیں کریں گے اسے بھارت سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم بات چیت کیلئے تیار ہیں"۔ دھماکوں نے نئی دہلی کو پسپا اور دفاع کی طرف مائل کر دیا تھا۔ 9 ماہ بعد جب واجپائی علاقے میں امن و امان اور استحکام کا تصور لے کر لاہور وارد ہوئے تو ایل کے ایڈوانی جیسے لوگوں کو موزوں جواب مل چکا تھا۔

جب حسب توقع پاکستانی دھماکوں کے نتیجے میں مغرب پابندیوں اور مذمتوں میں مصروف تھا۔ اسی دوران اسلامی ممالک میں جشن منایا جا رہا تھا۔ ایٹمی تجربات کے بعد ایک پریس بریفنگ میں اسلام آباد میں ایک عرب اخبار کی نامہ نگار نے بھیگی آنکھوں اور دعا بر لب میرے ہاتھوں کو چومتے ہوئے کہا "آپ نے مسلمانوں کو دنیا میں فخر سے سر اونچا کرنے کے قابل بنا دیا ہے۔ آپ کی کامیابی ہمارا مشترکہ ورثہ ہے۔" پاکستان کو ان تجربات کی بدولت قابل قدر عزت ملی اور دنیائے اسلام میں اس کا قد کئی گنا بڑھ گیا۔ یہ قومی تاریخ کے بہترین لمحات تھے جب اپنے قیام کے پچاس سال بعد پاکستان نے اپنی شناخت پھر سے حاصل کر لی۔ قومی وقار پھر سے حاصل کر لیا گیا اور سٹرٹیجک بیلنس پھر سے حاصل ہو گیا اور ایٹمی خدشات کی بجائے علاقے میں پھر سے استحکام پیدا ہو گیا۔

اسلام آباد میں سعودی عرب کے سفیر جناب اسد اللہ ہیر نے سب سے پہلے مجھے مبارکباد دی اور کہا کہ آج ہمارا سر فخر سے بلند ہے اور مجھے یقین ہے کہ آج سے مسلمانوں کی سائنس، ٹیکنالوجی کی ترقی کا دور شروع ہو گیا۔ اس طرح تمام مسلمان ممالک کے سفیروں نے فرداً فرداً مجھے مبارکباد دی اور پاکستان کے شاندار مستقبل کے لئے دعا کی۔

قسط نمبر 6

اسلامی دنیا میں سائنس و ٹیکنالوجی کا حال اور مستقبل

''کہو! اے میرے اللہ میرے علم میں اضافہ فرما'' (القرآن) رب ذوالجلال کا اپنے محبوب حضرت محمد ﷺ کو یہ حکم اس حقیقت کو آشکار کرتا ہے کہ قرآن کریم کی نظر میں علم اور تعلیم کی اہمیت کس قدر زیادہ ہے۔ آنحضرت ﷺ نے خود فرمایا کہ ''اے میرے اللہ! مجھے چیزوں کے بارے میں حقیقی علم سے سرفراز فرما''۔ آپ ﷺ کی خدائے بزرگ وبرتر کے حضور یہ دعا محض معلومات میں اضافہ سے متعلق نہیں بلکہ چیزوں کے بارے میں حقیقی علم سے متعلق ہے، جہاں علم کا تعلق منطق سے منسلک ہو جاتا ہے۔ تجزیاتی نقطۂ نظر سے سچ یا حقیقت کو روحانی اور کائناتی بلکہ مادی لحاظ سے مختلف حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اس تقسیم میں سائنس کے تمام پہلو شامل ہو جاتے ہیں۔

یہ دنیا جہاں ہم مقیم ہیں جہاں زمین، سمندر، سیارے اور کائنات کی دیگر رنگا رنگی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہیں۔ ہمیں بے شمار ایسے لوگ ملتے ہیں، جنہوں نے ان کی تخلیقوں کو ہم پر عیاں کیا اور ہمیں انسانی معاشروں کے بارے میں بھی علم سے آگہی مہیا کی۔ ان میں بہت سے لوگ ماضی کے دھندلکوں میں کھو گئے ہیں۔ اب جبکہ ہم حال میں سانس لے رہے ہیں، قبل مسیح کی تاریخ سے ہمیں تھیلس اور فیثا غورث کے نام چمکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ تاریخ نے اس حقیقت کا انکشاف واضح انداز سے کیا ہے کہ انسان کو ایسی طاقت کا سامنا ہے جو اسے جستجو پر مجبور کرتی ہے۔ اس علم کے بارے میں جس کے متعلق کوئی علم نہیں' ارسطو نے واضح الفاظ سے کہا تھا ''یہ انسان کی فطرت میں شامل ہے کہ وہ جستجو کی خواہش رکھتا ہے''

حقیقتاً علم حاصل کرنے کی خواہش کا تعلق انسان کی اپنی ہستی ہے۔ قرآن کریم میں اس بات کو اس طرح بھی پیش کیا گیا ہے کہ آدم کو ''تمام چیزوں کے نام سکھا دیے گئے تھے''۔ (القرآن) علم کی اہمیت کا اندازہ اس حقیقت سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا کہ ''علم حاصل کرو چاہے تمہیں چین تک جانا پڑے'' اس حدیث مبارکہ میں لسانی اور تمدنی حسد کی واضح طور پر نفی کی گئی ہے۔ جو اکثر علم حاصل کرنے میں آڑے آتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ کہنا حق بجانب ہے کہ علم، سچ اور حقیقت کی تلاش اسلام کا ایک حصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کوئی حادثہ یا اتفاقی واقعہ ہرگز نہیں کہ ساتویں صدی کے بعد سے اسلامی دنیا علم کے میدان میں ہر لحاظ سے چھائی ہوئی تھی۔ مسلمانوں نے دنیا کے ہر ایسے کونے میں جانے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی جہاں سے انہیں علم حاصل ہو سکتا تھا۔

جب مسلمان علم کے آسمان پر سورج کی مانند روشن تھے تو عربوں نے ''بیت الحکمہ'' اور ''نظامیہ جیسے مدارس' شاہدہ گاہیں اور لیبارٹریاں قائم کیں اور جدید علوم کی ترویج کی خاطر دنیا بھر سے علماء کو جمع کیا۔ مسلمان ماہر فنون، فلسفی اور سائنسدان علم کا ایک وسیع ذخیرہ تھے جو جستجو کے جذبے سے سرشار تھے۔ الفارابی، ابن سینا، ابن رشد، خوارزمی، رازی مسعودی، البیرونی، طوسی، نصیر الدین، ابن نفیس، ابن بجاج، ابن طفیل، الکندی بہت سے اشخاص میں چند بڑے نام ہیں جن کا ذکر کرنا یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ان علم کے میناروں نے اپنے علم سے کئی نسلوں کو روشن کیا۔ یہ پہلو افسوسناک ہے کہ یورپ نے ارسطو اور دوسرے یونانی علماء کے علم کو اپنے لئے نشان راہ سمجھا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ارسطو کا علم مسلمانوں کا مرہون منت ہے، کیونکہ جب یورپ جہالت کے اندھیرے میں گھرا ہوا تھا تو اس وقت بھی سائنسی علوم سے متعلق دنیائے عرب میں بہت کام ہو رہا تھا۔

قرآن کریم نے ٹیکنالوجی اور تحقیق کی اہمیت پر بہت زور دیا ہے۔ ''اور اس نے آسمانوں اور زمین پر جو کچھ ہے تمہارے تابع کر دیا ہے۔ اس میں نشانیاں ہیں ان کیلئے جو سمجھتے ہیں''۔ (القرآن) سوچنے سمجھنے والوں کیلئے ضروری ہے کہ وہ کائنات میں موجود مواقع وعوامل کے بارے میں تحقیق کریں اور ٹیکنالوجی کے ذریعے بنی نوع انسان کی ترقی میں اپنا کردار ادا کریں۔ اس قدر قابل فخر وراثت کے مالک مسلمانوں کیلئے یہ لمحہ فکریہ ہے کہ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں ذہنی لحاظ سے مردہ نظر آتے ہیں۔ ٹیکنالوجی کے میدان میں مشرق اور مغرب کے درمیان خلیج اتنی وسیع نہ تھی جتنی آج ہے اور مسلمانوں کیلئے اس فاصلے کو سمیٹنا اتنا مشکل کبھی نہ تھا جتنا آج ہے۔ آج سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں مغرب کو مکمل فوقیت حاصل ہے اور مسلمانوں کی حیثیت انتہائی کم ترقی یافتہ ہے۔

چودھویں صدی میں مسلمانوں کے علمی انحطاط کی کئی وجوہات ہیں۔ ان میں ایک منگولوں کی مسلمانوں کے تہذیب یافتہ علاقوں پر یلغار بھی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب یورپ اندھیروں سے روشنی کی طرف دیکھ رہا تھا، جس کے اثر کے تحت یورپی اقوام نے فوجی نوعیت کی ٹیکنالوجی کو فروغ دینا شروع کیا۔ جس نے انہیں اتنی قوت بخش دی کہ وہ کمزور ممالک پر چڑھ دوڑیں اور انہیں اپنی کالونیاں بنا لیا۔ اسلامی دنیا نے دوسری طرف ایک منفی رجحان کے تحت اٹھارویں انیسویں کے یورپی سامراجیت کے ردعمل کے طور پر سماجی اور سیاسی ترقی کو اپنا دشمن سمجھ لیا۔ سامراجیت

کے زیر اثر نوآبادیوں میں معاشی، ثقافتی اور تعلیمی میدانوں میں ترقی کا عمل بری طرح سے متاثر ہوا۔ واضح طور پر ان نوآبادیوں کا یہ فرض جانا گیا کہ وہ اپنے سامراجی حکمرانوں کی خدمت کریں۔ تعلیم کو ایک خاص طبقے تک محدود کر دیا گیا تا کہ انتظامی امور چلانے میں آسانی ہو اور سائنس وٹیکنالوجی کے میدانوں میں ترقی مفقود ہوگئی۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد مغربی سامراجیت کا خاتمہ ہو گیا اور کالونیاں آزاد مملکتوں کے روپ میں ابھر آئیں لیکن قومی آزادی حاصل نہ ہو سکی۔ سامراجی ممالک نے نوآبادیاتی نظام میں جمع کی ہوئی دولت سے اپنے ہاں انڈسٹریل انقلاب برپا کر دیا اور ساتھ ہی ایسے اقدامات کیے گئے کہ کالونیاں ٹیکنالوجی کے میدان میں ان کے تابع ہوں۔ نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد بھی عدم مساوات کے نظام کو برقرار رکھا گیا جس کے نتیجے میں ایک دنیا کو ترقی یافتہ مثلاً مغربی ممالک اور جاپان اور غیر ترقی یافتہ ممالک کو تیسری دنیا کا نام دیا گیا، جس میں ساری اسلامی دنیا شامل ہے۔ اس طرح معاشی خوشحالی تیسری دنیا کے ممالک سے رخصت ہوگئی، جس کی ایک بڑی وجہ مغرب کی وہ چیرہ دستیاں تھیں جن کے تحت اس نے اپنے آپ کو بنیادی ضرورت کی اشیاء کی پیداوار تک محدود کر لیا۔ کیونکہ بنیادی ضرورت کی اشیاء کی طلب میں بہت زیادہ لچک موجود ہوتی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک نے بین الاقوامی نظام کے اندر اپنے آپ کو آزادانہ طور پر متحرک کرتے ہوئے تجارتی پابندیاں عائد کیں اور ٹیکسوں اور حصہ داری کا ایک ایسا نظام قائم کیا جس کے تحت ان کی اجارہ داری برقرار رہے۔ نتیجتاً ترقی پذیر ممالک نہ تو اس قدر دولت پیدا کر سکے کہ وہ صنعتی لحاظ سے ترقی کر سکتے اور نہ ہی ٹیکنالوجی کے میدان میں مغرب کی ہمسری کر سکتے تھے۔ یہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کا نتیجہ تھا جس کا مقصد تھا کہ تیسری دنیا کے ممالک کسی لحاظ سے بھی ترقی یافتہ ممالک کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ اس طرح مسلمان ممالک بیرونی امداد اور ٹیکنالوجی کے تابع ہو گئے اور ہتھیاروں کی در آمد میں اپنی دولت بہانے لگے۔ یہاں تک کہ جنوب کے وہ مسلمان ملک جو تیل کے ذخائر کی وجہ سے انتہائی مالدار تھے مغرب کے زیر اثر صنعتی اور تکنیکی عمل کی بنیاد رکھنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

اس کے علاوہ بین الاقوامی مالیاتی اداروں مثلاً آئی۔ ایم۔ ایف اور ورلڈ بنک نے ایسی شرائط عائد کر دیں کہ ان ملکوں کی معاشی، صنعتی اور تکنیکی ترقی ناممکن ہوگئی۔ مندرجہ ذیل خاکہ بیان کیے گئے حقائق کو مزید پختہ کرنے کیلئے کافی ہے۔ گو کہ اسلامی ممالک دنیا کا 90 فیصد خام تیل، 40 فیصد قدرتی گیس، 80 فیصد قدرتی ربڑ اور 75 فیصد جیوٹ پیدا کرتے ہیں۔ یہ تمام اجناس مجموعی طور پر دنیا کے کاروبار کا 50 فیصد سے کچھ زائد ہے۔ تمام مسلمان ممالک کی مجموعی قومی پیداوار 1.1 بلین ڈالر ہے یہ اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ مسلمان ممالک باوجود اس کے کہ بہت وسیع قدرتی وسائل کے حامل ہیں ٹیکنالوجی کی عدم موجودگی کے باعث اس خام مال کو جنس میں تبدیل کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ اس طرح تعلیم کے میدان میں بھی واضح اختلافات موجود ہیں۔ مسلمان ممالک میں 19-5 سال کی عمر کے بچوں کا نصف اور تقریباً آدھی بالغ آبادی بنیادی تعلیم سے محروم ہے۔ بلند و بانگ دعووں کے باوجود عالم اسلام اعلیٰ تعلیم خصوصاً سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدانوں میں مجرمانہ غفلت کا شکار ہے۔ اسلامی دنیا میں موجود 50000 سائنس دانوں اور انجینئروں کے مقابلے میں اسرائیل میں 35000 اور جاپان میں 4000000 انجینئر کام کر رہے ہیں۔ نتیجتاً اسلامی دنیا میں ایک ملین افراد کیلئے 100 سائنس دان اور تکنیکی ماہرین ہیں جبکہ ترقی یافتہ ممالک میں یہ تعداد 3000 ہے۔

فلاڈیلفیا میں قائم "انسٹیٹیوٹ آف سائنٹفک انفارمیشن" نے دنیا کے بہترین رسالوں میں شائع ہونے والے تحقیق مقالوں کی بنیاد پر اخذ کیا ہے کہ تحقیقی میدان میں امریکہ پہلے، بھارت آٹھویں اور اسرائیل پندرھویں نمبر پر ہے۔ ایک سال میں مجموعی طور پر شائع ہونے والی ایک لاکھ کتابوں اور 20 لاکھ کے لگ بھگ تحقیقی مقالوں میں مسلمانوں کا حصہ محض 1000 ہے۔ سائنس وطبی میدان میں جو کہ میری دلچسپی کا مرکز ہے 40 ہزار کی مجموعی اشاعت میں مسلمانوں کا حصہ صرف 240 پیپرز ہیں۔ گو کہ یہ حقیقت ہے کہ سامراجیت اور نیو نوآبادیاتی نظام نے تیسری دنیا کی ترقی کے عمل کو نقصان پہنچایا لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ اٹل ہے کہ گزشتہ نصف صدی کی آزاد زندگی دیکھتے ہوئے مسلمان ممالک اپنی پسماندگی کا سبب تاریخی عوامل کو نہیں ٹھہرا سکتے یا ترقی یافتہ ممالک کے تحقیر آمیز رویے پر اس کا الزام نہیں تھوپ سکتے۔ یہ سوچ ضرر رساں ہے اور مسلمانوں میں ترقی کے جذبے کیلئے سم قاتل ہے۔ اس قسم کے رویے نے سائنسی تحقیق اور تکنیکی مہارت جیسی دولت کو ہم سے دور کر دیا۔

لہٰذا ہمیں وہ سب کچھ کرنا چاہیے جو ہم کر سکتے ہیں۔ مندرجہ ذیل تجاویز ہمیں علمی اور سائنسی لحاظ سے کسی حد تک عزت کا مقام دے سکتی ہیں۔ بعض مسلمان ممالک میں خواندگی کی شرح انتہائی حوصلہ افزا ہے۔ مثلاً ملائشیا میں 90 فیصد اور اردن میں 90 فیصد لیکن پاکستان، بنگلہ دیش اور افغانستان میں تعلیم کا تناسب 40 فیصد سے بھی کم ہے۔ ان ممالک کیلئے ضروری ہے کہ وہ تعلیم کے میدان میں خوب محنت کریں۔ تعلیم کو دوسرے شعبوں پر فوقیت دیتے ہوئے اس شعبے میں زیادہ رقوم کی فراہمی انتہائی ضروری ہے۔ پاکستان میں مجموعی قومی پیداوار کا محض 2.7

فیصد تعلیم پر لگایا جاتا ہے۔اس کی وجوہات میں تعلیم کا فوری منافع نہ پہنچانا اور تعلیم خصوصاً سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان کو درخور اعتنانہ سمجھنا بھی شامل ہیں۔دوررس نتائج کے حامل پراجیکٹس کو سیاسی عاقبت نا اندیشی پر قربان کر دیا جاتا ہے۔دوم یہ کہ عددی عوامل کی طرح جب تک سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان کو معیار کے اعتبار سے برابری کی سطح پر نہیں لایا جاتا ترقی ممکن نہیں۔سائنس اور سائنسی تحقیق کے میدان میں زیادہ محنت کی ضرورت ہے۔ سائنسی میدان میں جدت اور دلچسپی کو اجاگر کرنے کیلئے ضروری ہے کہ سائنس دانوں کو زیادہ سے زیادہ مدد فراہم کی جائے۔ بھارت میں مجموعی قومی پیداوار کا 0.55 فیصد تحقیق و ترقی کے عمل پر خرچ کیا جاتا رہا ہے۔حال ہی میں انہوں نے تعلیمی شعبے سے منسلک لوگوں کی تنخواہوں میں تین گنا اضافہ کر دیا ہے۔سوم یہ کہ جہاں فنڈز کی کمی نہیں مثلاً سعودی عرب وغیرہ، وہاں پر سائنس و تعلیمی تحقیق اور ترقی پر توجہ نہیں دی جا رہی۔ حالیہ اعداد و شمار سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ سعودی عرب اور خلیجی ممالک نے صرف ایک سال کے دوران 15 بلین امریکی ڈالر محض اسلحہ کی درآمد پر خرچ کئے ہیں۔یہ ایک مثال ہے جو ہمیں اس بات کی اہمیت کو واضح کرنے میں مدد دیتی ہے کہ ہم نئے سرے سے اپنے لئے ایک لائحہ عمل اختیار کریں جو دوررس نتائج کا حامل ہو اور بیرونی دباؤ کے خلاف ہمیں ہمت عطا کرے تاکہ بوسیدہ قسم کی درآمدات یہاں نہ کھپائی جا سکیں۔ عام طور پر مسلمان سائنس دانوں اور ترقی یافتہ ممالک میں اسی میدان سے وابستہ افراد کا آپس میں تعاون اور رابطہ بہت ضروری ہے اور اس کیلئے مالی مدد کی جانی چاہیے۔پاکستان میں بھی اس سبق کو یاد رکھنا ہوگا کہ جہاں سیاسی ارادہ، مالی تعاون، ٹیم ورک اور سودے بازی نہ کرنے والی لیڈر شپ ہو وہاں ترقی ممکن ہے۔

قسط نمبر 7

خاندانی پس منظر

بمبئی کے جنوب میں تین ہزار میل دور اور کیپ ٹاؤن کے مشرق میں پانچ ہزار پانچ سو میل کے فاصلے پر ایک تحقیقی جہاز بحر ہند کے وسیع و عریض پاٹ میں موجود تھا۔ اس پر ڈاکٹر خان سوار تھے۔ ان کی آنکھوں پر انفرا ریڈ دوربین تھی وروہ افق کی سمت دیکھ رہے تھے۔ صبح کاذب کی کرن نے مشرقی آسمان کو جونہی روشن کیا بارج اور ڈیٹونیشن ناو نظر آنے لگے وہ تباہ کن جہاز جو بارج کو یہاں تک لائے تھے اب کراچی کی طرف رواں دواں تھے۔

ڈاکٹر جے ٹی کمانڈ شپ کے برج پر ڈاکٹر خان کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس نے اپنی دوربین نیچے کی اور گھڑی دیکھی۔ پھر دھیرے سے کہا "سولہ منٹ"

"مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے شہید فرید شاہ کی روح بھی ہمارے ساتھ موجود ہے" ڈاکٹر خان کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"میں نے ان سے پہلے ہی کہا تھا کہ ایکسرے وغیرہ سب غیر متعلقہ چیزیں ہیں۔ ہمیں تو مہینوں پہلے یہ تجربہ کر لینا چاہیے تھا سر" جے ٹی نے کہا۔

"کہنا آسان ہے کرنا مشکل ہے پیارے!" ڈاکٹر خان کا لہجہ اچانک روکھا ہو گیا "اب اگر فرید شاہ کامیاب ہو جاتا تو کسی بھی ملک کے مصنوعی سیارے سے ہمیں خطرہ نہیں رہتا۔ اب خطرہ موجود ہے اور یاد رکھو کہ منفی سیاسی اثرات تابکاری سے کہیں زیادہ خطرناک ہوتے ہیں"۔

"آج تو آپ کے خواب کی تعبیر ملنے والی ہے......" جے ٹی کا لہجہ خوشامدانہ ہو گیا۔

"اللہ مالک ہے......" ڈاکٹر خان بولے۔ انہوں نے آسمان پر نظر دوڑائی تو ایک اورین 3 پیٹرول کرافٹ کی جلتی بجھتی سرخ روشنی نظر آئی جس میں میگنیٹک ہائی فریکوئنسی بیم موجود تھیں اور جو دھماکہ کرنے والی تھیں۔

وہیل ہاؤس میں کیپٹن نے رفتار کے بارے میں ہدایت کی۔ ایک ریڈیو مین نے الٹرا ہائی فریکوئنسی ٹرانسمیٹر کے ذریعے اورین کے پائلٹ کو سرگوشی میں کچھ بتایا۔ چمکدار سکرین پر جھکے ہوئے راڈار مین نے سبز لائن پر نظر جما دی جو 50 میل کے دائرہ کا حال بتا رہی تھیں۔ سونار مین نے زیر آب بیم بھیجنی شروع کر دی تا کہ کسی آب دوز کے حملے کا خدشہ نہ رہے۔

"ہوا باز سے کہو کہ وہ فلیش پوائنٹ پر پہنچے بلندی دس ہزار فٹ رکھی جائے" ڈاکٹر خان نے ریڈیو مین کو حکم دیا۔

یہ پیغام فوراً ہی روانہ ہو گیا۔ پائلٹ نے ڈاکٹر خان سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔

"لیس کیپٹن......" ڈاکٹر خان کے لہجے میں شفقت بھری ہوئی تھی۔

"کیا ہم صرف دس ہزار فٹ کی بلندی پر محفوظ ہیں سر؟" ہوا باز کا لہجہ سپاٹ تھا۔

"سنوئر کے! ہم بحر ہند کو اڑانا نہیں چاہتے" ڈاکٹر خان نے زیر لب مسکرا کر کہا۔

"یہ محض ایک ڈیٹونیٹر ہے۔ دھماکے سے جھما کا ضرور ہو گا لیکن اس کی قوت صرف 02 کلوٹن ہو گی اور تابکاری بھی بہت ہی معمولی ہو گی۔ دھماکے کے دائرے افقی نہیں ہونگے لہذا ڈرومت۔ حوصلے سے کام لو تمہارے کیمرے بہت جلد ایک تاریخی واقعہ فلمانے والے ہیں میرے بچے"۔

"چیک......" ہوا باز نے مستعد لہجے میں جواب دیا اور ہدایت پر عمل کرنے لگا۔

"امریکہ کا ایچ 11 سیارہ 35 منٹ قبل یہاں سے گزر چکا ہے" جہاز کے کپتان نے ڈاکٹر خان کو مطلع کیا۔

"ان مصنوعی سیاروں کے مدار کا راستہ کبھی کبھار بدلتا بھی رہتا ہے کیپٹن" ڈاکٹر خان بولے۔ "بہر حال اب دعا کرو سب مل کر دعا کرو"۔

ایک منٹ بعد ریڈیو پر ہوا باز کی آواز سنائی دی "ٹو منٹس ٹو فلیش پوائنٹ"

ڈاکٹر خان اور جے ٹی دونوں نے فلائنگ بارج پر آ کر فلیش فلرڈ دوربین لگا لیں۔ اب وہ بارج کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"ون منٹ" ہوا باز کی آواز اب بیرونی اسپیکروں سے آ رہی تھی۔

جے ٹی نے سر جھکا دیا۔

"پندرہ سیکنڈ" برج پر ہوا باز کی آواز پھر پھیلتی چلی گئی۔

وہیل ہاؤس کے اندر عملے نے انفرا ریڈ ڈارک لینز والے چشمے آنکھوں پر چڑھا لیے۔ پھر وہ سب فلائنگ برج پر پہنچ گئے۔

"فلیش پوائنٹ" پائلٹ کی آواز اب ترخ سی رہی تھی۔

"آل کیمراز کو۔ آل ٹیلی میٹر کو۔۔۔۔۔ فائیو فور۔۔۔۔۔ تھری' فریکوئنسی بیج ایکٹیویٹڈ۔۔۔۔۔ ٹو۔۔۔۔۔ ون۔۔۔۔۔ زیرو۔۔۔۔۔"
افق سے افق تک زوردار۔۔۔۔۔ شدید زرد دھماکہ ہوا جس نے ازخود سرخ دائرے کی شکل اختیار کرلی۔ یوں لگا جیسے پورے سورج کو کھینچ کر باہر نکال لیا گیا ہو۔ اس کی چمک بہت شدید تھی' پھر اس میں کمی آنے لگی۔ دائرہ محض چند سیکنڈ کے لئے دوبارہ روشن ہوا اس کے بعد بجھنے لگا۔

جہاز کا عملہ وہیل ہاؤس کے قریب گرا ہوا تھا' زوردار لہروں' جھٹکوں اور زلزلے جیسی کیفیت کے باوجود ڈاکٹر خان نے خود کو سنبھالا اور جے ٹی کو گلے لگا لیا۔ "حضرات" ان کی آواز خوشی سے بھرا گئی۔ "اپنے دفاع کا راز ہم نے پالیا ہے اب ہمیں کوئی ایٹم بم سے نہیں ڈرا سکے گا۔"

وہ تیز جھماکا امریکہ کا سب سے حساس اور انتہائی اعلیٰ صلاحیت رکھنے والا جاسوس سیارہ کے ایچ 11 بھی ریکارڈ نہ کر سکا۔ لیکن دلچسپ واقعہ یہ ہوا کہ اس جھماکے کو ایک اور تقریباً ناکارہ سیارے "ویلا" نے ریکارڈ کرلیا اور اسی کے انفراریڈ سینسرز نے روشنی کی شدت بھی محفوظ کی۔ ایڈورڈز ائربیس کے فنی عملے نے ویلا کی ٹیلی میٹری کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ رپورٹ پیش کی کہ بحرہند کے جنوبی حصے میں کسی جگہ کم شدت والا ایٹمی دھماکہ کیا گیا ہے۔

"خدایا" امریکی وزیر خارجہ ہیرالڈ لیوکنز نے گہری نیند سے بیدار ہونے پر یہ خبر سنی تو اس کی ساری سستی جاتی رہی۔ اس نے فی الفور صدر مملکت کو مطلع کیا اور بہت جلد فورٹ ہیڈ میری لینڈ میں نیشنل سیکیورٹی کونسل کے ایمرجنسی روم میں ایک ہنگامی اجلاس شروع ہو گیا۔

اجلاس میں شریک چیف آف سٹاف جنرل اے مارٹنز' سی آئی اے کے ڈائریکٹر ایڈمرل کلارک ڈیوائل' وزیر دفاع والٹر گلفورٹ اور لاس المازمیں واقع نیوکلیر ریسرچ کے ڈائریکٹر سمرز۔ سب کے چہروں پر کشیدگی اور غیر یقینی کیفیت تھی۔

وزیر خارجہ نے سر جھٹک کر بات کی۔ دھماکے سے متعلق جو اعداد و شمار ہمیں موصول ہوئے ہیں ان کی روشنی میں فی الوقت یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ دھماکہ بحرہند میں پرنس ایڈورڈ چین کے جنوب میں چار سو بحری میل دور کیا گیا ہے"
وزیر خارجہ نے ایک کاغذ سامنے رکھ لیا۔ باقی تمام لوگ خاموش رہے۔ وہ وزیر خارجہ کی گفتگو کے بعد ہی بحث میں حصہ لے سکتے تھے۔ "اس سلسلے میں صدر مملکت ہمارے تجزیے اور ان نتائج کے منتظر ہیں جو ہم یہاں اخذ کریں گے۔ حضرات! روسی' چینی' بھارتی اور ہمارے ناٹو کے حلیف سب ہی اپنے اپنے طور پر اعداد و شمار کی روشنی میں تجزیے کر رہے ہیں لیکن میں صرف اتنا کہنا چاہوں گا کہ اس دھماکے نے پوری دنیا کو جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے اور اس کے سیاسی و فوجی اثرات بہت زیادہ ہوں گے۔ بھارتیوں نے تو پہلے ہی اس کی ذمہ داری پاکستان پر عائد کردی ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ روسی بھی بہت جلد کوئی ایسا ہی اعلان کرنے والے ہیں"
"وہی ہوا جس کا خدشہ تھا" چیف آف سٹاف نے منہ بنا کر کہا:
"پلیز" وزیر خارجہ کے لہجے میں خفگی نمایاں تھی۔ "کسی نتیجے پر عجلت میں پہنچنا اچھا نہیں۔ ہم جنوبی افریقہ یا اسرائیل کو بھی نظرانداز نہیں کرسکتے"۔
امریکی وزیر دفاع نے کندھے اچکاتے ہوئے بڑی حیرت سے وزیر خارجہ کی طرف دیکھا۔ "وہ اس قسم کا دھماکہ کیوں کرنے لگے؟ انہیں زیرو شدت والا دھماکہ کئے عرصہ ہو گیا۔ اب وہ لیزر لیب تک بنا چکے ہیں۔ جہاں تک جنوبی افریقہ والوں کا تعلق ہے تو وہ ہزاروں ٹن وزنی بارج کھینچ کر ہزاروں میل دور بحرہند میں لانے کی بجائے کسی ویران صحرا میں زیر زمین دھماکہ کر سکتے ہیں۔ نو سر۔ یہ کام صرف اور صرف پاکستان کا ہے۔ صرف پاکستان کا"
یہ اقتباس یورپی ناول نگار ایسٹو شوگن کے ناول "Pillars of fire" سے لیا گیا ہے جو 16 سال پہلے شائع ہوا اس نے یورپی حلقوں میں بے حد پذیرائی حاصل کی۔ ناول میں پاکستان' لیبیا اور دیگر اسلامی ممالک کے حوالے سے "اسلامی بم" کی تیاری اور مستقبل کے امکانات کو مرکزی خیال بنایا گیا۔ مذکورہ اقتباس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر خان (ڈاکٹر عبدالقدیر خان) اسلام دشمن عناصر کے اعصاب پر کس حد تک سوار تھے۔ یہ ناول ایک ایسے دور میں لکھا گیا جب اسلامی بم کے خوف نے مغربی دنیا کے حواس مختل کئے ہوئے تھے اور کوئی دن ایسا نہیں گزرتا تھا جب یہودی' ہندو اور عیسائی پاکستان کے خلاف زہر نہیں اگلتے تھے۔ دنیا بھر میں پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو تنقید کا نشانہ بنایا جاتا تھا اور مغربی میڈیا پاکستان میں زلزلے کے ایک معمولی سے جھٹکے کو بھی ایٹمی دھماکے کا نتیجہ قرار دیتے تھے۔ ان سامراجی طاقتوں نے پاکستان کے جوہری پروگرام کو تباہ و برباد کرنے کے لئے کئی بار اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کرنا چاہی مگر ہر بار قدرت نے پاکستان کو ان شرپسندوں سے محفوظ فرمایا۔
18 مئی 1974 کو جب بھارت نے ایٹمی دھماکہ کیا تو جنوبی ایشیا بالخصوص پاکستان کا مستقبل خطرات سے دوچار ہو گیا تھا۔ بھارت جسے 1971ء کی جنگ میں روس نے ایٹمی چھاتہ مہیا کیا تھا اب خود اس میدان میں آ گیا تھا اور اسے پاکستان پر زبردست نفسیاتی اور فوجی فوقیت حاصل ہو گئی تھی۔ پاکستان کے لئے بھی یہ فیصلہ کن لمحہ آ چکا تھا۔

قوم کا مورال گر چکا تھا اور دفاع وطن کی ذمہ دار مسلح افواج میں بھی مایوسی پھیل رہی تھی۔ لہذا ملکی سلامتی اور قوم کا مورال بلند کرنے کے لئے دشمن کے دانت توڑنے کا عہد کیا گیا اور وزیر اعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو نے یہ نعرہ لگایا "ہم گھاس کھالیں گے مگر ایٹم بم ضرور بنائیں گے۔ اب ہمیں اس اقدام سے باز نہیں رکھا جا سکتا"۔

وزیر اعظم پاکستان کے اعلان نے سامراجی قوتوں کو برانگیختہ کر دیا اور پاکستان کو ایٹمی توانائی کے منصوبوں سے محروم کرنے کے لئے اس پر نیوکلیئر پابندیاں لگا دی گئیں۔ ایک ایسے وقت میں جب پاکستان امریکہ اور کینیڈا سے ایٹمی ری ایکٹر خرید کر ایٹمی توانائی کے حصول کی طرف بڑھ رہا تھا اسے مفلوج کر دیا گیا۔

بھارت ایٹمی دھماکہ کرنے کے بعد پاکستان کو آنکھیں دکھانے لگا تھا اور جب پاکستان کو مغربی دنیا نے ایٹمی ری ایکٹر کے پرزے فراہم کرنے سے انکار کر دیا تو بھارت کے توسیع پسندی کے عزائم بھی بے نقاب ہونے لگے۔ بھارت کو یقین تھا کہ پاکستان امریکہ' کینیڈا' فرانس اور دوسرے کسی بھی جوہری طاقت والے ملک سے ایٹمی ٹیکنالوجی حاصل نہیں کر سکے گا مگر ادھر قدرت نے پاکستان کی سالمیت کے اسباب پیدا کر دیئے اور اسے ڈاکٹر عبدالقدیر خان جیسا جوہری مہیا کر دیا جنہوں نے ایک افلاس زدہ قوم کو اسلامی بم کی نوید سنائی۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے بے سروسامانی اور مایوس کن فضا میں جوہری منصوبے کی داغ بیل ڈالی۔ تقدیر نے ان سے امت مسلمہ کے لئے دیو مالائی کردار ادا کرانے کا فیصلہ کیا تھا اور انہیں افتاد زمانہ کا پامردی سے مقابلہ کرنے کی طاقت دی تھی۔ اگر وہ تقدیر کی بخشی ہوئی قوتوں کا استعمال نہ کرتے تو وہ کبھی بھی ثابت قدمی سے اندرونی و بیرونی محاذ پر ڈٹے نہ ہوتے۔ وہ شاید ابھی تک ہالینڈ کے المیلو سنٹر میں اپنی خداداد صلاحیتوں کا استعمال کر رہے ہوئے اور مغربی دنیا ان کی خدمات کے عوض انہیں اربوں ڈالر دے چکی ہوتی مگر روپیہ پیسہ اور شہرت ڈاکٹر خان کا منشا نہیں تھا۔ ان کا عزم و استقلال اور خداداد صلاحیتیں صرف پاکستان کے لئے وقف تھیں لیکن ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے سے قبل انہیں پاکستان کی افسر شاہی نے بہت خوار کیا۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے خود کفالت کا نعرہ لگایا اور ایک نہایت نازک اور حساس دور میں پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھے تھے لیکن ملکی سالمیت کے تقاضوں سے بے بہرہ افراد اور ملک کے بدخواہوں نے ان کے ساتھ جو توہین آمیز سلوک کیا' وزیر اعظم پاکستان نے وقت آنے پر اس کا بدلہ چکا دیا اور انہیں عزت و احترام کی علامت قرار دیا' اس کے باوجود ڈاکٹر عبدالقدیر خان برہنہ پا سنگریزوں اور کانٹوں پر چلتے رہے اور بالآخر پاکستان کو روشن ہموار اور عزت و وقار کے راستوں پر لے آئے۔

خاندانی پس منظر

ڈاکٹر عبدالقدیر خان اہل کمال و ہنر کی سرزمین ریاست بھوپال میں 27 اپریل 1936ء کو پیدا ہوئے۔ وہ پانچ بھائی اور دو بہنیں تھے۔ عبدالقدیر چھٹے نمبر پر ہیں۔ ان سے چھوٹی ایک بہن تھی۔ ان کے والد گرامی عبدالغفور خان ناگپور یونیورسٹی کے گریجویٹ تھے۔ وہ تکمیل تعلیم کے بعد شعبہ تدریس سے منسلک ہو گئے اور ایک عرصے تک الور جبل پور بھساول' کامٹی میں مقیم رہے اور سی پی کے مختلف مقامات پر خدمات انجام دیتے رہے۔ انہوں نے کچھ عرصے تک انسپکٹر آف سکولز اور سپرنٹنڈنٹ آف سکولز کے طور پر بھی کام کیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد خود ہی سپرنٹنڈنٹ کا عہدہ چھوڑ کر مستقلاً ہیڈ ماسٹری کو اپنا لیا۔ انہوں نے جبل پور اور ناگ پور کے مختلف سکولوں میں بطور مدرس خدمات انجام دیں اور آخر کار 1935ء میں ریٹائرمنٹ لے کر مستقل طور پر بھوپال میں آ بسے کہ وہاں اہل علم کی جو عزت تھی وہ کہیں اور نہ تھی۔

ڈاکٹر عبدالقدیر کا تعلق ایک اعلیٰ منصب اور سپاہ گر خاندان سے ہے۔ وہ ترک النسل ہیں۔ ان کے آباؤ اجداد بارہویں صدی عیسوی میں برصغیر ہند میں وارد ہوئے۔ یہ وہ دور تھا جب اجمیر اور اس کے مضافات سلطان الہند خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کی شمع ہدایت سے منور ہو رہے تھے اور سلطان شہاب الدین محمد غوری برصغیر میں ایک اسلامی سلطنت کی بنیادیں استوار کر رہا تھا۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے جد امجد ملک بہبل سلطان غوری کے دست راست اور فوج کے ایک دستے کے کماندار تھے۔ ملک بہبل نے 1192ء میں ترائن کے میدان میں پرتھوی راج چوہان کی شکست میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس لڑائی میں وہ میمنہ کے کماندار تھے۔

ملک بہبل سلطان غوری کی اس فوج میں بھی شامل تھے۔ جس نے 1193ء میں چندواڑہ کی حدود میں قنوج کے راجہ جے چند کو شکست دی اور سابق ریاست جے پور کا قدیم قلعہ فتح کیا جو بعد میں فتح پور کہلایا۔ پھر اناوہ سے بنارس کی جانب پیش قدمی کی۔ روایات کے مطابق سلطانی لشکر نے قلعہ فتح پور ہی میں ڈیرہ ڈال رکھا تھا کہ ایک روز ملک بہبل اپنے چند جانبازوں کے ساتھ شکار کی تلاش میں نکلا۔ مگر قصبہ کوٹ کے ہندو راجہ بہادر نے اس پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ قصبہ کوٹ' کانپور سے چند میل کے فاصلہ پر دریائے جمنا پر واقع ہے۔ راجہ بہار گوجر تھا اور پرتھوی راج چوہان کے جانثاروں میں سے تھا۔ اس نے راجہ چوہان کی ہزیمت کا بدلہ چکانے کے لئے ملک بہبل کو گھیر لیا۔ اس روز ہولی کا تہوار منایا جا رہا تھا۔ ملک بہبل اور ان کے ساتھی جذبہ اسلام سے سرشار تھے۔ وہ دشمن کی بھاری جمعیت کو خاطر میں نہ لائے اور آناً فاناً اس کا صفایا کر دیا۔ یہ معرکہ امیا دائی میں ہوا۔ ہندو اب تک اسے یاد کرتے ہیں۔ قصبہ کوٹ کو اسی جنگ سے شہرت ملی اور یہاں پٹھانوں اور ترکوں کی آبادی ہو گئی۔

اس جنگ کا منظوم حال ملک محمد حفاظت علی کھکروٹی نے "جنگ نامہ ملک بہبل" میں بڑے دلکش انداز میں رقم کیا ہے۔ جس کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

رسلدار ملک بہبل تھے بیشک قوم کھکر سے
شہاب الدین غوری کے جلو میں آئے تھے گھر سے
قبیلے ہندوؤں کے تھے یہاں آباد کھروے میں
کہا جاتا ہے یہ اب تک کہ وہ تھے نسل گوجر سے
تلاش صید میں ہولی کے دن نکلے ملک صاحب
تصادم ہو گیا راجہ بہادر قوم گوجر سے
بڑی مردانگی سے یہ لڑے افغان نووارد
کمان ان کی جو گرتی تھی تو پھر لڑتے تھے خنجر سے
اسی کو فتح ہوتی ہے مقدر جس کا یاور ہو
بہت تھوڑے سے تھے یہ لوگ آئے تھے جو لشکر سے
کیا اعدا کا یوں بس فیصلہ دو چار گھنٹے میں
نہ باقی نام کا لیوا بچا پھر قوم گوجر سے
ابھی کھنڈرات چھیتا پور اور کھروے کے ہیں شاہد
ٹپکتی ہے شجاعت ان کی اک اک اینٹ پتھر سے
ہوا معلوم جب ان کو کہ ہے جمنا قریب ان کے
تو سمجھے بستا بہتر ہے کسی وادی میں ادھر سے

ہوا آباد یوں کوٹ اور پھر رونق ہوئی اس کی
بڑی ہی دلفریبی ہو گئی پھر اس کے منظر سے
ہوا جب انتقال مورث اعلیٰ ملک بہبل
بنی پھر قبر پھلواری میں ان کی سنگ احمر سے
ملے میراث میں حاجی بہبل کو گانوں بھی بارہ
کیا ایمان کو پختہ انہوں نے حجِ اکبر سے
مرید شاہ جیلانی تھے آئے تھے دیا ان کا
ابھی تک سوپ بھرتے ہیں دیوں سے اور شکر سے
اگر کوئی یہ سمجھے ان کی بیوی غیر کف سے تھی
نہیں ممکن کہ جاتے حج کو اور لاتے نہ وہ گھر سے
ابھی تک خون و ہڈی کی صفائی کا ہے پاس اتنا
کہ کھکرانی وہ کہلائے جو پیدا ہو نسوتھر سے
عمر خان تھے بڑے لڑکے جو تھے دربار خلجی میں
رہے فیروز خان چھوٹے تو وہ نکلے نہیں گھر سے
ملک اکبر حسن فرزند اکبر سے ہوئے پیدا
مگر تھے نورتاج و قطب بس یہ تینوں اصغر سے
کہ جس نے مسجد سلطانی لاون کی بنا ڈالی
کمگاری کٹ گئے مسجد گری دو بار ٹکر سے
اسی میں ہے نصب کتبہ جو ہے تاریخ کا رہبر
ابھی الفاظ تک اس کے عیاں ہیں صاف پتھر سے
بڑھی تعداد جو زاہد تو یہ اطراف میں پھیلے
اگر کھروے کو مرکز لو تو یہ پھیلے ہیں چکر سے
تمہاری ہر ادا صاحب دلیل نسل افغان ہے
تمہیں کیا کہہ سکے کوئی نہیں ہو تم جو کھکر سے

سلطان غوری نے ملک بہبل کو اس فتح کے صلے میں قصبہ کوٹ کی جاگیر عطا کی اور اس علاقے کا منتظم مقرر کر دیا اور ''ملک بابر'' اور ''خان'' کے خطابات سے نوازا۔ ملک بہبل کی وفات کے بعد ان کے بیٹے اور پوتے تخت دہلی سے وابستہ رہے۔

بھوپال کا خمیر

ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے دادا محمد منصور خان خاندانی اختلاف کی بنا پر قصبہ کوٹ چھوڑ کر فوج میں بھرتی ہو گئے اور سی پی (صوبجات متوسط موجودہ مدھیہ پردیش) کی فوجی چھاؤنی کامٹی میں مستقل رہائش اختیار کر لی۔ ان کے ہاں چار بیٹے محمد اسماعیل خان محمد محمود خان عبدالغفور خان اور محمد امیر خان پیدا ہوئے۔ محمد اسماعیل خان سب سے بڑے تھے والد کی وفات کے بعد انہوں نے اپنے تینوں بھائیوں کو والد کی طرح پالا پوسا اور اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ ان سے چھوٹے محمد محمود خان بہت سمجھدار اور سی پی میں ہندوؤں کی شرارتوں سے خوب واقف تھے لہٰذا وہ ریاست بھوپال چلے گئے۔ ان دنوں بھوپال میں نواب سلطان جہاں بیگم حکمران تھیں وہ تعلیم یافتہ مہمانوں کی قدر کرتی تھیں محمد محمود خان بھوپال کے محکمہ مالیات میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہو گئے جبکہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے والد عبدالغفور خان گریجوایشن کے بعد محکمہ تعلیم سے وابستہ ہو گئے۔ ڈاکٹر خان کے چچا محمد امیر خان قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد پہلے سی پی میں مجسٹریٹ رہے پھر دھرم جے گڑھ اسٹیٹ میں دیوان مقرر ہوئے اور اعلیٰ کارکردگی کے صلے میں حکومت برطانیہ سے خان صاحب کا خطاب پایا۔ محمد محمود خان نے بھوپال میں شادی کی اور اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں عبدالغفور خان اور محمد امیر خان کی شادیاں بھی وہیں کرائیں تاکہ وہ بھوپال آتے جاتے رہیں اور ریٹائرمنٹ کے بعد بھی وہیں سکونت پذیر ہوں۔ اور ہوا بھی یہی کہ یہ تینوں بھائی مستقل طور پر بھوپال ہی کے ہو کر رہ گئے۔

ڈاکٹر عبدالقدیر کی والدہ زلیخا بیگم کا تعلق بھوپال کے ایک معزز اور بااثر گھرانے سے تھا ان کے والد حکیم عبدالمجید خان کا شمار بھوپال کی معروف ہستیوں میں ہوتا تھا۔ وہ نواب سلطان جہاں بیگم کی بڑی بیٹی کے معالج بھی

رہے۔ان کا تعلق پٹھانوں سے تھا۔

بھوپال کی سرزمین نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو اسلامی علوم اور تحریک پاکستان کی گھٹی پلائی تھی ان کے والد ایک سرگرم تحریکی اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے زبردست حامی تھے۔وہ بچوں کی اخلاقی تربیت پر بطور خاص زور دیتے تھے۔درس وتدریس ان کا وسیلہ معاش ہی نہ تھا بلکہ وہ اسے خدمت انسانیت اور تعمیر انسانیت کا لازمی جز وتصور کرتے تھے۔اس لئے وہ ریٹائرمنٹ کے بعد آخری سانسوں تک بھوپال کی مردم خیز مٹی کا قرض اتارتے رہے اور علمی قندیل روشن کئے رکھی وہ اڑوس پڑوس کے بچوں کو تعلیم دیتے اور نمایاں پوزیشن حاصل کرنے والے بچوں کو انعامات سے نوازتے تھے یہی وجہ تھی کہ بھوپال میں ان کا بے حد احترام تھا۔

ڈاکٹر عبدالقدیر اپنے والدگرامی کے اوصاف کا مظہر تھے انہوں نے اپنے بچپن میں والد کی علمی اور سماجی سرگرمیوں کو قلب وجاں کا حصہ بنا کر اپنا مستقبل تعمیر کیا۔وہ اپنے والدگرامی کی یادیں تازہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

”میرے والدمحترم بھوپال میں ایک غیر معمولی حیثیت رکھتے تھے۔میں جب کبھی ان کے ساتھ بازار جاتا تو ہر شعبہ زندگی کے لوگوں مثلاً ایک معمولی دکاندار سے لے کر ڈاکٹر اور اعلیٰ سرکاری افسران کو ان کے احترام میں کھڑا پایا۔میرے والد ان لوگوں کے ہاں جاتے تو وہ ان کی آمد کو اپنے لئے تعظیم گردانتے اور ان سے تقاضا کرتے کہ وہ ان کے ہاں چند منٹ ٹھہریں اور چائے پی کر جائیں۔میری عمر اس وقت سات سال تھی والدگرامی کے اس احترام نے مجھے تمام عمر اس بات پر آمادہ رکھا کہ میرے والد نے جس مشعل کو روشن کیا تھا میں اسے ہمیشہ بلند رکھوں“۔

ڈاکٹر عبدالقدیر کے والد اپنے ہونہار بروا کی بصیرت کشادہ کرنے کے لئے ان کے سامنے اپنے اسلاف کے کارہائے نمایاں بیان کیا کرتے تھے۔وہ مستقبل کے عظیم سپوت کو ہندوؤں کے اوچھے ہتھکنڈوں سے آگاہ کرتے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عبدالقدیر کم عمری ہی میں تن تنہا آگ اور خون کا دریا عبور کر کے پاکستان آ گئے۔

ڈاکٹر خان کے والد نے سی پی میں ملازمت کے دوران مسلمانوں کے بارے میں ہندوؤں کا متعصبانہ رویہ قریب سے دیکھا تھا اور پھر یہ کہ جس دور میں وہ بھوپال میں مقیم ہوئے ان دنوں انفرادی شعور کی جگہ اجتماعی شعور پیدا ہو رہا تھا۔بھوپال اصطلاحاً ہی نہیں عملاً دارالاقبال بن گیا تھا اور نواب حمید اللہ خان اور علامہ اقبال کے قریبی تعلقات نے اسلامیان ہند میں واضح طور پر مسلمانوں کی تنظیم نو اور اسلامی نشاۃ ثانیہ کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔اس لئے ان کے والد بھی اس تحریک سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور اپنے حلقہ اثر میں پاکستان کے لئے کام کیا کرتے تھے وہ اکثر شہر میں ماسٹر جلیل صاحب'ڈاکٹر ہاشم صاحب اور ڈاکٹر کبرائل کے پاس بیٹھ جاتے اخبارات پڑھتے اور حالات حاضرہ پر تبادلہ خیالات کرتے۔وہ قائداعظم کی بے حد عزت کرتے۔ہمیشہ لوگوں کو گاندھی کی عیاریوں سے آگاہ کرتے اور کہا کرتے کہ گاندھی جھوٹا ہے اور مسلمانوں کو دھوکے میں رکھ کر تباہ کرنا چاہتا ہے۔

جبل پور کے مشہور ڈاکٹر محمد امیر خان اور ناگپور کے مولوی کفایت اللہ ان کے بہت عزیز دوست اور پاکستان کے دل وجان سے حامی تھے۔انہی باتوں نے ڈاکٹر خان کو پاکستان کا شیدائی بنا دیا تھا چنانچہ انہوں نے میٹرک کے فوراً بعد پاکستان آنے کا فیصلہ کر لیا۔

ڈاکٹر خان نے ہندوستان سے چلنے سے پہلے اپنے والدگرامی کی اس نصیحت کو ہمیشہ کے لئے اپنے ذہن میں بٹھا لیا کہ امت محمدی ﷺ کے ایک فرد کی حیثیت سے ہمیں اخلاق اسلامی سے بہرہ ور ہونا چاہئے اور سراپا رحمت و شفقت بننا چاہئے۔

والد کی یہ تلقین ڈاکٹر خان کے دل پر ایک دائمی نقش چھوڑ گئی۔ان کے والد 1956ء میں بھوپال میں انتقال کر گئے۔ان دنوں ڈاکٹر خان کراچی میں زیر تعلیم تھے۔انہوں نے یہ غم بڑی شدت سے محسوس کیا اور کئی ماہ تک غمزدہ و افسردہ رہے۔لیکن جب بھی انہیں اپنے والد کی یہ نصیحت یاد آتی تو علم کی گہرائیوں میں اتر کر اپنا غم بھول جاتے۔

”قدیر بیٹے! تجھے اس زبوں حال قوم کا سر اونچا کرنا ہے،تجھ پر تیرے اسلاف کا قرض ہے۔میرے فرزند! دیکھ لینا قیامت کے دن رسول عربی ﷺ کی بارگاہ میں جب حاضر ہوں تو میرا سر شرمندگی سے نہیں جھکنا چاہئے۔میرا نہیں اسلام کا مان رکھنا اور اپنے باپ کو سرخرو ہونے کا موقع دینا“۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے کردار کی پختگی میں ان کی والدہ محترمہ کا بڑا دخل تھا۔وہ عابدہ وزاہدہ خاتون تھیں اور ہمیشہ اپنے محلے کی تمام بچیوں کو قرآن مجید کی تعلیم دیتی رہیں۔وہ ختم قرآن کی تقریب پر نقد اور جوڑے انعام میں دیتیں۔غریب لڑکیوں کی مالی مدد بھی کیا کرتی تھیں۔ڈاکٹر عبدالقدیر کی ذات میں حسن اخلاق کی خوبی ان کی والدہ کا پیرہن بن کر ظاہر ہوئی ہے۔

ڈاکٹر خان کا گھرانہ علم وعمل کا قدردان تھا۔مالی لحاظ سے ان کی حیثیت درمیانے درجے کی تھی لیکن ان کی جاہ وحشمت بڑے بڑے گھرانوں سے بڑھ کر تھی۔ڈاکٹر عبدالقدیر خان جب اس دنیا میں تولد ہوئے تو غیرت وعظمت کا پیکر یہ گھرانہ آسودگی سے دوچار ہو گیا تھا۔ان کی پیدائش کو بزرگوں نے مستقبل کے ایک عظیم انسان کی پیدائش سے تعبیر کیا۔اس بات کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر خان کو اللہ تعالیٰ نے روز اول ہی سے کسی عظیم کارنامے کے لئے دنیا میں وارد کیا تھا۔

ان کی نانی اماں کلثوم بیگم کا شاہی محل میں آنا جانا تھا۔کیونکہ ان کی خالہ کی شادی شاہی خاندان میں ہوئی تھی۔بھوپال کے قریب ہی ایک راجواڑہ نرسنگڑھ تھا وہاں کی رانی بھی بھوپال کے شاہی محل میں آیا کرتی تھیں۔وہاں رانی اور کلثوم بیگم میں بہت اچھی دوستی ہو گئی۔رانی نرسنگڑھ اکثر کلثوم بیگم کو اپنے ہاں بلاتی تھیں۔اس طرح ڈاکٹر خان کی والدہ زلیخا بیگم کے بھی رانی سے مراسم ہو گئے اور وہ بھی کبھی کبھی نرسنگڑھ جانے لگیں۔

عبدالقدیر خان کی پیدائش کے تین چار ماہ بعد ان کی والدہ انہیں ساتھ لے کر نرسنگڑھ گئیں تو رانی نے زلیخا بیگم کے ہاتھوں سے نومولود کو اچک لیا اور اس کی بلائیں لے کر بولیں۔

”مجھے تو یہ بچہ بھگوان کا اوتار لگتا ہے اس کی آنکھیں دیکھو کس قدر روشن ہیں“۔

”اللہ کرے اس کے نصیب بھی روشن ہوں“ زلیخا بیگم نے کہا

”ہم اپنے جوتشی مہاراج کو بلوا کر اس کی جنم پتری بنواتے ہیں“۔رانی نے کہا

جوتشی مہاراج آیا اور نومولود کی جنم پتری بنانے میں مشغول ہو گیا لیکن کچھ ہی دیر بعد وہ حیرت سے نومولود کو دیکھنے لگا پھر اس نے اس کے ننھے منے سفید ہاتھ کھول کر اس کی ہتھیلیوں میں چھپی ریکھاؤں کو دیکھا اور ہاتھ جوڑ کر بولا:

”مہارانی جی! بھگوان کی سوگند یہ بچہ بڑے بخت والا ہے اس کی جنم پتری اور ریکھائیں بتاتی ہیں کہ اس کی پیدائش بڑی نیک فال ہے۔یہ بہت بڑے بڑے کام کرے گا اور اس کے تمام کام ہی اچھے ہوں گے۔تعلیم بہت زیادہ حاصل کرے گا خصوصاً دو علم حاصل کرے گا البتہ اس بچے کو کھانسی اور پیٹ میں درد کی شکایت رہے گی۔پھر صحت ٹھیک ہو جائے گی۔عمر کافی ہو گی پورے خاندان میں چراغ کی طرح روشن رہے گا۔والدین اور بہن بھائیوں کی خوشیوں اور عزت کا باعث بنے گا اپنے ملک وقوم کے لئے نہایت اہم کام انجام دے گا اور بہت عزت پائے گا اور ہاں“ جوتشی نے ٹھہر کر زلیخا بیگم کی طرف دیکھا اور بولا”بچے کی خوش بختی کے سبب بیگم صاحبہ کو بہت وافر دولت ملے گی“۔

”مہاراج! دولت کہاں سے ملے گی“ زلیخا بیگم نے حیرانی سے کہا”میرے خاوند تو پنشن پا چکے ہیں خاندان میں کوئی ایسا نہیں جو ورثے میں ہمارے لئے دولت چھوڑ جائے“۔

”میرا حساب تو یہی بتاتا ہے بیگم صاحبہ“ جوتشی جنم پتری پر دوبارہ نظر ڈال کر بولا”آپ کو اچانک دولت ہاتھ آئے گی“

جوتشی کا حساب کاتب تقدیر نے درست کر دکھایا اور نومولود عبدالقدیر خان کی آمد کے ساتھ ہی عبدالغفور خان کے گھر دھن برسنے لگا۔اس بات کے چند ہی روز بعد ڈاکٹر خان کے چچا خان محمد امیر خان دھرم جیگڑھ اسٹیٹ سے چھٹی پر بھوپال آئے ان کے ہاتھ میں ایک بکس تھا جو انہوں نے آتے ہی اپنی بھاوج کے ہاتھوں میں تھما دیا۔

”یہ کیا ہے بھائی؟“ زلیخا بیگم بکس دیکھ کر بولیں۔

”یہ آپ کی امانت ہے بھابھی“ خان محمد امیر خان ذرا شرمندہ سے ہو کر بولے”میں معذرت چاہتا ہوں کہ امانت پہنچانے میں تاخیر کر دی ورنہ والدہ مرحومہ کا حکم تھا کہ یہ بکس فوراً سے پیشتر آپ تک پہنچا دوں مگر سیف میں رہ جانے سے دماغ سے بالکل اتر گیا تھا۔اس میں کیا ہے۔یہ میں نہیں جانتا اب آپ خود کھول کر دیکھ لیں“۔

زلیخا بیگم نے بسم اللہ پڑھ کر بکس کھولا تو اندر کئی سیر چاندی اور سونا تھا زلیخا بیگم نے چاندی اور سونے کے بدلے رقم حاصل کر کے کچھ تو غریب لڑکیوں میں بانٹ دی اور باقی ماندہ رقم اپنے شوہر کے سپرد کر دی۔اس سے گھر میں آسودگی اور قرار آ گیا۔

قسط نمبر 9

بھوپال کا خمیر

گھر اور ریاست کے مذہبی ماحول نے عبدالقدیر خان کو مذہب کا دیوانہ بنا دیا وہ دنیاوی تعلیم کے ساتھ قرآن اور اخلاقیات کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔اس دور میں بھوپال برصغیر کا واحد شہر تھا جہاں سب سے زیادہ قرآن پاک کے حفاظ اور قراء تھے۔مساجد میں درس عام تھا اور اتباع سنت کی ترغیب دی جاتی تھی۔اس ماحول میں پرورش پانے والے مسلمان نوجوان اپنے اسلاف اور روایات کے پاسدار بن کر جوان ہو رہے تھے۔عبدالقدیر بچپن سے ہی نماز روزے کے پابند ہو گئے۔وہ گھر کے قریب واقع مسجد حرمت خان میں باقاعدگی سے صبح کی اذان دیتے۔ انہوں نے بھوپال میں قاضی شہر علامہ سید سلیمان ندوی کے پیچھے نمازیں ادا کی ہیں۔اللہ پاک نے یوں بھی انہیں طبع رسا سے نوازا تھا۔حصول علم کا شوق ان کی گھٹی میں تھا۔صبح کی نماز با جماعت ادا کرنے کے بعد وہ ساتھیوں کے ہمراہ ہاکی کھیلتے پھر ناشتہ کرتے اور سکول کی راہ لیتے۔

عبدالقدیر خان کے بچپن کے ساتھیوں میں روف رزاق اور ممتاز تھے وہ ان کے ساتھ ہاکی پتنگ بازی اور گلی ڈنڈا کھیلا کرتے تھے۔عبدالقدیر خان کو مچھلی کے شکار اور تیراکی کا بھی بڑا شوق تھا۔ان کے گھر کے قریب شفاف پانی کا گہرا تالاب تھا وہ روزانہ وہاں جا کر تیراکی کا مظاہرہ کرتے تھے۔بھوپال جھیلوں کی سرزمین بھی کہلاتا تھا۔ عبدالقدیر خان نے بچپن میں شاید ہی کوئی جھیل چھوڑی ہو جہاں وہ تیراکی کرنے نہ گئے ہوں۔

بچپن اور لڑکپن لاڈلے بچوں میں ضد اور حسد کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے مگر تقدیر جن بچوں کی آبیاری کرتی ہے وہ منفی رویوں کی بھینٹ نہیں چڑھتے عبدالقدیر خان میں بھی یہی خوبی تھی وہ شرارتیں کرتے تھے مگر کبھی کسی کو ناجائز تنگ نہ کرتے۔البتہ کبھی کبھار پتنگ لوٹتے ہوئے احمد علی خان ایڈیٹر ڈان کے بھائی اختر علی خان کے باغ میں پہنچ جاتے تو امرود آم یا گریپ فروٹ ضرور توڑتے۔اسی طرح جب دوستوں کے ساتھ سکول جا رہے ہوتے تو اپنے پسندیدہ پھلوں کی طلب میں ان کے باغ کی دیوار پھلانگ کر اندر کود جاتے اور مالی کو جل دینے میں کامیاب ہو جاتے۔

ڈاکٹر خان نے بچپن میں ہی رواداری اور فراخدلی کو اپنے مزاج کا خاصہ بنایا تھا۔ان کے والد نے انہیں چھوٹوں اور بڑوں سے ملنے کے سلیقے اور گفتگو کے انداز سکھا دیئے تھے۔والد کی تربیت کے اس انداز نے ڈاکٹر خان کے دل و دماغ پر گہرا اثر چھوڑا یہی وجہ ہے کہ مستقبل میں جب وہ دنیائے اسلام کے ایک عظیم ہیرو بن کر ابھرے تو اپنے فطری مزاج کے حصار میں قید رہے اور مغربی تعلیم ان کی فطرت بدلنے میں ناکام رہی۔

ڈاکٹر خان کو لڑکپن ہی سے مطالعے کا شوق رہا تھا انہوں نے مولانا شبلی کی الفاروق اس دور میں متعدد بار پڑھی اور ہر بار اس کو سراہتے۔انہیں اسلامی تاریخ سے شروع ہی سے لطف رہا ہے۔ان کے پسندیدہ مصنف مولانا عبدالحلیم شرر اور نسیم حجازی تھے۔

ایک بار ڈاکٹر خان کے ایک بھوپالی دوست ڈاکٹر خان کے لڑکپن کے واقعات سنا رہے تھے انہوں نے بتایا ڈاکٹر خان کمسنی ہی میں بلند خیالات رکھتے تھے۔اوج ثریا کو چھونا چاہتے تھے وہ زمانہ بڑا سستا تھا سونا بیس پچیس روپے فی تولہ تھا۔ پیسے کی بہت قیمت اور قدر تھی ہمارے ذہنوں کی پہنچ لاکھوں کروڑوں سے زیادہ نہ تھی ان دنوں عبدالقدیر خان جب کبھی مستقبل کی بات کرتے تو کہتے۔

"یارو سنو! اسے دیوانے کا خواب نہ سمجھنا میں بڑا ہو کر سائنس پڑھوں گا اور بہت بڑا انجینئر بن کر ایک ایسا منصوبہ بناؤں گا کہ دنیا یاد رکھے گی۔میرے منصوبے پر ایک کروڑ روپے خرچ ہوں گے اور اسے مکمل کرنے سے میرا نام بلند ہو گا میرے کام سے مسلمانوں کو بہت فائدہ پہنچے گا"۔

عبدالقدیر خان کے ارادوں میں کاتب تقدیر نے ایسی قدرت ڈال دی کہ وہ اپنی منزل کی طرف کھنچتے چلے گئے لیکن یہ ایک طویل اور کٹھن سفر کا آغاز تھا۔برصغیر میں تحریک آزادی میں یکایک تیزی آ گئی اور وہ ریاست جہاں مسلمانوں کا ایک بہت بڑا سپوت ابھی ابتدائی تعلیم کے مراحل طے کر رہا تھا اس میں نفرت اور تعصب کی فضا اس کے لئے گھٹن پیدا کرنے لگی۔اس کے والد گرامی نے ہندوؤں کے بارے میں جو کہا تھا وہ حرف بہ حرف درست ثابت ہونے لگا۔

بھوپال ایک علمی خطہ تھا جہاں پہلے مذہبی تعصب کی کوئی پرچھائیں نظر نہیں آتی تھی۔ہندو مسلم شیر و شکر کی طرح اکٹھے تھے۔بھوپال میں صدیوں پرانی ہندو مسلم یکجہتی کا سبب بھوپال کے مسلمان حکمران کا غیر متعصبانہ رویہ تھا۔ انہوں نے غیر مسلموں بالخصوص ہندوؤں کو مکمل تہذیبی اور مذہبی آزادی دے رکھی تھی۔نواب آف بھوپال حمید اللہ خان کے گاندھی، جواہر لعل نہرو، ڈاکٹر انصاری، ابوالکلام آزاد، سروجنی نائیڈو اور قائد اعظم کے ساتھ خوشگوار تعلقات تھے۔مسلمان حکمران ہونے کے باوجود ریاست بھوپال میں ہندو اکثریت میں تھے۔علامہ اقبال نے ہندوؤں کی اکثریت کے پیش نظر ہی نواب آف بھوپال سے از راہ تفنن کہا تھا۔

"جناب محترم آپکو تو اپنی ریاست کا مہاراجہ کشمیر سے تبادلہ کر لینا چاہیے"۔
اس کے بعد علامہ اقبال نے سنجیدگی کے ساتھ نواب کو مشورہ دیا کہ ریاست کے اندر ہندو مسلم آبادی میں توازن پیدا کرنے کے لئے ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے مسلمانوں کو یہاں لا کر آباد کرنا چاہیے۔ نواب حمید اللہ خان کو یہ تجویز بے حد پسند آئی لیکن شومئی قسمت سے جنگ عظیم سے چار پانچ سال پہلے کانگرس نے بھوپال میں محاذ آرائی شروع کر دی جس سے ریاست کا امن اور یکجہتی متاثر ہوئی اور والئی بھوپال اس منصوبے کو تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔

عشق وطن میں

ہندوؤں کو نواب حمید اللہ خان کے ارادوں کی بھنک پڑ گئی تو وہ تمام احسانات بھلا کر ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہندو لیڈر پہلے والئی بھوپال کا دم بھرتے تھے۔ اب انہوں نے اس بات کو اچھالنا شروع کر دیا کہ بھوپال میں ہندوؤں کی اکثریت ہے لہذا یہاں ہندو مہاراجہ حکمران ہونا چاہیے۔ دراصل ان ہندو لیڈروں کو یہ قلق تھا کہ نواب آف بھوپال کے قائداعظم کے ساتھ گہرے تعلقات ہیں اور ریاست میں مسلم لیگ کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ ہندوؤں کو تو بہانہ چاہیے تھا اور ان کی تنظیم پیپلز کانگرس نے مسلمانوں کے گھروں کو جلانا شروع کر دیا۔ بھوپال شہر میں اگرچہ مسلمانوں کی اکثریت تھی اور کلیدی عہدے بھی مسلمانوں کے پاس تھے مگر تجارت ہندوؤں کے پاس تھی۔ نچلی سطح پر انتظامیہ اور پولیس میں بھی مسلمانوں کی اکثریت تھی۔
15 اگست 1947ء کے فوراً بعد بھوپال میں ہندوؤں نے اپنی خباثتوں کا اظہار کھلم کھلا شروع کر دیا تھا۔ گوالیار، الور، جبل پور اور دوسرے علاقوں میں ہندوؤں نے قتل عام کا بازار گرم کر دیا تو ان علاقوں کے لٹے پٹے مسلمانوں نے بھوپال کو پناہ گاہ سمجھتے ہوئے ادھر کا رخ کر لیا اور اپنے ساتھ ظلم و ستم کی المناک داستانیں ساتھ لائے پھر ان علاقوں سے جو بھی ریل گاڑیاں بھوپال پہنچتیں وہ لاشوں سے اٹی ہوتیں۔ اس صورتحال میں بھوپال کے نوجوان ان بے کس مسلمانوں کی مدد کے لئے آگے بڑھے ان میں عبدالقدیر خان بھی تھے جن کی ابھی مسیں بھیگ رہی تھیں لیکن وہ مکمل جواں مردوں کی طرح ان ہجرت کرنے والوں کے دکھ بانٹ رہے تھے۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے ہجرت کے یہ اذیت ناک اور روح فرسا مناظر دیکھے تھے اور کئی تڑپتے ہوئے انسانوں کے منہ میں دوڑ دوڑ کر پانی ڈالتے رہے تھے۔
نواب آف بھوپال ایک امن پسند اور شریف طبع حکمران تھے ہرچند کہ وہ ریاست کے جغرافیائی محل وقوع اور معروضی حقائق کا ادراک رکھتے تھے مگر وہ بھوپال میں حالات کو سکون پر نہ لا سکے۔ بھارتی حکومت پیپلز کانگرس کے فرقہ پرست ہندوؤں کو برابر شہہ دیتی رہی اور وہ نمائندہ حکومت کے مطالبے کی آڑ میں نئے سے نئے ہنگامے کھڑے کرتے رہے نواب حمید اللہ خان ستمبر 1948ء میں حیدر آباد دکن پر نہرو حکومت کی فوجی چڑھائی اور اس مسلم ریاست کا انجام دیکھ چکے تھے لہذا اور کوئی چارہ کار نہ پا کر وہ دسمبر 1949ء میں ریاست سے دستبردار ہو گئے اور بھوپال کو مدھیہ پردیش میں ضم کر دیا گیا۔
نواب حمید اللہ خان منظر سے کیا ہٹے ہندوؤں کو کھل کھیلنے کا موقع مل گیا۔ متعصب اور متشدد ہندوؤں نے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کرنا شروع کر دیا۔ بزرگ مسلمانوں کی توہین روزمرہ کا معمول بن گئی۔ مساجد میں نماز ادا کرنے والوں پر گندگی پھینکی جانے لگی خواتین کی بے حرمتی ان کا وطیرہ بن گئی۔ ہندو پیسہ پھینک کر لڑائی مول لیتے اور پولیس نقص امن کے بہانے مسلمان نوجوانوں کو پکڑ کر لے جاتی اور حفاظتی اقدامات کے بہانے مسلمان گھرانوں کی دن میں کئی کئی بار تلاشی لی جاتی گھروں میں بطور آرائش لٹکی ہوئی تلواروں اور گنوں کو قبضے میں لے کر ناجائز اسلحہ رکھنے کے الزام میں شرفاء کو مقدمہ چلائے اور صفائی کا موقع دیئے بغیر چھ ماہ کے لئے جیل بھیج دیا جاتا۔ اگر کوئی مزاحمت کرتا تو اسے ہمیشہ کے لئے راہ سے ہٹا دیا جاتا۔ غرضیکہ بھوپال کے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا ان حالات میں نواب حمید اللہ خان نے ریاستی مسلمانوں کو پاکستان کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دے دی۔
اس پس منظر میں عبدالقدیر خان ایک حریت پسند مجاہد بن کر ابھرنا چاہتے تھے وہ مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی ہر زیادتی کا بدلہ لینے کے لئے پیچ و تاب کھانے لگے اور اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر کمزور مسلمانوں کی مدد کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ ان کی اس حریت پسندی کو ان کے بڑے بھائیوں اور والدہ نے یہ کہہ کر روک دیا:
"عبدالقدیر خان جو تم کرنا چاہ رہے ہو ایسے بہت سے مجاہد مسلمانوں کی صفوں میں موجود ہیں لیکن ہم جس چیز کی تم سے توقع رکھتے ہیں تم وہ کرو اور خاموشی کے ساتھ تعلیم حاصل کرو تعلیم مکمل کر کے اپنی قوم کے مظالم کا بدلہ چکانا۔ یہ قوم اب بہت کمزور ہو چکی ہے تم اسے مضبوط بنا دینا"۔

عبدالقدیر خان نے ایک بڑے مشن کی تکمیل کے لئے اپنی شوریدہ سری کو بمشکل قابو کیا لیکن ادھر حالات مسلسل بگڑتے چلے جارہے تھے وہ بوڑھے بچے اور چھوٹے بڑے طبقہ کے ہندو جو عبدالغفور خان کی آمد پر ان کی تعظیم کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے تھے اب گستاخیاں کرنے لگ گئے تھے۔ان حالات میں ڈاکٹر خان کے والد نے اپنے خاندان کو بھی پاکستان کی طرف ہجرت کا حکم دیا۔

1947ء میں ڈاکٹر خان کے دو بڑے بھائی پاکستان آگئے تھے اور کراچی میں مقیم ہوگئے۔جبکہ تیسرے بھائی اور ایک بہن بہنوئی 1950ء میں پاکستان چلے آئے تھے۔ڈاکٹر خان نے 1952ء میں میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس کرلیا تو بڑے بھائیوں نے انہیں بھی کراچی بلالیا ڈاکٹر خان اپنے والد اور والدہ کو بھوپال میں تنہا چھوڑ کر جانے کے حق میں نہیں تھے مگر والدین کی سخت سرزنش پر وہ مجبوراً تن تنہا اپنے خوابوں کی سرزمین پاکستان کی طرف چل پڑے۔وہ اس وقت سولہ سال کے تھے جب انہوں نے ہجرت کے اذیت ناک مصائب جھیلے۔ایک بار انہوں نے اپنی اس ہجرت کی یادیں کچھ یوں تازہ کیں:

میں پاکستان اس وقت آیا جب نوعمر لڑکا تھا۔اجمیر سے موناباؤ تک ہندو پولیس والوں نے جو توہین آمیز سلوک کیا تھا وہ کبھی فراموش نہیں کرسکوں گا۔درحقیقت یہ بات اس وقت میری سمجھ میں آئی کہ قائداعظم نے پاکستان کیوں قائم کیا تھا۔

بھوپال میں مسلمانوں کا کوئی مستقبل نہیں رہ گیا تھا۔بھائیوں نے کراچی آنے کے لئے لکھا تو والد مرحوم نے بھوپال کے حالات کا اندازہ کرتے ہوئے اجازت دیدی۔میں نے عزم سفر باندھا ایک بکس میں اپنی چند کتابیں اور چند کپڑے رکھے اور بھوپال سے براستہ اجمیر' لونی' چتوڑ' باڑمیر موناباؤ بذریعہ ریل گاڑی موناباؤ کے لئے روانہ ہوگیا۔میں اس سفر میں اس لحاظ سے تنہا تھا کہ میرا کوئی اور شناسا یا عزیز ساتھ نہ تھا لیکن اس سفر میں بھوپال کے کتنے ہی مسلم گھرانے میرے ہم سفر تھے۔اس سفر میں ہندو پولیس اور ریلوے ملازمین نے لٹے پٹے مسلم مسافروں کے ساتھ جو زیادتیاں اور ناقابل بیان ذلت آمیز سلوک روا رکھا اسے میں کبھی نہیں بھلا سکتا۔ظالموں نے مسلمان مردوں' عورتوں اور بچوں سے سب کچھ چھین لیا حتیٰ کہ عورتوں کے کانوں سے بالیاں تک نوچ لیں ٹکٹ چیکر ان مسافروں سے چیکنگ کے بہانے ٹکٹ لیتے اور جب تک انہیں کچھ نذرانہ پیش نہ کیا جاتا واپس نہ کرتے۔وہ اس حد تک گر گئے تھے کہ انہوں نے مجھ سے میرا قلم تک چھین لیا۔میں خاموشی سے یہ سب مظالم اپنے دل پر سہتا رہا۔میری آنکھوں کے آنسو مسلمانوں کی یہ حالت دیکھ کر رو رو کر خشک ہوگئے۔

ریلوے کا یہ سفر موناباؤ پر ختم ہوا یہاں سے آگے سات آٹھ کلومیٹر کا سفر ریگستان کا تھا تاحد نظر ریت ہی ریت تھی کوئی درخت سایہ دار نہ تھا میں نے تپتی ریت پر ننگے پاؤں سفر کیا کیونکہ جوتے ریت میں دھنس جاتے تھے اس لئے وہ اتار کر ہاتھ میں لے لئے تھے سر پر کتابوں کا صندوق' تپتی جھلستی ریت پر چلتے چلتے میرے پاؤں میں چھالے ابھر آئے تھے موناباؤ یا کہیں اور رک بھی نہ سکتے کہ دن دن میں ہمیں پاکستان کی سرحد پر پہنچنا تھا۔

نومین لینڈ کو عبور کرکے جب میں پاکستان میں داخل ہوا تو یوں محسوس ہوا جیسے کسی قیدی پرندے کو پنجرے سے آزاد کردیا گیا ہو۔قلب و روح میں مسرت کی لہر دوڑ گئی اور سب نے پاکستان زندہ باد کے نعرے بلند کئے۔کھوکھراپار کی سرحدی چوکی پر لہلہاتے ہوئے سبز ہلالی پرچم نے نئی زندگی کا پیغام دیا۔وہیں میں ایک تندور پر روٹی کھانے بیٹھ گیا یہ گوشت کا سالن اور تندوری روٹی تھی۔میں نے خوب سیر ہوکر کھائی۔میں نے چوکی سے رخصت ہوتے وقت سبز ہلالی پرچم کو سیلوٹ کیا اور سچے جذبے کے ساتھ قسم کھائی کہ اے میرے پاک وطن! مجھے تیرے شہیدوں کی قسم میں اپنی ساری زندگی تیرے نام کرتا ہوں۔پھر میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے میرے مولا میرے ارادوں کو استقامت دے میں اپنے ملک اور بے بس قوم کے لئے کوئی بڑا کام کرسکوں"۔

ڈاکٹر خان قیام پاکستان کے ٹھیک پانچ سال بعد 5 اگست 1952ء کو کھوکھراپار کے راستے سے پاکستان میں داخل ہوئے اور وہاں سے بذریعہ ریل کراچی اپنے بھائیوں سے آملے۔

عبدالقدیر خان نے کراچی کے محلہ شیرہ شاہ میں سکونت اختیار کرلی۔یہاں پہلے ہی سے ان کے بڑے بھائی مقیم تھے۔عبدالقدیر خان کو پاکستان میں آئے ہوئے چند ہی روز گزرے تھے کہ ان کی بڑی بہن ثریا بیگم بیمار پڑ گئیں۔یہ خبر بھوپال پہنچی تو ان کی والدہ زلیخا بیگم اور چھوٹی بہن رضیہ بیگم بھی چند ہفتوں بعد پرمٹ بنا کر پاکستان آ پہنچیں۔بہن کے تندرست ہوتے ہی انہوں نے والدہ کو واپس جانے سے منع کردیا۔ان کے دوسرے بھائی بہن بھی والدہ کو واپس بھیجنے کے حق میں نہیں تھے مگر زلیخا بیگم اپنے شوہر اور بیٹے عبدالحفیظ کو بھوپال میں تنہا نہیں چھوڑ سکتی تھیں۔جب اولاد کا اصرار حد سے بڑھتا تو وہ کہتیں۔

"میں تم لوگوں کو کیسے سمجھاؤں کہ میرا بھوپال جانا بہت ضروری ہے۔تم جوان اور کماؤ ہوگئے ہو مگر میں تمہارے والد کو وہاں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔ان کی طبیعت بھی خراب رہتی ہے۔اگرچہ عبدالحفیظ وہاں موجود ہے مگر میرا وہاں رہنا بہت ضروری ہے۔"

"میں ابا حضور کو تار دے کر بلا لیتا ہوں" ڈاکٹر خان کے بڑے بھائی عبدالروف نے والدہ کو روکنے کی جستجو کی۔

"امی جان! مجھے بھی تو آپ کی اشد ضرورت ہے۔میں جانتا ہوں کہ آپ کے فرائض بے انتہا ہیں مگر آپ کے وہاں چلے جانے سے ہم لوگ ہر وقت پریشان رہا کریں گے"۔ڈاکٹر خان نے لجاجت بھرے لہجے میں والدہ کو قائل کرنا چاہا تو وہ رضامند ہوگئیں۔

ادھر بھوپال کے حالات انتہائی دگرگوں تھے۔ڈاکٹر خان کے والد اور بھائی عبدالحفیظ ہندوؤں کی شرانگیزیوں کا نشانہ بنتے رہتے تھے۔1956ء میں ان کے والد بھوپال ہی میں انتقال کرگئے اور چند سال بعد عبدالحفیظ بھی اپنے اہل و عیال کے ساتھ کراچی آگئے۔

ڈاکٹر خان اپنے والد سے کیا ہوا وعدہ ایفا کرنا چاہتے تھے۔ان کی والدہ اور بڑے بھائیوں کی بھی یہی خواہش تھی کہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔اس مقصد کی تکمیل کے لئے انہیں ڈی جے سائنس کالج کراچی میں داخل کرادیا گیا۔

عبدالقدیر خان نے ایف ایس سی میں نان میڈیکل کا چناؤ کیا کیونکہ انہیں انجینئرنگ اور فزکس کے مضمون سے انتہا درجے کی محبت تھی۔یہ وہی دور تھا جب انہوں نے فزکس میں کمال حاصل کرنے کا عہد کیا۔وہ کالج میں صرف تعلیمی سرگرمیوں میں دلچسپی لیتے اور اپنا تمام وقت اساتذہ کی خدمت اور فزکس کے مشکل فارمولے سمجھنے میں لگا دیتے۔وہ غیر سنجیدہ سرگرمیوں سے اجتناب برتتے۔انہیں طلبہ سیاست سے کوئی رغبت نہیں تھی۔اگر کوئی انہیں غیر تعلیمی اور سیاسی سرگرمیوں میں ملوث کرنا چاہتا تو وہ بڑے مدلل طریقے سے اپنا پہلو بچا کر کہتے۔

"دوستو! اب ہمیں سیاست کی نہیں فنی تعلیم کی ضرورت ہے۔قائداعظم نے جب فرمایا کہ طلبہ سیاست میں بھی حصہ لیں تو ایک مقصد کی خاطر ہم نے سیاست میں حصہ لیا مگر جب انہوں نے سیاست ترک کرنے کا فرمایا اور کہا کہ طلبہ اب صرف تعلیم پر توجہ دیں تو ہمیں اب علم کے حصول کی جنگ لڑنی چاہیے۔"

عبدالقدیر خان نے کالج میں اپنے دوستوں کا ایک گروہ پیدا کرلیا تھا جو علمی مباحث میں ان کا ساتھ دیتے۔خصوصاً فزکس کے معاملے میں بحث کو وہ زیادہ پسند کرتے۔فزکس کا کوئی مسئلہ زیر بحث ہوتو وہ نصابی کتب کا حوالہ ضرور دیتے ہیں۔وہ فزکس کے علاوہ سائنسی دنیا کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے میں لگے رہتے۔

ڈاکٹر خان کو زمانہ طالب علمی کے دوران ہی اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر جانے کا شوق لاحق ہوگیا مگر کمزور معاشی گھریلو حالات کی وجہ سے وہ اپنے خواب کی تعبیر نہیں پا سکتے تھے۔تاہم زاد راہ کے لئے انہوں نے یورپی ممالک کے بارے میں معلومات اکٹھی کرنا شروع کردیں اور جرمن زبان سیکھنے لگ پڑے۔

ہندوستان میں بھوپال کو دینی اور دنیاوی علوم کا مرکز تصور کیا جاتا تھا۔یہ اسی ماحول کی پرورش کا نتیجہ تھا کہ اس دور کی نسل نے دنیا و آخرت کا سامان خوب پیدا کیا۔ڈاکٹر خان بھی اسی ماحول کے پروردہ تھے۔ان کا بچپن اور لڑکپن بھوپال میں ہی گزرا۔قلب و نظر میں اسلامی شعائر رچ بس گئے تھے۔وہ راسخ العقیدہ اور سادہ مزاج مسلمانوں کی طرح پرورش پانے لگے۔وہ اکثر پاجامہ کرتہ زیب تن کرتے اور ہمیشہ صاف ستھرا رہنا پسند کرتے۔وہ مذہب پر تنقید برداشت نہیں کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ وہ آج بھی اپنے عقائد پر پوری طرح قائم ہیں۔ان دنوں بھی وہ نماز بالخصوص جمعہ کی ادائیگی کا پورا اہتمام کرتے تھے اور آج بھی ان کا معمول یہی ہے۔ڈاکٹر خان اپنے عقائد میں قطعی لچک پیدا نہ کرتے اور کہا کرتے تھے "بھوپال میں کوئی پیغمبری کا دعویٰ نہیں کرسکتا تھا۔اگر کرتا تو ہم ایک دن میں اسے قتل کردیتے"۔ڈاکٹر خان کو فخر ہے کہ بھوپال نے کوئی غدار یا جھوٹا پیغمبر یا اس کا پیروکار پیدا نہیں کیا۔

ڈاکٹر خان اکثر اپنے ہم مکتب دوست بدرالاسلام سے کہتے "اسلام سیدھا اور سچا مذہب ہے۔اس پر بحث و تمحیص کی کوئی گنجائش نہیں۔"انہوں نے ہندوؤں کے بارے میں ہمیشہ ایک ہی رائے رکھی۔وہ اپنے دوستوں سے برملا کہتے "ہندو انتہائی ناقابل اعتبار ہیں۔یہ قوم بہت عیار اور بدمعاش ہے۔یہ پاکستان کو ختم کرنے کے خواب دیکھتے اور اکھنڈ بھارت کے قیام کی فکر میں رہتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے مجھے ہمت اور توفیق دی تو انشاءاللہ میں اس بدمزاج اور بدنیت قوم کو سبق سکھا کر رہوں گا۔"

عبدالقدیر خان نصابی کتب کے علاوہ نسیم حجازی کے ناول بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔وہ انہیں ہندوستان میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا باعث سمجھتے تھے اور اپنے دوستوں کو نسیم حجازی کے ناول پڑھنے کی تلقین کرتے۔ڈاکٹر خان کو شعر و شاعری سے بھی شغف تھا۔انہوں نے منتخب شعروں کی ایک نوٹ بک بنا رکھی تھی۔جو شعر پسند آتا اسے فوراً اس میں نقل کرلیتے۔یہ شغف صرف اچھے شعر پڑھنے یا سننے کی حد تک تھا۔خود انہوں نے کبھی شاعری نہیں کی البتہ نثر لکھا کرتے تھے۔انہیں سینما بینی اور ہوٹلنگ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن کبھی کبھار مچھلی کے شکار کے لئے نکل جاتے ورنہ کالج کے بعد اکثر گھر ہی میں رہنا پسند کرتے۔چھٹی کے روز وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ایک جگہ اکٹھے ہوکر گپ شپ کیا کرتے تھے۔

کالج کے دور میں ڈاکٹر خان پانچ کے ٹولے میں شامل تھے۔وہ جب تک کالج میں رہے ان کے ساتھ بدرالاسلام' مہدی حسن' عبدالرشید اور اکبر احمد ہوا کرتے۔وہ اپنے دوستوں کا بے حد احترام کرتے اور ان کی مدد کرنے میں عار نہ سمجھتے۔عبدالقدیر خان نہایت خوددار تھے۔وہ دوسروں کا حتیٰ کہ بڑے بھائیوں کا بھی احسان لینا گوارہ نہ کرتے جبکہ خود اوروں کے غم اور دکھ میں شریک ہوتے اور ضرورت مندوں کی مدد کرتے۔مگر اس میں خاموشی اختیار کرتے اور جس کی مدد کرتے اسے بھی منع کردیتے کہ وہ اس کا چرچا نہ کرے۔ایک بار ڈاکٹر خان نے اپنے ایک غریب دوست کے کپڑے پھٹے ہوئے دیکھے تو دوسرے دن کپڑوں کا ایک بنڈل لاکر اسے تھما دیا اور کہا "کسی سے ذکر مت کرنا' میری طرف سے تحفہ ہے"۔

ڈاکٹر خان نے ہمیشہ اپنے اساتذہ کا احترام کیا۔کالج کے دور میں ان کے اساتذہ پروفیسر زبیری' پروفیسر غوری' ڈاکٹر ایم اے قاضی' پروفیسر محبوب علی خان' پروفیسر انصاری' پروفیسر نقوی' پروفیسر سدھوا' پروفیسر ڈی سوزا' پروفیسر شیخ اور پروفیسر ترمذی نے توجہ' محنت اور خلوص کے ساتھ جو تعلیم دی ڈاکٹر خان اس کے لئے آج بھی احسان مند ہیں اور گفتگو کے دوران اپنے اساتذہ کا نام نہایت احترام کے ساتھ لیتے ہیں۔

1957ء میں بی ایس سی کرنے کے بعد عبدالقدیر خان اپنے گھر والوں کے ساتھ محلہ رام سوامی سے نظام آباد چلے گئے۔شیر شاہ سے وہ یہاں منتقل ہوگئے تھے۔ان دنوں ان کے گھر کے مالی حالات دگرگوں تھے۔چنانچہ انہوں نے خود انحصاری کے ساتھ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا منصوبہ بنایا اور ملازمت کرنے کا فیصلہ کرلیا۔بھائیوں کو جب معلوم ہوا تو وہ سخت ناراض ہوئے اور عبدالقدیر خان سے کہا:

"ہم سوکھی روٹی کھا کر بھی تمہیں اعلیٰ تعلیم دلوائیں گے۔ملازمت کا خیال دل سے نکال دو۔"

عبدالقدیر خان اپنے بھائیوں کے سامنے سر جھکا کر بات کرتے تھے مگر وہ بھائیوں کو مشکلات میں ڈال کر اپنی امنگوں کی تکمیل نہیں چاہتے تھے۔وہ بولے

"بھائی جان! میں آپ کے جذبات سمجھتا ہوں مگر آپ قطعی فکر نہ کریں۔میں ملازمت صرف اعلیٰ تعلیم کے لئے ہی کرنا چاہتا ہوں۔میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ تعلیم بھی ساتھ ساتھ جاری رکھوں گا اور اپنے وسائل بھی خود تلاش کروں گا۔میں سمجھتا ہوں کہ اب مجھے اپنے قدموں پر خود کھڑا ہو جانا چاہیے"۔

ڈاکٹر خان نے اپنی والدہ کی طرف سے حتمی اجازت ملنے کے بعد ملازمت کرنے کا فیصلہ کرلیا۔انہی دنوں محکمہ اوزان و پیمانہ جات میں انسپکٹروں کی بھرتی کے لئے مقابلے کے امتحان کا اعلان ہوا۔عبدالقدیر خان سمیت 125 امیدواروں نے امتحان دیا لیکن صرف دو امیدوار ہی کامیاب ہوئے۔ان میں سے ایک عبدالقدیر خان تھے۔یوں وہ انسپکٹر اوزان و پیمانہ جات مقرر ہوگئے مگر وہ تین سال سے زیادہ اس محکمے میں نہ چل سکے۔ان کی فطرت کو یہ بات پسند نہ تھی کہ وہ اپنی زندگی کے اعلیٰ مقاصد یونہی اس محکمے میں گزار دیں۔ان تین برسوں کے دوران کوئی بھی دن ایسا نہ تھا جب انہوں نے اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خاطر بیرون ملک جانے کے لئے تگ و دو نہ کی ہو۔وہ جرمنی کی یونیورسٹیوں کو اپنے کوائف ارسال کرتے رہے۔اس دوران خوش قسمتی سے ان کی امید بر آئی اور جرمنی کی بین الاقوامی شہرت یافتہ ٹیکنیکل یونیورسٹی ڈیلفٹ نے انہیں قبول کرلیا۔ڈاکٹر خان دوران تعلیم ہی جرمن زبان سیکھ چکے تھے لہذا یونیورسٹی نے انہیں اعلیٰ تعلیم کی خاطر بہت ساری مراعات دینے کا بھی اعلان کیا۔ڈاکٹر خان نے اس خوشخبری کے بعد نوکری سے استعفیٰ دے دیا۔جس روز وہ اس نوکری سے الگ ہوئے وہ نہایت خوش اور مطمئن تھے۔ڈاکٹر خان نے راقم کو اس حوالے سے بتایا کہ انہوں نے انگلستان جانا پسند نہیں کیا کیونکہ انہیں انگریز پسند نہ تھے۔مسلمانوں کے خلاف ان کی سازشوں سے وہ واقف تھے۔

قسط نمبر 10

نئی دنیا کا مسافر

تقدیر ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے ہاتھوں کی لکیروں میں اتر آئی ۔ گویا دعائیں قبول ہوگئی تھیں کہ وہ اپنے ملک اور اسلام کی خدمت بجا لائیں ۔ جس روز عبدالقدیر خان کو جرمنی روانہ ہونا تھا اس سے ایک دن پہلے وہ اپنے ایک پرانے دوست خلیل الرحمان سے ملنے گئے ۔ اتفاق سے وہاں ان کے دوست کے ایک دست شناس دوست ڈاکٹر گل بھی موجود تھے ۔ باتوں ہی باتوں میں ڈاکٹر گل نے عبدالقدیر خان کا ہاتھ پکڑ لیا اور ان کے ہاتھوں کی لکیریں پڑھنے لگے ۔ چند ثانیے بعد ڈاکٹر گل اپنا سر کھجانے لگے اور بولے "بھئی قدیر خان! آپ ابھی تک یہاں ہیں ۔ آپ کو تو اب تک بیرون ملک ہونا چاہیے ۔ آپ باہر جانے کے لئے تاخیر کیوں کر رہے ہیں؟"

نوجوان عبدالقدیر خان ڈاکٹر گل کے علم سے متاثر ہوئے اور کہا "یہ تقدیر کا فیصلہ ہے کہ میں ایک دو ہفتے دیر سے جاؤں ۔ ورنہ میرے کاغذات تو کب سے تیار ہیں مگر میرا استعفیٰ منظور ہونے میں ایک ہفتہ کی تاخیر ہوگئی ہے"۔

عبدالقدیر خان کو اب ہاتھ دکھانے کا تجسس ہو گیا تھا لہٰذا انہوں نے ڈاکٹر گل سے پوچھا "اور کیا لکھا ہے میرے ہاتھوں میں؟" ڈاکٹر گل نے عبدالقدیر کے ہاتھ کا تفصیل کے ساتھ مطالعہ کیا اور پھر بولے ۔

"قدیر خان صاحب! سچ تو یہ ہے کہ آپ بہت جلد ولایت چلے جائیں گے ۔ وقت بڑا کٹھن اور محنت طلب گزرے گا ۔ مگر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی آرزو پوری ہو جائے گی ۔ آپ شادی ایک غیر ملکی سے کریں گے ۔ یہ خاتون زندگی کی بہترین رفیق اور مددگار ثابت ہوگی اور آپ کے بہن بھائیوں اور والدہ کے لئے خوشی کا باعث بنے گی ۔ تعلیم کے بعد کچھ عرصہ آپ فنی کام کریں گے پھر واپس وطن آئیں گے اور یہاں ایسا کارنامہ انجام دیں گے کہ پاکستان کا نام دنیا میں روشن ہوگا ۔ آپ اپنے اہل خانہ اور احباب کے لئے سرمایہ فخر ثابت ہوں گے ۔ ملک میں بے حد عزت ملے گی ۔ لوگوں کے دل آپ کا نام سن کر محبت کے جذبات سے بھر جائیں گے"۔

شریک سفر مل گیا

عبدالقدیر خان نے اس وقت ڈاکٹر گل کی باتوں کو اہمیت نہ دی کیونکہ انہیں یہ ساری باتیں ناممکن نظر آ رہی تھیں ۔ لیکن ہاتھوں میں چھپی ہوئی تقدیر جب عیاں ہوئی تو عبدالقدیر خان کو وہ سب کچھ مل گیا جس کا عندیہ ڈاکٹر گل نے دیا تھا ۔

دو سال برلن کی ٹیکنیکل یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر کے ڈاکٹر خان نے پروفیسر کے اصرار پر ڈیلفٹ (ہالینڈ) کی عالمی شہرت یافتہ ٹیکنیکل یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا ۔ یہ ستمبر 1963 کی بات ہے ۔

عبدالقدیر خان نے جون 1967ء میں ٹیکنیکل یونیورسٹی ڈیلفٹ سے فزیکل میٹالرجی میں ماسٹر آف سائنس کی ڈگری حاصل کی ۔ اس دوران انہوں نے ڈچ خاتون ہنی خان سے شادی کر لی ۔ بیگم ہنی خان کی پیدائش کے بعد ان کے والدین نے جنگ عظیم کی تباہ کاریوں سے بچنے کے لئے یورپ سے جنوبی افریقہ کی راہ لی اور وہاں کی فوج میں خدمات انجام دیں ۔ بعد میں وہ شمالی رہوڈیشیا (زیمبیا) کی طرف چلے گئے ۔ بیگم ہنی خان والدین کے ساتھ سولہ سال کی عمر تک زیمبیا میں رہیں ۔ وہاں انہوں نے او لیول تک تعلیم حاصل کی ۔ اس کے بعد ان کے والدین ہالینڈ لوٹ آئے بیگم ہنی خان نے ہالینڈ میں دفتری اور انتظامی امور سے متعلق ایک کورس میں داخلہ لے لیا اور اس کے بعد لندن یونیورسٹی سے سائیکالوجی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی ۔ بیگم ہنی خان نے تعلیم مکمل کرنے کے بعد کئی ممالک میں ملازمتیں بھی کیں مگر شادی کے بعد جونہی وہ ماں بنیں تو ملازمت ترک کر کے ایک گھریلو عورت کی طرح اپنی ذمہ داریاں سنبھالنے لگیں ۔

تقدیر نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو یورپ میں خوب صیقل کیا اور انہیں ایک پر اعتماد جیون ساتھی کا شریک حیات ٹھہرایا ۔ شادی سے پہلے ڈاکٹر خان اور بیگم ہنی خان کی ملاقات دسمبر 1961ء میں ہیگ (ہالینڈ) میں ہوئی جہاں ڈاکٹر خان اپنے گھر (پاکستان) والوں کو خط پوسٹ کرنے نکلے تو انہیں ڈاک خرچ معلوم نہیں ہو رہا تھا ۔ اتفاقاً ان کی ملاقات بیگم ہنی خان سے ہوگئی جنہوں نے ڈاکٹر خان کو اپنے گھر خط ارسال کرنے میں مدد فراہم کی اور یہی ایک اتفاقیہ ملاقات جیون بھر کے ساتھ میں بدل گئی ۔

اس ابتدائی ملاقات کے بعد دونوں نے ایک دوسرے کو خط لکھنے کا وعدہ کیا ۔ ڈاکٹر خان چھٹیاں گزار کر ٹیکنیکل یونیورسٹی برلن لوٹنے والے تھے جب ہنی ان کی دعوت پر ان سے ملنے ڈوسلڈورف گئیں ۔ یہ ملاقات نہایت خوشگوار رہی ۔ بعد میں دونوں نے ایک دوسرے کو خطوط لکھے اور اس بات کا اظہار کیا کہ کوئی سنجیدہ فیصلہ کرنے سے پہلے انہیں ایک دوسرے کو مکمل طور پر سمجھ لینا چاہیے ۔ لہٰذا ہنی خان نے برلن میں ملازمت تلاش کرنے کا فیصلہ کر لیا اور وہاں ایک سال تک کام کیا مگر چند ہی روز بعد دونوں نے اتفاق کیا کہ وہ ایک دوسرے کو بے حد پسند کرتے

ہیں۔ ہینی خان نے اسلام قبول کرلیا اور پھر شادی کر لی۔ اس وقت ہینی خان کی عمر 21 سال اور ڈاکٹر خان 27 سال کے تھے۔ ستمبر 63ء میں دونوں نے ہالینڈ چلے جانے کا فیصلہ کرلیا۔ ہالینڈ جانے کے بعد ڈاکٹر خان نے اپنی تعلیم جاری رکھی۔ انہوں نے ایک ریکارڈ وقت میں اپنی تعلیم مکمل کر لی۔

اور وطن نے قبول کرنے سے انکار کر دیا

ڈاکٹر عبدالقدیر خان 1967ء میں چھ سال بعد وطن واپس چلے آئے اور یہاں سٹیل ملز میں ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کی مگر سٹیل ملز نے ڈاکٹر خان کی خدمات حاصل کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ اپنی صلاحیتیں وطن کے سپرد کرنا چاہتے تھے مگر وطن نے انہیں قبول نہیں کیا اور وہ مایوس ہو کر واپس ہالینڈ چلے گئے وہاں اپنی مادر علمی میں اپنے بین الاقوامی شہرت یافتہ استاد ڈاکٹر برگرز کے ریسرچ اسسٹنٹ ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی انہیں بیلجیم کی لیوون یونیورسٹی میں طبعی فلزات میں ڈاکٹریٹ کے لئے فیلوشپ مل گئی۔

عبدالقدیر خان کی اپنے وطن سے محبت کا یہ عالم تھا کہ وہ انتہائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے ملک کی خدمت کرنا چاہتے تھے۔ جس کے لئے وہ بار بار پاکستان آنے کی کوشش کرتے۔ وہ اپنے ملک میں ایک عام سی تنخواہ پر کام کرنے کے لئے بھی تیار تھے مگر ان دنوں بھی ہمارے ہاں ٹیکنیکل شعبوں میں جہلا اور ملک کے بدخواہوں کا راج تھا جو عبدالقدیر خان جیسے ہیرے کی پرکھ نہیں کر پا رہے تھے۔ ڈاکٹریٹ کے دوران بھی انہوں نے پاکستان آنے کی کوشش کی اور کئی اداروں کو اپنے کوائف بھجوائے مگر انہیں مایوسی ہوئی۔

غیروں نے جھولیاں پھیلا دیں

عبدالقدیر کی اپنوں نے بے قدری کی تھی مگر غیروں نے ان کے آگے اپنی جھولیاں پھیلا دی تھیں۔ ایمسٹرڈیم ہالینڈ کی مشہور فرم ایف ڈی او نے ان کی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور انہیں اپنے حساس ترین منصوبوں میں شریک کیا۔ ایف ڈی او ہالینڈ کی مشہور فرم وی ایم ایف (VMF) میں بنیادی حیثیت کی حامل تھی اور اس کا تحقیقاتی وترقیاتی ادارہ تھی۔ انجینئرنگ کی یہ خصوصی مشاورتی فرم بڑے بڑے پراجیکٹ پر کام کر رہی تھی اور اس کے سائنسدان ریلوے انجنوں، بحری انجنوں، شمسی توانائی کے پلانٹوں، پون چکیوں اور الٹراسنٹری فیوجز میں مہارت کی حامل تھی۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی فرم گردانی جاتی تھی۔ اس میں 90 ہزار سے زیادہ افراد کام کرتے تھے۔

ان دنوں ایف ڈی او یورپ کے ایک عظیم جوہری منصوبے کے ذیلی ٹھیکیدار کی حیثیت سے کام کر رہی تھی۔ یورینکو برطانیہ، مغربی جرمنی اور ہالینڈ کا مشترکہ منصوبہ تھا۔ اس منصوبے کے تحت یورینیم کی افزودگی عمل میں لائی جارہی تھی جس کے لئے ہزاروں سائنسدان بیس سال سے کام کر رہے تھے۔ اس طویل المدت منصوبے پر دو کھرب ڈالر صرف کر دیئے تھے۔ الٹراسنٹری فیوج کا یہ خفیہ منصوبہ المیلو کے مقام پر زیر عمل تھا۔ بیس برس کی شب و روز محنت کے باوجود ایف ڈی او کو ناکامی کا سامنا تھا۔ خصوصاً دھاتوں کے استعمال میں اسے بہت دشواری تھی۔ ایف ڈی او کو جب معلوم ہوا کہ ایک پاکستانی سائنسدان جسے اس کے ملک نے قبول نہیں کیا، اس کام میں غیر معمولی مہارت رکھتا ہے تو انہیں اپنے پاس بلا لیا۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان الٹراسنٹری فیوج کی تکنیک میں دھاتوں کے استعمال میں خصوصی ادراک رکھتے تھے۔ انہوں نے اپریل 1972ء میں ایف ڈی او کی تین ہزار کے پرکشش مشاہرے کی ملازمت قبول کر لی اور وہ اپنی دونوں بچیوں کے ساتھ ایمسٹرڈیم میں منتقل ہو گئے۔ وہاں انہیں مکان اور کار بھی دی گئی اور ہر سال دسمبر میں ایک اضافی تنخواہ بھی ملتی تھی۔ اس فرم کی جانب سے یورپ کے دوسرے ممالک جاتے تھے اور امریکہ میں بھی ہالینڈ کی نمائندگی کی۔

ڈاکٹر خان

یورپ میں انہیں ڈاکٹر خان کے نام سے جانا جاتا تھا۔ ایف ڈی او میں تعیناتی کے ساتھ ہی ڈاکٹر خان کی قدر و قیمت بڑھ گئی اور کئی حساس اداروں نے انہیں اپنے پاس بلانے کی تگ و دو کی مگر انہوں نے ایف ڈی او ہی کو ترجیح دی اور مکمل دیانتداری سے اپنے ذمے فرائض ادا کئے لہٰذا انہیں یورینکو کے حساس ترین منصوبے میں شامل کر لیا گیا۔ اس سے قبل ہالینڈ کی تمام ایجنسیوں نے ان کے بارے میں پوری چھان بین کی اور ان کے پرانے رفقائے کار، سسرال اور پروفیسروں وغیرہ سے بھی پوچھ گچھ کی۔ لیکن انہیں ڈاکٹر خان کی ذات کامل اور بے داغ دکھائی دی تھی لہٰذا انہیں یورپ کے حساس ترین منصوبے میں کام کرنے کی اجازت ملنے میں کوئی چیز مانع نہ تھی۔

ڈاکٹر خان جرمن اور ڈچ زبان روانی سے بول سکتے تھے۔ جبکہ فرانسیسی زبان میں بھی انہیں خاصی دسترس حاصل تھی۔ المیلو کے پراجیکٹ میں حساس دشواریوں کو نپٹانے کی ذمہ داری ڈاکٹر خان پر ڈال دی گئی اور انہیں اکثر خفیہ دستاویزات کو جرمن سے ڈچ یا انگریزی اور ڈچ سے انگریزی یا جرمن میں ترجمہ کرنے کے لئے کہا جاتا تھا۔ ان پر ایف ڈی او کے حکام کو اندھا اعتماد تھا۔ لہٰذا ڈاکٹر خان کو سرکاری طور پر یہ حساس دستاویزات گھر لے جانے کی

اجازت تھی۔انہوں نے پوری دیانتداری کے ساتھ یہ فرائض ادا کئے اور اپنے ادارہ کے اعتماد کا بھرم قائم رکھا۔
1974ء کی بات ہے۔ڈاکٹر خان کو المیلو میں ایک نہایت ہی اہم رپورٹ کا ترجمہ کرنے کے لئے بلایا گیا اور انہیں باور کرایا گیا کہ انہیں پہلے سے بھی زیادہ رازداری کے ساتھ اس رپورٹ کا ترجمہ کرنا ہوگا۔یہ رپورٹ سنٹری فیوج کے ڈیزائن اور اس کے پلانٹ کے علاوہ فنی ترکیب سے متعلق تھی جس پر یورینیم کی افزودگی کا انحصار تھا۔اور یہ المیلو کی برسوں کی ریاضت کا نچوڑ تھی۔ڈاکٹر خان کے لئے یہ کڑی آزمائش تھی۔انہوں نے شب وروز کام کیا اور توقعات کے برعکس بہت قلیل مدت میں یہ کام سرانجام دیا۔المیلو کے تمام سائنسدان ان کی محنت کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔بعد میں جب ہالینڈ کے حساس اداروں کو معلوم ہوا کہ المیلو نے یہ کام ایک پاکستانی سائنس دان سے کرایا ہے تو وہ بیچ پا ہو گئے مگر ایف ڈی او کی انتظامیہ نے انہیں خاموش کرا دیا۔ان دنوں ڈاکٹر خان لذت اور اذیت کے ایک کڑے دور سے گزر رہے تھے۔وہ ایف ڈی او کے ساتھ کام کر کے بظاہر خوش دکھائی دیتے تھے مگر ان کا دل پاکستان میں مستقل سکونت اور ملک کی خدمت کے لئے تڑپ رہا تھا۔وہ اپنی بیگم سے اپنے دل کا حال زار بیان کرتے اور کہتے "میرا ملک مجھے کب قبول کرے گا؟ میری قوم کو میری ضرورت ہے مگر اس کے راہبر اندھے ہو چکے ہیں۔وہ میری صلاحیتوں سے استفادہ نہیں کرنا چاہتے"۔
ڈاکٹر خان کی پرورش اسلامی ماحول میں ہوئی تھی اور وہ مایوسیوں کو اپنے اندر ڈیرے نہیں ڈالنے دیتے تھے۔وہ اولوالعزم تھے اور اپنے وطن اور اسلام سے انہیں عشق تھا۔یہی وجہ تھی کہ جب 1965 کی پاک بھارت جنگ کے حوالے سے ہالینڈ ٹیلی ویژن کے معروف مبصر پروفیسر ڈے ینگ نے ٹیلی ویژن پر ایک پروگرام پیش کیا اور مسئلہ کشمیر پر پاکستان کے موقف کو غلط قرار دیا تو ڈاکٹر خان تڑپ اٹھے تھے۔ان دنوں وہ زیر تعلیم تھے انہوں نے جھٹ سے پروفیسر ینگ کو خط لکھا اور اس میں مسئلہ کشمیر کا پس منظر اور بھارت کی فریب کاریوں کی داستان بڑے مدلل انداز میں بیان کی۔انہوں نے اخبارات میں کشمیر کے حوالے سے مضامین بھی لکھے جس کے بعد پروفیسر ینگ نے ٹیلی ویژن پر مسئلہ کشمیر صحیح تناظر میں پیش کرنا شروع کر دیا اور پاکستان کے موقف کو حق بجانب قرار دیا۔
جب 71ء کی جنگ ہوئی تو ڈاکٹر خان بیلجیئم میں تھے۔ٹیلی ویژن پر سقوط مشرقی پاکستان کی فلم میں پاک فوج کو ہتھیار ڈالتے ہوئے دکھایا گیا تو ڈاکٹر خان تڑپ کر رہ گئے۔وہ اپنے ملک کی ناتوانی پر بے چین تھے اور کئی ہفتے انہوں نے کرب واذیت میں رہ کر گزار دیئے۔یہ لمحہ ان کی زندگی کا سنگ میل تھا جب انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ اپنی تمام توانائیاں پاکستان کے لئے وقف کر دیں گے لہذا انہوں نے پاکستان آنے کے لئے رابطے شروع کر دیئے جن کا انہیں کوئی جواب نہ دیا گیا۔18 مئی 1974 کو بھارت نے روس کی آشیرباد سے ایٹمی دھماکہ کر ڈالا تو ڈاکٹر خان کے دل پر ایک گہرا چرکا لگا کیونکہ وہ دیکھ چکے تھے کہ پاکستانی حکمرانوں کا مورال گر چکا ہے اور فوج بددل ہو رہی ہے۔ڈاکٹر خان نے ایک بار پھر وطن واپس جانے کے لئے رابطے شروع کر دیئے۔وہ ہالینڈ آنے والے ہر پاکستانی کے آگے اپنا دل کھول کر رکھ دیتے مگر ہر کوئی انہیں مصائب سے ڈراتا اور کہتا کہ ابھی پاکستان کو ان کی ضرورت نہیں۔ڈاکٹر خان کو پورا یقین تھا کہ اب ہندوستان کے ایٹمی قوت بن جانے کے بعد اگر پاکستان نے یہ صلاحیت حاصل نہ کی تو ہم دس سال کے اندر اپنی آزادی سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔وہ اب آ کر پاکستان کی آزادی اور اپنی ماؤں اور بہنوں کی عزت بچانے کے لئے بیتاب تھے۔

کرب و اذیت کے دن

1974ء میں پاکستان ڈیسٹو کا ایک وفد وینٹنل (سرنگوں) کی خریداری کے سلسلے میں ہالینڈ پہنچا۔ڈاکٹر اسلم خان اور ڈاکٹر سبطین بخاری وفد کے ارکان تھے۔ڈاکٹر خان کو معلوم ہوا تو وہ ان سے ملے۔ڈاکٹر بخاری نے ان کی صلاحیتوں کو درخور اعتنا سمجھا اور انہیں ڈرایا کہ وہ پاکستان نہ آئیں کیونکہ وہاں کسی کو ان کی صلاحیتوں کی قدر نہیں ہو گی اور وہ حصول روزگار کے لئے پریشان ہوں گے۔ڈاکٹر خان نے ان پر زور دیا اور اپنے شعبے اور صلاحیتوں کی اہمیت اجاگر کر کے بتائی مگر وفد کے دونوں فاضل ارکان آئیں بائیں شائیں کر کے چلے آئے اور زیادہ تر وقت شطرنج کھیلنے میں ضائع کرتے رہے۔وفد کے ارکان کی عیاشیاں اور غیر ذمہ دارانہ حرکات سے انہیں رنج ہوا اور انہوں نے برملا اظہار کرتے ہوئے کہا "آپ لوگ قومی خزانے سے بھاری رقم لے کر ایک اہم قومی فریضہ ادا کرنے آئے ہیں۔آپ کو زیب نہیں دیتا کہ آپ یہاں بیٹھ کر شطرنج کھیلیں"۔
وفد کے ارکان کو ڈاکٹر خان کی یہ حق گوئی ناگوار گزری اور وہ بولے "ڈاکٹر خان! آپ اپنے کام پر دھیان دیں۔ہم بہتر جانتے ہیں کہ ہمیں کیا کرنا ہے"۔
ڈاکٹر خان سے جب راقم کی ملاقات میں اس وفد کے حوالے سے بات ہوئی تو وہ کرب کے عالم میں بولے "ڈاکٹر بخاری کے رویہ نے مجھے دکھ تو دیا تھا مگر میں نے حوصلہ نہ ہارا۔میں جانتا تھا کہ یہ لوگ پاکستان کو ترقی نہیں کرنے دیں گے۔اس لئے میں نے ان کے رویہ کو چیلنج بنا لیا اور پاکستان سے رابطوں کو پہلے سے زیادہ مخفوظ اور تیز کر دیا"۔

قسط نمبر 11

بھٹو سے رابطہ

ڈاکٹر صاحب کے پاس اب ایک ہی راستہ رہ گیا تھا اور انہوں نے جی کڑا کر کے وزیراعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو کو براہ راست خط لکھنے کا فیصلہ کرلیا کیونکہ بھٹو نے بھارت کے ایٹمی دھماکے کے بعد واضح طور پر کہا تھا ''اب ہمیں بھی اس اقدام سے باز نہیں رکھا جا سکے گا خواہ اس کے لئے ہمیں گھاس ہی کھانا پڑے''۔

یہ خط وسط 1974ء میں لکھا گیا۔ اس میں ڈاکٹر خان نے اپنے بارے میں اور پاکستانی اداروں کے رویئے سب کچھ کھول کر بیان کردیا اور ساتھ ہی بھٹو کو یہ بھی باور کرادیا کہ صرف ان کی ذات ہی پاکستان کے لئے سستا اور موثر ایٹمی صلاحیت والا منصوبہ پایہ تکمیل تک پہنچا سکتی ہے۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر خان نے اس خواہش کا بھی اظہار کیا کہ انہیں پاکستان سٹیل ملز میں خدمات کا موقع دیا جائے۔ یہ خط ڈاکٹر خان نے ڈاکٹر عبدالکریم کے نام سے لکھا۔ خط تیر بہدف ثابت ہوا۔ ذوالفقار علی بھٹو کے ذہن میں خط کا ایک ایک لفظ طوفان بپا کرنے لگا اور ڈاکٹر خان کی اَلمیلو پلانٹ سے وابستگی اور یورینیم کی افزودگی میں مہارت سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کرلیا۔

پوکھران (راجستھان) میں بھارت کے ایٹمی دھماکے نے جو تشویشناک صورت حال پیدا کردی تھی اس کے پیش نظر ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان کو ناقابل تسخیر بنانے کا اٹل فیصلہ کرلیا اور ڈاکٹر خان کو گرین سگنل دے دیا۔ بھٹو مرحوم کو ان کے بہی خواہوں حساس اداروں اور دانشور محبان وطن نے اشارے دے دیئے تھے کہ بھارت پاکستان کو نیست و نابود کرنے کی تیاریاں کررہا ہے اگر پاکستان نے ایٹم بم بنانے میں تاخیر کردی تو بھارت پاکستان پر ایٹم بم پھینک دے گا۔ لہذا اس بپھرے ہاتھی کے علاج کا فوری مطالبہ کیا گیا۔ بھٹو مرحوم نے ان حالات میں ایٹمی توانائی کمیشن کی جانب دیکھا پھر ان کی دوربین نظروں نے بھانپ لیا کہ ایٹمی توانائی کمیشن ان کے خوابوں کو تعبیر نہیں دے سکتا۔ انہی حالات میں انہیں ڈاکٹر خان کا خط ملا۔ ہالینڈ میں مقیم پاکستانی سفیر مسٹر بھٹو کا پیغام لے کر ڈاکٹر خان کی خدمت میں حاضر ہوگئے اور انہیں یہ بتایا کہ وزیراعظم پاکستان ان سے ملنے کے خواہشمند ہیں لہذا آپ جلد از جلد چھٹیاں لے کر پاکستان روانہ ہوجائیں۔

ڈاکٹر خان کی امیدیں بر آئیں۔ وہ فوراً پاکستان پہنچ جانا چاہتے تھے مگر ان دنوں چھٹیاں لینا دشوار تھا۔ لہذا انہوں نے وزیراعظم پاکستان کو جواب بھیجا کہ وہ ہر سال کرسمس کی چھٹیاں پاکستان میں گزارتے ہیں۔ اگر وہ مناسب سمجھیں تو اس ملاقات کو اس وقت تک موخر کردیں۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے جب بیگم ہینی کو یہ خوشخبری سنائی تو وہ بولیں ''ڈاکٹر خان تقدیر نے آپ کو پاکستان بھیجنے کا فیصلہ کرلیا ہے میں آپ کے ساتھ ہوں جب آپ اشارہ کریں گے میں یورپ کی ان فضاؤں کو خیرباد کہہ دوں گی''

ڈاکٹر خان اپنی وفا شعار بیوی کے جذبات بخوبی جانتے تھے۔ مخلص ہمدرد اور شوہر کا دم بھرنے والی بیویاں اپنے مجازی خدا کی نبض شناس ہوتی ہیں۔ وہ اپنے عزیز از جان خاوند کے ارادوں اور صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں اپنا سب کچھ قربان کردیتی ہیں۔

ذوالفقار علی بھٹو کو ڈاکٹر خان کا جواب موصول ہوا تو انہوں نے پیغام بھجوادیا کہ وہ مطمئن رہیں۔ کرسمس کی چھٹیوں میں پاکستان آئیں تو ان کے ملٹری سیکرٹری بریگیڈیئر امتیاز سے رابطہ کرلیں۔ اس دوران بھٹو مرحوم سیکرٹ سروسز اور سفارتی ذرائع سے اَلمیلو پلانٹ کی اہمیت اور ڈاکٹر خان کے بارے میں مفصل معلومات حاصل کرچکے تھے۔

دسمبر 1974ء میں ڈاکٹر خان بیوی بچیوں سمیت کرسمس کی چھٹیاں منانے کراچی آگئے۔ انہوں نے آتے ہی بریگیڈیئر امتیاز سے رابطہ کیا جنہوں نے وزیراعظم پاکستان کو ڈاکٹر خان کی پاکستان میں آمد سے مطلع کیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے انہیں فوراً اسلام آباد بلالیا۔ وزیراعظم نے نوجوان ڈاکٹر خان کا بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ استقبال کیا اور بے تابی سے دریافت کیا۔

''ڈاکٹر خان! مجھے صاف صاف اور سچ سچ بتائیں کیا آپ بم...... میرا مطلب ہے ایٹم بم تیار کرسکتے ہیں؟''

ڈاکٹر خان نے بڑے پراعتماد لہجے میں کہا ''سر یقیناً...... کیوں نہیں؟ میرا آپ کو خط لکھنے کا مقصد ہی یہ تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ پاکستان کے لئے ایٹم بم کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ میں آپ کو اور پاکستانی قوم کو مایوس نہیں کروں گا''۔

یہ سنتے ہی ذوالفقار علی بھٹو کے چہرے پر طمانیت آگئی اور وہ خوشی سے تالی بجا کر بولے ''زبردست! آگے کہو'' ڈاکٹر خان بولے ''سر میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا مگر ایک بات واضح کردوں کہ اس کام میں مجھے مکمل آزادی چاہیے''۔

''مسٹر خان! یہ آپ کا پرابلم نہیں۔ آپ صرف ایٹم بم بنانے کی سوچئے'' بھٹو جذباتی لہجہ میں بولے پھر دریافت کیا

”مگر ڈاکٹر خان آپ ایٹم بنانے کے لئے کیا طریقہ اختیار کر سکتے ہیں“

ڈاکٹر خان نے بتایا ”میں ری پراسسنگ پلانٹ کی بجائے الٹرا سنٹری فیوج پلانٹ کے ذریعے یورینیم کی افزودگی کروں گا۔ اس سے ہم بہت جلد ایٹم بم بنا لیں گے۔“

”مگر یہ تو بہت مشکل کام ہے“ بھٹو بولے ”آپ جس ادارے میں کام کرتے ہیں وہاں بیس سال سے کام ہو رہا ہے اور سارے یورپ کا ذہن المیلو کے پلانٹ میں صرف ہو رہا ہے۔ اربوں ڈالر خرچ ہو چکے ہیں۔ پاکستان جیسا غریب ملک اس نظام سے کیسے مستفید ہو سکتا ہے۔“

”میں مسلمان اور پاکستانی ہوں۔ مجھے اپنی صلاحیتوں پر یقین ہے۔ میرا خدا مجھے مایوس نہیں کرے گا۔ سر! دنیا حیران رہ جائے گی کہ پاکستان جیسا ملک اس جدید ٹیکنالوجی سے کیسے بہرہ مند ہو گیا“ ڈاکٹر خان نے وزیر اعظم پاکستان کو مطمئن کرتے ہوئے بتایا ”پاکستان ری پراسسنگ کے ذریعے کبھی بھی ایٹمی توانائی کے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں کر سکتا۔ امریکہ اپنے ایٹمی ری ایکٹر پاکستان کو دے کر اپنا محتاج رکھنا چاہتا ہے کیونکہ ری پروسسنگ کے لئے ایٹمی ری ایکٹروں کی ایک بڑی تعداد درکار ہوتی ہے اور پاکستان لامحالہ اس مہنگے سودے کا روادار نہیں ہو سکتا بلکہ ہمیں سستے موثر اور فائدہ مند نظام کی ضرورت ہے ری پروسیسنگ کی بجائے یورینیم کی افزودگی کی ٹیکنالوجی ہمارے لئے سود مند ہے اگر ہم اس میں کامیاب ہو جاتے ہیں جس کی مجھے سو فیصد امید ہے تو انشاء اللہ پاکستان کسی کا محتاج نہیں رہے گا ویسے بھی ری پروسیسنگ پلانٹ بین الاقوامی نگرانی میں ہو گا۔“

یہ سن کر بھٹو مرحوم کا چہرہ دمک اٹھا اور بولے ”مسٹر خان! میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ جب تک میں زندہ ہوں آپ کے ارادوں پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔ آپ ملک کی خاطر اس کام کے آغاز کی تیاریاں شروع کر دیں اور اس سلسلے میں منیر احمد خان سے ضرور مل لیں اور ان کے ساتھ ہی مل کر کام کریں۔ میں انہیں آپ کے متعلق بریفنگ دے دوں گا۔ اس کے علاوہ آپ جب چاہیں مجھ سے مل سکتے ہیں۔“

منیر احمد خان ان دنوں ایٹمی توانائی کمیشن کے چیئرمین تھے بھٹو ان پر بے حد اعتماد کرتے تھے لیکن بھٹو صاحب کو یہ علم نہیں تھا کہ منیر احمد خان صرف الیکٹریکل انجینئر تھے اور امریکہ کے ایک پولی ٹیکنیک سے 9 مہینہ کا ڈپلومہ حاصل کیا تھا۔ نہ ہی وہ نیوکلیئر سائنسدان تھے اور نہ ہی ڈاکٹر تھے۔ وہ بھٹو صاحب کو اپنے بھائی شیخ خورشید کے ذریعہ بیوقوف بنا کر اہم ترین اور حساس ترین ادارہ سے وابستہ ہو گئے تھے۔

نیا راستہ

ڈاکٹر خان وزیر اعظم پاکستان سے مل کر نہایت مطمئن ہو گئے اور ان کے مشورے پر مسٹر منیر احمد خان سے رابطہ کیا۔ مسٹر منیر احمد خان نے انہیں ایٹمی توانائی کمیشن کی مختلف تنصیبات بشمول پنسٹیک وغیرہ دکھائیں۔ چند ہی ملاقاتوں میں دونوں سائنس دانوں میں بظاہر انڈر سٹینڈنگ پیدا ہو گئی۔ ڈاکٹر خان نے مسٹر منیر احمد خان کو سینٹری فیوج پلانٹ کی خصوصیات سے آگاہ کیا اور انہیں یقین دلایا کہ ری پروسیسنگ پلانٹ کی بجائے سنٹری فیوج پلانٹ ہی بہتر ہے۔ مسٹر منیر احمد خان نے انہیں اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلا دیا تو وزیر اعظم بھٹو نے کہا ”ڈاکٹر خان اب آپ کو یقین آ گیا ہے کہ پاکستان ایٹمی توانائی کے ضمن میں خاصی پیش رفت کر چکا ہے بس آپ ہالینڈ کو خیر باد کہہ دیں“۔

”سر میں بہت جلد استعفیٰ دے کر آ جاؤں گا۔ مسٹر منیر احمد خان نے مجھے یقین دلایا ہے کہ ہم سنٹری فیوج پلانٹ کے لئے انتظامات کر دیں گے۔ مجھے امید ہے میری وطن واپسی تک خاصا کام ہو چکا ہو گا۔ میں چاہتا ہوں کہ جب وطن واپس آؤں تو پرائمری سطح کا کام ہو چکا ہو اور ہم وقت ضائع کئے بغیر اپنا سفر آگے جاری رکھ سکیں“۔

ڈاکٹر خان ہالینڈ واپس چلے گئے وہاں ان کا زیادہ تر وقت اپنے موضوع سے متعلق کتب اور مواد کے مطالعہ میں صرف ہوتا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ وہ پاکستان میں ری پروسیسنگ کے فرسودہ نظام کی بجائے الٹرا سنٹری فیوج لگانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ مگر انہیں یہ بات معلوم نہیں تھی کہ پاکستانی افسر شاہی ان کے ارادے اور منصوبے ناکام کرنے کے درپے ہو جائے گی۔ ڈاکٹر خان پاکستان کی ایٹمی توانائی کے حصول کی تمام کاوشوں سے بخوبی آگاہ تھے۔ ایٹمی توانائی کمیشن اور اس کے کارپردازوں کی کارکردگی ان سے ڈھکی چھپی نہیں تھی اس کے باوجود انہوں نے اپنے بے کل دل کو اطمینان دلایا کہ ایٹمی توانائی کمیشن کو اپنی کارکردگی دکھانے کا بھرپور موقع ملنا چاہیے۔

پاکستان ہمیشہ سے پر امن ایٹمی پروگرام کا داعی رہا ہے اور اپنی سلامتی کے لئے اسے ناگریز تصور کرتا رہا ہے۔ اسی لئے 1956ء میں پاکستان اٹامک انرجی کمیشن کی بنیاد رکھ دی گئی۔ اس کے پہلے سربراہ ڈاکٹر نذیر احمد تھے جو بنیادی طور پر کاٹن ایکسپرٹ تھے۔ انہوں نے اس ادارہ کی منصوبہ سازی کی۔ اگرچہ یہ محض کاغذی کاروائی تک محدود تھی بعد ازاں 1960ء میں ایک ممتاز پاکستانی سائنسدان ڈاکٹر عثمانی اس ادارہ کے سربراہ بنائے گئے۔ ان کی سفارش نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر عبد السلام نے کی تھی جو ان دنوں صدر پاکستان ایوب خان کے مشیر برائے سائنسی

امور رہتے۔
ڈاکٹر عثمانی نے ادارے کو مستحکم کرنے کے لئے بڑا ٹھوس کام کیا۔ انہیں اس بات کا کامل احساس تھا کہ وطن عزیز میں کوئی ایسا صنعتی ڈھانچہ نہیں جو اس ادارے کے امور میں معاون ثابت ہو سکے اور نہ تربیت یافتہ ماہرین موجود ہیں۔ لہٰذا ایک ایسا پروگرام تشکیل دیا گیا جس کے تحت بہت سارے نوجوان سرکاری وظائف پر غیر ملکی یونیورسٹیوں سے سائنسی علوم اور ہنر مندی حاصل کر کے پاکستان آنے لگے۔ ڈاکٹر عثمانی کے دور ہی میں ایٹی ری ایکٹر کا معاہدہ ہوا۔ تین سال کے بعد پنسٹک کا سنگ بنیاد نیلور کے مقام پر رکھا گیا۔ 1965ء میں ریسرچ ایٹمی ری ایکٹر نصب ہوا۔ یہ پانچ میگا واٹ کا سوئمنگ پول ٹائپ ریسرچ ری ایکٹر تھا جسے امریکہ نے "ایٹم برائے امن پروگرام" کے تحت دیا تھا۔ اسی طرز کے ری ایکٹر امریکہ نے پاکستان کے علاوہ دیگر تقریباً پچاس ممالک کو بھی فراہم کئے تھے۔
اگر چہ نیلور میں ری ایکٹر کی تنصیب سے وطن عزیز میں ایٹمی ٹیکنالوجی کے عملی منصوبوں کا آغاز ہوا جو کسی حد تک اہم اور مناسب تھا مگر سرخ فیتے کی فتنہ سازیوں نے اسے تباہ کر کے رکھ دیا اور اسے پروان نہ چڑھنے دیا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ 1972ء تک پاکستان اٹامک انرجی کمیشن ایک جوائنٹ سیکرٹری کے تحت کام کرتا تھا، لہٰذا اس شعبے میں کسی قابل ذکر ترقی یا پیش رفت کا تصور ہی محال رہا۔
1961ء میں لاہور میں اٹامک انرجی کمیشن سنٹر قائم کیا گیا۔ اس سنٹر نے مختلف شعبوں کے لئے ماہرین کی تربیت کا فریضہ بھی انجام دیا۔ آگے چل کر اسی سنٹر نے زرعی تحقیقی سنٹر پنسٹک، میڈیکل سنٹر، معدنیات کے مراکز اور کینوپ (کراچی) وغیرہ کو افرادی قوت فراہم کی۔ 1972ء میں ڈاکٹر عثمانی اپنے عہدے سے سبکدوش ہوئے تو ان کی جگہ مسٹر منیر احمد خان کو کمیشن کا چیئر مین مقرر کیا گیا۔ وہ اپنی کم صلاحیتوں اور تجربے کی وجہ سے اس اہم اور حساس ادارہ کی کارکردگی کو بڑھانے میں ناکام رہے جس کے نتیجے میں پاکستان میں ایک بھی ری ایکٹر نہ لگایا جا سکا۔ واضح رہے کہ 137 میگا واٹ کا نیوکلیئر پاور پلانٹ (کینوپ) جو کراچی میں نصب کیا گیا وہ ڈاکٹر عثمانی نے لگوایا تھا۔
دسمبر 1974ء میں پاکستان پر ایک افتاد نازل ہوئی۔ کینیڈا نے جوہری توانائی کے عدم پھیلاؤ یعنی این پی ٹی کے معاہدے پر دستخط کرنے کے باعث اور امریکہ کے سیاسی دباؤ کے بعد پاکستان کو فاضل پرزوں اور ایندھن کی فراہمی بند کر دی۔ پاکستان ایٹمی انرجی کمیشن نے اس پابندی سے مات نہ کھائی اور اس چیلنج کو یوں قبول کیا کہ اس کے انجینئروں اور سائنس دانوں نے اپنے وسائل سے خود ہی ایٹمی ایندھن کی تیاری میں اہم کامیابیاں حاصل کر لیں اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے انجینئروں کی تربیت کا بندوبست بھی کر لیا۔ ان کاوشوں کے نتیجے میں پاکستان نے قدرے خود کفالت حاصل کر لی اور بہت کم عرصہ میں کراچی کے نیوکلیئر پاور ٹریننگ سنٹر میں ہنر مندوں کی ایک جماعت تیار کر لی۔ اس کامیابی سے پاکستان کے سائنس دانوں کے حوصلے بلند ہوئے پھر انہوں نے ایندھن اور خاص پرزوں کی تیاری میں خود کفالت کے پیش نظر اسی قسم کا ایک پلانٹ میانوالی کے نزدیک 1976ء میں چشمہ کے مقام پر دریائے سندھ کے کنارے لگانے کا پروگرام بنایا۔ چشمہ پراجیکٹ کی بجلی کی پیداواری صلاحیت 900 میگا واٹ تھی۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی منصوبہ تیار کیا گیا کہ ملکی توانائی کی ضروریات کے پیش نظر 2000ء تک ملک بھر میں 24 ری ایکٹر قائم کئے جائیں گے۔ چشمہ پلانٹ اسی سلسلہ کی پہلی کڑی تھی مگر یہ منصوبہ 24 سال تک کھٹائی میں پڑا رہا۔ کیونکہ اسکی تعمیر کے لئے ایک طرف تو عالمی سطح پر ٹینڈر داخل نہیں کئے جا سکتے تھے اور دوسرا یہ کہ منیر احمد خان اپنے کام میں قطعی ناکام رہے۔
مغرب نواز حکمران ہمیشہ سے ترقی پذیر ممالک کے لئے دوغلی پالیسیاں مرتب کرتے رہتے ہیں۔ ایک طرف تو کینیڈا این پی ٹی کے معاہدے پر دستخط کرنے کے بعد پاکستان کو ایٹمی پلانٹ کے لئے پرزے فراہم کرنے سے منکر ہو گیا مگر دوسری طرف وہ اپنے ہی بنائے قوانین کی دھجیاں بکھیرتے رہے۔ فروری 1976ء کو پاکستان کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے کینیڈا کا تین روزہ دورہ کیا اور انہیں پاکستان کے پر امن ایٹمی پروگرام اور اسکی ضرورتوں سے آگاہ کیا اور انہیں معاہدے کے مطابق پرزے فراہم کرنے کا کہا مگر امریکہ کا بغل بچہ کینیڈا ٹس سے مس نہ ہوا۔
دورہ کے دوران بھٹو مرحوم نے انکشاف کیا کہ پاکستان نے فرانس کے ساتھ ایٹمی ری پراسسنگ پلانٹ کی خریداری کا معاہدہ کر لیا ہے۔ جس کی منظوری انٹرنیشنل اٹامک انرجی ایجنسی (IAEA) نے بھی دی ہے۔ بھٹو مرحوم کے اس انکشاف کی تصدیق 18 مارچ 1976ء کو ہوئی جب پاکستان فرانس معاہدہ پر دستخط ہو گئے۔ اس معاہدے میں واضح طور پر درج تھا کہ پاکستان فراہم کئے جانے والے ری پراسسنگ پلانٹ یا فرانس کے فراہم کردہ کسی بھی قسم کے مواد سے نہ تو ایٹم بم تیار کرے گا اور نہ ہی اس کو دیگر فوجی مقاصد کے لئے استعمال کرے گا۔ پاکستان اور

فرانس دونوں (IAEA) کو پلانٹ کی تعمیر کے کام سے متعلق آگاہ کرتے رہیں گے اس کے علاوہ فرانس سے پاکستان منتقلی کی بھی تفصیلات فراہم کی جاتی رہیں گی۔

پاکستان دنیا کے سرخیل ممالک کو ہمہ وقت کھٹکتا رہا ہے۔اسی وجہ سے پاکستان کے پرامن ایٹمی پروگرام پر بہانے بہانے سے پابندیاں عائد کی جاتی رہیں۔اسکی سب سے بڑی وجہ تو یہ تھی کہ پاکستان میں معیاری اور عمدہ یورینیم کے تسلی بخش ذخائر موجود ہیں۔کیونکہ خام یورینیم کی فراہمی اور دستیابی کے بغیر جوہری توانائی کا کوئی پروگرام کامیابی کے ساتھ نہیں چلایا جاسکتا۔پاکستان ان غیر ملکی معاہدوں کے بغیر بھی اس خام یورینیم کو صاف کرتا رہا اور اس نے کسی بھی دور میں اپنے اس عمل میں رکاوٹ نہیں آنے دی۔

18 مئی 1974ء کو جب بھارت نے اپنا پہلا ایٹمی دھماکہ کیا تو پاکستان نے ایٹمی توانائی کے حصول کی کوششیں تیز کردی تھیں۔پاکستان کی یہ عجلت امریکہ سے چھپی نہ رہ سکی۔لہٰذا دسمبر 1974ء میں پہلے این پی ٹی کا قانون سامنے لایا گیا اور ان تمام ممالک کو عدم تعاون کے لئے مجبور کردیا گیا جو پاکستان کو ایٹمی پراجیکٹ کے پرزے فراہم کرتے تھے۔اسی سال ستمبر میں سی آئی اے نے پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے بارے میں ایک رپورٹ تیار کرکے اس بات کی نشاندہی کردی کہ "پاکستان نے اگر ایٹمی قوت بننے کی کوشش کی بھی تو اس کو تقریباً دس سال کا عرصہ درکار ہوگا"۔یعنی پاکستان کا ایٹمی دھماکہ 1984ء سے پہلے متوقع نہیں۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا گیا "عین ممکن ہے بیرونی تعاون اور امداد سے یہ دھماکہ پہلے بھی ہوجائے۔"

ڈاکٹر خان پر ان کے دوستوں نے یہ بات واضح کردی تھی کہ چند طاقتیں (بیوروکریسی) پاکستان کو ری پروسسنگ کے چنگل سے آزاد نہیں دیکھنا چاہتیں اور اس ضمن میں بعض سائنس دان بھی ان طاقتوں کے ہاتھ میں ہیں۔ ڈاکٹر خان ری پروسسنگ کے سخت خلاف تھے کیونکہ وہ دورہ پاکستان کے دوران یہ دیکھ چکے تھے کہ اٹامک انرجی کمیشن کے تحت قائم ہونے والے پراجیکٹ کا مقصد ری پروسسنگ پلانٹ کی تنصیب تھا مگر کافی عرصہ گزر جانے کے باوجود اس پراجیکٹ کی کوئی قابل ذکر پیش رفت نہیں ہوئی تھی۔

ایٹمی ری ایکٹر توانائی پیدا کرنے والا پلانٹ ہوتا ہے، جس میں یورینیم کا ایندھن استعمال کیا جاتا ہے جبکہ ری پروسسنگ پلانٹ استعمال شدہ ایندھن جسے ایٹمی فضلہ کہا جاتا ہے، اس سے پلوٹونیم اور غیر استعمال شدہ یورینیم نکال کر اسے دوبارہ ری ایکٹر کے لئے قابل استعمال بناتا ہے۔گویا ری پروسسنگ پلانٹ کا اصل مقصد ری ایکٹروں کو چلانے والے ایٹمی مواد کو دوبارہ صاف کرنا تھا۔لہٰذا ڈاکٹر خان ری ایکٹروں کی ایک بڑی تعداد کے بغیر ری پروسسنگ پلانٹ کو محض سفید ہاتھی تصور کرتے تھے۔اس کے برعکس وہ سینٹری فیوج کے ذریعہ یورینیم کی افزودگی کو اہمیت دیتے تھے۔

یورینیم کی ری پروسسنگ اور افزودگی کے الگ الگ طریقے ہیں۔ری ایکٹر کے استعمال شدہ ایندھن میں بہت سا یورینیم بچ جاتا ہے پلوٹونیم ایک قدرتی عنصر نہیں لہٰذا اسے ری ایکٹر کے ذریعے ضمنی پیداوار کی حیثیت سے ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔اس کے برعکس یورینیم کی افزودگی کا ری ایکٹر کے استعمال شدہ یورینیم سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔اس طریقے میں زمین سے نکالے ہوئے یورینیم کو اپنی قدرتی حالت میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔یورینیم اور پلوٹونیم دونوں ایٹمی ایندھن کے طور پر استعمال کئے جاسکتے ہیں۔دونوں سے بم تیار کیا جاسکتا ہے چنانچہ مغربی ممالک اپنی اجارہ داری قائم رکھنے کے لئے ان کی تیاری پر مشتعل ہوجاتے ہیں۔

قدرتی یورینیم میں دو آئی سوٹوپس ہوتے ہیں۔یورینیم 238 اور یورینیم 235

یورینیم 238 قابل شکست نہیں یعنی اسے پھاڑا نہیں جاسکتا اور اس لئے اسے ری ایکٹر میں استعمال بھی نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی اسے بم سازی کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔اصل شے یورینیم 235 ہے۔یہ جوہری توانائی پیدا کرسکتا ہے۔پاکستان میں موخر الذکر یورینیم کے حصول میں بڑی پیچیدگی اور دشواری پیدا ہوتی ہے کیونکہ یورینیم 235 کا عنصر قدرتی یورینیم میں ایک فیصد سے بھی کم ملا ہے جبکہ قدرتی یورینیم کا 99 فیصد عنصر 238 یورینیم میں ہوتا ہے۔اب صورتحال یہ ہے کہ دنیا کے اکثر ری ایکٹر افزودہ یورینیم کو ایندھن کے طور پر استعمال کرنے کو زیادہ منافع بخش سمجھتے ہیں۔افزودگی کا مطلب یہ ہے کہ یورینیم 235 کی فیصد شرح کو 3 فیصد تک بڑھایا جائے۔ایک جوہری ری ایکٹر عام طور پر افزودہ یورینیم کے ایسے درجے پر چلتا ہے جس کے ایندھن میں دو یا تین فیصد یورینیم 235 ہوتا ہے۔ایک یورینیم بم کو 90 فیصد یا اس سے زیادہ افزودہ یورینیم کی ضرورت ہوتی ہے۔

یورینیم 235 کو پہلی بار گزشتہ جنگ عظیم کے دوران امریکہ میں افزودہ (الگ) کیا گیا تھا۔اس طریقے کو "شکست" کہا جاتا ہے۔اس میں گیس دار یورینیم کو نہایت باریک فلٹروں میں داخل کیا جاتا ہے۔اس سے نسبتاً ہلکا اور متحرک یورینیم 235 ان میں سے آسانی سے گزر جاتا ہے اسی طرح ہزاروں بار استعمال کرنے سے فلٹروں کی مدد سے یورینیم 235 کی زیادہ مقدار حاصل کی جاتی ہے۔

1960ء تک سینٹری فیوج طریقے کے متعلق سوچ بچار ہوتی رہی۔ الٹرا سینٹری فیوج کا یہ استعمال نہایت نازک اور پیچیدہ ہے۔ یہ مشینیں یورینیم 235 اور یورینیم 238 کو انتہائی تیزی سے گردش میں لاتی ہیں اور ان دونوں کو الگ الگ کر دیتی ہیں۔ ان کی گردشی رفتار 80 ہزار سے ایک لاکھ فی منٹ ہوتی ہے اور اس قسم کی ہزاروں مشینیں کام کر رہی ہوتی ہیں۔ قدرتی طور پر ان مشینوں کو بڑے مضبوط لوہے سے تیار کرنا پڑتا ہے۔ سینٹری فیوج کے اس طریقے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ توانائی کم استعمال ہوتی ہے یعنی دوسرے طریقے کی نسبت دسواں حصہ۔ چنانچہ یہ طریقہ ایک عام ترقی پذیر ملک کے اختیار میں ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر خان نے یورینیم کی افزودگی کا یہ طریقہ پاکستان کے لئے بے حد ضروری سمجھا کیونکہ پاکستان کے مستقبل کے ری ایکٹر افزودہ یورینیم کے طریقے سے چلائے جانے تھے۔ ڈاکٹر خان کا یہ طریقہ پاکستان کے لئے نہایت ارزاں ثابت ہوتا اس سے مغرب کی اجارہ داری بھی ختم ہو جاتی۔

دنیا میں یورینیم کی افزودگی کے ایک درجن سے زیادہ طریقے موجود ہیں لیکن ٹیکنالوجی اور تجارتی نقطہ نظر سے صرف دو طریقے سینٹری فیوج اور ڈفیوژن ہیں۔ ڈفیوژن کا طریقہ اوائل 1940ء میں دوسری جنگ عظیم کے دوران امریکہ میں دریافت ہوا اور اس طریقے سے تیار ہونے والا ایٹم بم ہیروشیما پر گرایا گیا تھا۔ یہ طریقہ بہت مہنگا ہے اور بہت زیادہ توانائی خرچ کرتا ہے جبکہ سینٹری فیوج کا سستا طریقہ ایجاد ہونے کے بعد اسکی اہمیت کم ہو گئی۔ 1972ء میں اس کا پائلٹ پلانٹ لگایا گیا وہ بڑے صنعتی پلانٹ جن کی استعداد ایک ہزار ٹن ہے۔ المیلو ہالینڈ اور پن ہرسٹ انگلینڈ میں چل رہے ہیں۔ جرمنی نے گرو ناو کے مقام پر ایک ہزار ٹن کا پلانٹ لگایا۔ مگر جاپان کا ارادہ بھی سینٹری فیوج پلانٹ لگانے کا ہے۔ چند بڑے ڈفیوژن پلانٹ امریکہ، انگلینڈ، فرانس، روس اور چین میں کام کر رہے ہیں جبکہ ارجنٹائن نے ایک پائلٹ پلانٹ لگایا ہے۔ سینٹری فیوج کی کامیابی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ یورنیکو (انگلینڈ جرمنی اور ہالینڈ کے اشتراک سے) اڑھائی بلین پاونڈ کے خرچ سے سینٹری فیوج سے افزودگی کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

یورینیم کی افزودگی کا ایک نیا طریقہ نوزل پروسس ہے۔ اسے نام وے ریسرچ سنٹر مغربی جرمنی کے پروفیسر بیکر نے دریافت کیا تھا لیکن یہ ناکافی اور تجارتی وجوہات کی بنا پر 35 سال گزر جانے کے باوجود پائلٹ پلانٹ کے مرحلے سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اسی طرح امریکہ نے یورینیم کی افزودگی کے لئے ایک نیا پروسس لیزر سپریشن پروسس کے نام سے مشتہر کیا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ یہ طریقہ مستقبل میں یورینیم کی افزودگی کے لئے سب سے موثر اور سستا طریقہ ثابت ہوگا۔ اس طریقہ کو ڈفیوژن پراسس پر یہ برتری ہے کہ اس میں کم توانائی خرچ ہوتی ہے مگر یہ دعویٰ صرف تسلی سے آگے نہ بڑھ سکا۔

ان تمام سے افضل طریقہ صرف سینٹری فیوج ہی ثابت ہوا۔ اس کا اندازہ اسی نتیجہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا بھر میں جہاں جہاں یہ ٹیکنالوجی کام کر رہی ہے، یورینیم کی افزودگی کی شرح زیادہ ہے۔ مثلاً کے پن ہرسٹ (انگلینڈ) کے پلانٹ کی پیداواری استعداد 250 ہزار ایس ڈبلیو یو فی سال اور گرو ناو (مغربی جرمنی) کی 200 ہزار ایس ڈبلیو یو فی سال افزودہ یورینیم ہے۔ یہ اتنی بڑی پیداواری صلاحیت ہے کہ سینٹری فیوج ٹیکنالوجی کی بہترین کارکردگی کے لئے کسی اور ثبوت کی ضرورت نہیں رہتی۔

ڈاکٹر خان سے پہلے پاکستان میں سینٹری فیوج ٹیکنالوجی کا سوچنا ہی گناہ تھا ہمارے ان سائنس دانوں کو سینٹری فیوج کا نام تک معلوم نہیں تھا' ڈاکٹر خان نے جونہی سرزمین پاکستان پر قدم رکھا اور وطن عزیز کی مٹی کو ایٹمی قوت بنانے کا عزم کیا تو انہوں نے یورینیم کی افزودگی کے لئے سب سے بہتر، موثر اور سستا ترین طریقہ سینٹری فیوج ٹیکنالوجی کو قرار دیا اور اسے رائج کرنے کے لئے وزیر اعظم پاکستان کو آمادہ کر لیا۔

قسط نمبر 12

"آئی ول سی دی ہندو باسٹرڈز ناؤ"

ڈاکٹر خان ہالینڈ میں اپنی تیاریاں مکمل کر کے 22 دسمبر 1975ء کو پاکستان آئے۔ مگر وہ کام کے نتائج دیکھ کر انتہائی مایوس ہوئے۔ وہ جو ارادے باندھ کر آئے تھے، بیوروکریسی اور سیاست دانوں نے انہیں توڑنے کی بے حد کوششیں کیں۔ ڈاکٹر خان منیر احمد خان کے رویہ سے حیران تھے کہ وہ جان بوجھ کر اس اہم قومی مشن اور پراجیکٹ سے چشم پوشی کیوں کر رہے ہیں؟۔ انہوں نے سلطان بشیر الدین محمود جو اس وقت کہوٹہ پراجیکٹ کے انچارج تھے ان کے ذریعے منیر احمد خان کو صورتحال سے آگاہ کیا اور انہیں واضح طور پر کہہ دیا کہ انہیں جس مشن کی تکمیل کے لئے بلایا گیا ہے اس پر کام نہیں ہو رہا۔ انہوں نے منیر احمد سے ملاقات کی کوششیں بھی کیں مگر منیر احمد ڈاکٹر خان جیسے محب وطن کا سامنا نہیں کرنا چاہتے تھے۔

دراصل منیر احمد خان چاہتے تھے کہ ڈاکٹر خان بھی ان کی طرح بھٹو کو حقائق سے بے خبر رکھیں اور انہیں ایٹم بم کا سبز باغ دکھاتے رہیں۔ ان نے ڈاکٹر خان کے جارحانہ اور حق وصداقت پر مبنی رویہ سے محسوس کر لیا کہ ڈاکٹر خان ان کے آلہ کار نہیں بن سکتے اور نہ ہی وہ "چمچ" بن سکتے ہیں۔

ڈاکٹر خان نے منیر احمد خان کے رویہ سے دلبرداشتہ ہو گئے اور ملک چھوڑنے کا حتمی فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے 25 جولائی 1976ء کو ذوالفقار علی بھٹو کو خط لکھا جس میں انہوں نے منیر احمد خاں کے بارے میں واضح لکھ دیا کہ وہ ان سے کیا چاہتے ہیں (ڈاکٹر عبدالقدیر خاں نے منیر احمد خاں اور ذوالفقار علی بھٹو کو جو خطوط لکھے وہ اس کتاب کے آخری صفحات میں ملاحظہ فرمائیں)۔

خط پڑھتے ہی ذوالفقار علی بھٹو کا چہرہ غصہ سے تپ گیا اور انہوں نے ڈاکٹر خاں کو فوراً اپنے پاس بلایا۔

"ڈاکٹر خان! آپ نے جو خط میں جو انکشافات کئے ہیں کہ یہ حقیقت پر مبنی ہیں"۔

"میں نے پوری سچائی کے ساتھ آپ کو بتا دیا ہے کہ منیر احمد خاں ایک فراڈ ہے۔ وہ صرف بی ایس سی اور ڈپلومہ ہولڈر ہے۔ وہ جس دعویٰ کا اظہار کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ وہ پاکستان کو ایٹمی قوتوں سے مالامال کر دے گا' اس کا وہ تجربہ ہی نہیں رکھتا تو ایٹم بم کیسے بنائے گا"۔

ذوالفقار علی بھٹو ڈاکٹر خاں کی جرأت مندی اور سچائی کے علاوہ منیر احمد خاں کی چیرہ دستیوں نے ششدر کر دیا۔

"ڈاکٹر خاں میں آپ کو جانے نہیں دوں گا۔ میں آپ کے جذبوں کی سچائی کو سمجھتا ہوں۔ آپ جیسے محب وطن سائنسدان کی اس ملک کو اشد ضرورت ہے"۔

"مگر سر! میں انتہائی افسوس کے ساتھ آپکو مطلع کر رہا ہوں کہ میں جنوری کے پہلے ہفتہ میں واپس ہالینڈ چلا جاؤں گا"۔

"مگر کیوں؟" ذوالفقار علی بھٹو نے حیرانی سے ڈاکٹر خان کی طرف دیکھا۔

"مجھ سے کام لینا چاہتے ہیں تو مجھے آزادی سے کام کرنے دیا جائے لیکن اس سے قبل ایک بات گوش گزار کر دوں کہ میں جن امور کو نپٹانے کے لئے کہہ گیا تھا، ان پر نہایت سستی کے ساتھ کام کیا گیا ہے۔ جہاں میں گاڑی چھوڑ کر گیا تھا، ابھی تک وہیں کھڑی ہے۔ چیئرمین نے پراجیکٹ ایک ایسے ایم ایس سی الیکٹریکل انجینئر بشیر کے حوالے کر دیا ہے جو یورینیم کی افزودگی کے منصوبے کو سمجھنے کی صلاحیت سے بھی محروم ہے۔ اب آپ بتائیں کہ ان لوگوں سے کیا امید رکھی جا سکتی ہے" ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے لگی لپٹی رکھے بغیر صورتحال وزیر اعظم پاکستان کے سامنے پیش کر دی۔

ذوالفقار علی بھٹو نے ڈاکٹر خان کو چند دن انتظار کرنے کے لئے کہا اور اس دوران اپنے معتمد رفقاء آغا شاہی اور مولانا کوثر نیازی سے مشورہ کیا، پھر ایک دن ڈاکٹر خان کو طلب کیا اور کہا۔ "ڈاکٹر خان! آپ پاکستان کی ضرورت ہیں۔ واپس نہ جائیں اور وطن کی خدمت کریں۔ پاکستان میں یورینیم کی افزودگی کے منصوبوں کی رہنمائی کریں۔ قوم آپ کا احسان یاد رکھے گی"۔

ڈاکٹر خان نے بھی چند دن کی مہلت مانگی اور کہا "میں اپنی ماں اور بیگم سے مشورہ کر کے آپ کو مطلع کر دوں گا"

ڈاکٹر خان گھر واپس آئے اور صورتحال ان پر واضح کی۔ والدہ اور بھائی کئی سال سے ان پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ اب وہ مستقل پاکستان آ جائیں۔ اس روز ڈاکٹر خان کی والدہ زلیخا بیگم کو جب معلوم ہوا کہ ان کے فرزند کی پاکستان کو ضرورت ہے مگر وہ ماحول سے متنفر ہو کر واپسی کا ارادہ کر رہا ہے تو ممتا کرب سے بولی:

"قدیر بیٹے! کب تک مجھ سے دور رہو گے۔ اب زیادہ انتظار نہ کراؤ میرے لعل۔ صرف مجھے ہی نہیں ...... اس وطن کی لاکھوں ماؤں کو تمہارا انتظار ہے"۔

ڈاکٹر خان نے یکدم ان کی طرف دیکھا۔ مامتا ان سے بہت کچھ کہہ گئی تھی ۔ماں نے ہونہار سپوت کے سر پر جنت کی چھاؤں جیسا ہاتھ رکھ کر کہا۔" کیا پاکستان میں لوگ روٹی نہیں کھاتے ؟ تم بہت عرصہ مجھ سے دور رہ چکے ہو۔ اب میرے پاس ہی رہو"۔

غیر جذباتی سائنسی کلیات اور پیچیدہ مشینوں میں جوانی کا بہترین دور بسر کرنے والے کوہ ہمالیہ جیسے ڈاکٹر خان کا دل یہ سنتے ہی بارش میں بھیگی ہوئی چڑیا جیسا ہوگیا۔ دل و دماغ پر ایک لمحہ کے لئے کتنے طوفان گزر گئے ان کو اپنا آپ ایک ایسا قلعہ لگ رہا تھا جس کے اندر چاروں طرف بس اسی ایک آواز کی بازگشت آرہی ہو۔" اب میرے پاس رہو"۔

ڈاکٹر خان نے ایک گہرا سانس لیا اور خود کو نارمل کرنے کی کوشش میں بولے۔" اماں! آپ کا حکم سر آنکھوں پر! نوکری مل گئی تو یہیں رہوں گا"۔

یہ سنتے ہی ماں کا چہرہ دمک اٹھا اور انہوں نے کہا۔" بس تو سمجھو تمہیں نوکری مل گئی"۔

ڈاکٹر خان نے اپنی بیگم سے مشورہ کیا تو انہوں نے بھی والدہ کی خواہش کا احترام کرنے کے لئے کہا اور جب ڈاکٹر خان نے وزیراعظم پاکستان کو فون پر اطلاع دی کہ وہ ہالینڈ واپس نہیں جارہے بلکہ انہوں نے ان کی پیش کش قبول کرلی ہے تو ذوالفقار علی بھٹو خوشی سے چہک اٹھے اور جوش سے کہا

"I WILL SEE THE HINDU BASTARDS NOW"

بھٹو نے ڈاکٹر خان کو ہدایت کی کہ وہ اس معاملے میں ایٹمی توانائی کمیشن کی رہنمائی کریں گے جہاں انہیں بطور ایڈوائزر متعین کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر خان ہالینڈ میں اس وقت کے کرنسی ریٹ کے حساب سے 30 ہزار پاکستانی روپے تنخواہ لیتے تھے جبکہ وہ پاکستان کی خاطر صرف تین ہزار پر نوکری کرنے کے لئے تیار ہوگئے۔ انہیں نوکری کنٹریکٹ مئی 1976ء میں دیا گیا اور یوں انہیں پہلی تنخواہ جون 1976ء میں ملی۔ یہ منیر احمد خان کی شرارت کی کھلی مثال ہے جیسا کہ یکم جولائی کے روزنامہ جنگ میں آغا شاہی صاحب نے انٹرویو میں کہا ہے کہ منیر احمد خان ڈاکٹر خان کو بھگانے کی پوری کوشش کررہے تھے اور راستہ میں ہر قسم کی مشکلات ڈال رہے تھے۔ انہیں کم تنخواہ دلوانا ان کی بدنیتی کا ثبوت تھا۔

"نوکری کے معاہدے پر"

ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے جنوری 1976ء ہی میں ایف ڈی او کو اپنا استعفیٰ بھیج دیا تھا اور اس کا سبب ذاتی وجوہ قرار دیا تھا۔ ایف ڈی او ڈاکٹر خان کو فارغ کرنے کے حق میں نہ تھی لیکن ڈاکٹر خان کے اصرار پر اسے ان کا استعفیٰ منظور کرنا پڑا۔

ایف ڈی او کو یقین تھا کہ ڈاکٹر خان اپنے تجربے اور مہارت سے پاکستان ایسے پسماندہ ملک کو ایٹمی طاقت سے مستفید نہیں کرسکیں گے کیونکہ امریکہ جیسی سپر طاقت بھی جوہری ہتھیاروں کی تیاری یا اس کے پرامن استعمال کے سلسلے میں دوسری جنگ عظیم کے فوراً بعد سے کام شروع کرنے کے باوجود سینٹری فیوج نظام کی اختراع سے قاصر تھی۔

انہی دنوں جب بیگم ہنی خان چند امور نپٹانے کے لئے ہالینڈ آئیں تو ان کے ایف ڈی او کے ساتھیوں نے ان سے رابطہ کیا اور انہیں سمجھانا چاہا کہ ان کے شوہر اپنے مستقبل کے بارے میں غلط فیصلہ کررہے ہیں۔ لہٰذا وہ ان پر دباؤ ڈال کر انہیں دوبارہ ہالینڈ لے آئیں مگر بیگم ہنی خان نے دوٹوک جواب دیا۔" میرے شوہر کا دماغ بکا ؤ مال نہیں۔ میں ان کی شریک حیات ہوں۔ ان کو ان کے فیصلے اور ارادے سے باز نہیں رکھ سکتی کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ وہ انتہائی خوددار، مستقل مزاج اور درست فیصلہ کرنے والے انسان ہیں"۔

" مگر! آپ خود سوچیں کہ ڈاکٹر خان جیسا زرخیز ذہن ایک ایسے پسماندہ ملک میں کیا کرے گا جہاں سلائی مشین کی سوئی، بچے کا کھلونا اور لپ اسٹک بھی مغرب کی فنی یا مالی امداد کے بغیر تیار نہیں ہوسکتے؟" ان لوگوں نے بیگم ہنی خان کو باور کرانے کی کوشش کی۔

" میرے شوہر اپنے ذہن کی زرخیزی سے پاکستان کی پسماندگی دور کردیں گے۔ جس طرح آپ کو یقین ہے کہ ڈاکٹر خان انتہائی قابل اور محنتی ہیں، وہ جس کام میں ہاتھ ڈال لیں اسے پایہ تکمیل تک پہنچا کر دم لیتے ہیں، تو پھر آپ یہ امید کیوں نہیں رکھتے کہ وہ اپنے ملک میں سائنسی اور فنی انقلاب بھی لاسکتے ہیں"

ایف ڈی او ایک ماہر اور ممتاز فلز شناس سے محروم ہونے پر افسردہ تھی چنانچہ جب ڈاکٹر خان رخصت ہوئے تو انہیں ایف ڈی او نے درج ذیل سرٹیفکیٹ دیا۔

"وہ (ڈاکٹر خان) نہایت لائق اور عمدہ انجینئر ہیں اور اپنے رفقاء کار میں بے حد مقبول ہیں۔ انہوں نے یورپی اقوام کی یونین آف انڈسٹری، ڈچ فیڈریشن آف انڈسٹریز اور بعض عالمی کانفرنسوں میں ایف ڈی او اور وی ایم ایف کی نمائندگی کی ہے"۔

بیگم ہنی خان کو اور ڈاکٹر خان کے رفقاء نے کئی تحائف پیش کیے۔ حتیٰ کہ ایف ڈی او نے سامان وغیرہ باندھنے اور گھریلو اشیاء کے ضمن میں بھی ان کی بے حد مدد کی۔

ڈاکٹر خان کے ایک ولندیزی دوست کو ان کے الگ ہونے پر بہت افسوس ہوا تھا مگر اس نے کہا تھا: "مجھے خوشی ہے کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو پاکستان میں ایک عمدہ ملازمت مل گئی ہے۔ میں تو کئی برس سے اصرار کر رہا تھا کہ وہ واپس پاکستان جا کر اپنے ملک کی خدمت کرے، وہاں اس کا مستقبل ہالینڈ سے بہتر ہوگا"

ایک اور ولندیزی دوست ڈاکٹر السٹر نے انہیں لکھا۔

"ایف ڈی او میں جس شخص کا بھی آپ سے واسطہ پڑا بی وی ڈی (ہالینڈ کی خفیہ پولیس) نے اس سے پوچھ گچھ کی ہے۔ اگر آپ کو الٹرا سینٹری فیوج کے بارے میں کوئی پوشیدہ معلومات حاصل ہوئی ہیں تو ان کے ذمہ دار ہالینڈ والے ہیں۔ ہر شخص کو آپ کی قابلیت کا علم تھا اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ آپ مستقل طور پر ہالینڈ میں آباد ہونا چاہتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ نے صرف علم حاصل نہیں کیا بلکہ اپنے فنی علم کی بدولت اس میں کئی گنا اضافہ کیا ہے اور کئی مشکل مسائل کو حل کرنے میں مدد بھی دی"۔

بہر حال 8 مارچ 1976ء کو جب ڈاکٹر خان کی اہلیہ اپنا ساز و سامان سمیٹ کر پاکستان واپس پہنچیں تو یورپ سے ڈاکٹر خان کے وہ خوشگوار تعلقات اپنے اختتام کو پہنچے جن کا آغاز اگست 1961ء میں ہوا تھا۔ اب یہ تعلقات ایک نیا رخ اختیار کرنے والے تھے اور ڈاکٹر خان نے اپنی زندگی کے نئے سفر کا آغاز کیا جو نہ صرف ان کی بلکہ پاکستان کی عظمت و رفعت کا سفر تھا۔

ڈاکٹر خان نے اٹامک انرجی کمیشن میں باقاعدہ شمولیت اختیار کر لی تھی اور اپنے فرائض ادا کرنے لگے مگر چند ہی ہفتے بعد انہوں نے بھانپ لیا کہ کمیشن کے ذمہ دار اس معاملہ میں سنجیدہ نہیں ہیں اور ہر چیز پی ڈبلیو ڈی کی طرز پر چل رہی ہے اور ہر کاغذ منیر احمد خان سے انگوٹھا لگوانے کے لئے بھیجا جاتا ہے تو وہ اس دفتری طریقہ کار سے متنفر ہو گئے اور باتوں ہی باتوں میں اپنی مایوسی کا اظہار کرنے لگے تھے۔ انہوں نے ایک خط منیر اور ایک وزیر اعظم کو لکھا۔ وزیر اعظم پاکستان کو ان باتوں کی بھنک پڑ گئی۔ انہوں نے بریگیڈیر زاہد علی اکبر سے تصدیق کرائی تو انہیں ڈاکٹر خان کی سچائی اور بے قراری کا یقین آ گیا۔ انہیں یہ اطلاع بھی ملی کہ ڈاکٹر خان مایوس ہو کر ہالینڈ واپس جانے کا سوچ رہے ہیں۔ یہ سن کر ذوالفقار علی بھٹو برہم ہو گئے اور ڈاکٹر خان کو ملاقات کے لئے بلایا۔ اس موقع پر ڈاکٹر خان نے تحریری طور پر ذوالفقار علی بھٹو سے کہا کہ کہوٹہ پراجیکٹ کو اٹامک انرجی کمیشن سے الگ کر دیا جائے کیونکہ موجودہ صورت میں ان کے لئے کام کرنا ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔ تب بھٹو مرحوم نے اسے اپنے دل کی آواز خیال کیا اور کوئی وقت ضائع کئے بغیر اس تجویز کو منظور کر لیا اور یوں 31 جولائی 1976ء کو "انجینئرنگ ریسرچ لیبارٹریز (ERL)" (پراجیکٹ 706) کے نام سے اس خود مختار ادارہ کا قیام عمل میں لایا گیا جس کا سرکاری نام اب "ڈاکٹر اے کیو خان ریسرچ لیبارٹریز" ہے جو جنرل ضیاء نے یکم مئی 1981ء کو ڈاکٹر خان کی خدمات کے انعام میں کیا۔

ڈاکٹر خان کے پراجیکٹ کو خود مختار بنانے کے بعد ذوالفقار علی بھٹو نے انہیں ایک شام اپنے پاس بلایا اور کہا۔ "مسٹر خان! میں نے آپ کو مایوس نہیں کیا۔ امید ہے آپ بھی مجھے مایوس نہیں کریں گے"۔ اس بات کی تصدیق مولانا کوثر نیازی مرحوم کی کتاب "اور لائن کٹ گئی" سے بھی ہوتی ہے جس میں لکھا ہے۔ "ڈاکٹر خان نے یقین دلایا کہ صرف چھ سات سال میں وہ پاکستان کو ایٹمی توانائی کے میدان میں عالمی طاقتوں کے مقابل لا کھڑا کریں گے۔ بھٹو صاحب کو ان پر پورا بھروسہ تھا۔ اس لئے نہیں کام کرنے کی مکمل آزادی بھی دے دی گئی"۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خان آزاد اور خود مختار ہوئے تو بے حد مسرور دکھائی دینے لگے۔ وہ بار بار کہتے۔ "اب انشاء اللہ میں ناممکن کو ممکن بنا کر دم لوں گا"۔

جب کوئی ان سے پوچھتا۔ "سر کون سا ناممکن کام؟"

جواب دیتے۔ "پاکستان کے جھکے ہوئے سر کو بلند کرنے کا کام"

ڈاکٹر خان نے ایٹمی پلانٹ کے لئے اپنی حکمت عملی پہلے سے تیار کر رکھی تھی اور اب اس پر مرحلہ وار کام کر رہے تھے۔ انہوں نے ایٹمی پلانٹ کے لئے موزوں جگہ کی تلاش اس منصوبے کو ایٹمی توانائی کمیشن سے الگ کیے جانے سے دو تین ماہ پہلے ہی شروع کر دی تھی اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس سلسلے میں کئی جگہیں دیکھ چکے تھے۔ ہری پور تربیلا، حسن ابدال، کیمبل پور، فتح جنگ، بنوں، کوہاٹ اور سرگودھا کے نام زیر غور آئے اور ان علاقوں کا تفصیلی

فضائی جائزہ بھی لیا گیا۔ آخر تمام پہلوؤں پر تفصیلی غور و خوض کے بعد کہوٹہ کو اس اعزاز کے لئے چن لیا گیا۔ واضح رہے کہ سہالہ، نیلور اور کہوٹہ پر مشتمل اس خوبصورت وادی میں کہوٹہ ایٹمی پلانٹ کے علاوہ پاکستان اٹامک انرجی کمیشن کا ممتاز ادارہ پنٹیک اور کئی دوسرے قومی مفادات کے ادارے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ چنانچہ اس علاقہ کو عالمی حلقوں میں اب ''ایٹمی پارک'' کا نام دیا جانے والا ہے۔

ایٹمی پراجیکٹ کو انتہائی خفیہ رکھنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر خان نے ذوالفقار علی بھٹو سے درخواست کی کہ انہیں آرمی کور آف انجینئرز کی ایک ٹیم دے دی جائے جو پلانٹ کی تنصیب و تعمیر میں ان کی مدد کرے تاکہ کام کو تیزی سے اور خفیہ طور پر پایہ تکمیل تک پہنچایا جا سکے۔ اگرچہ اس منصوبہ کو مربوط انداز میں آگے بڑھانے کے لئے ایک سپیشل ورکس آرگنائزیشن پہلے ہی ترتیب دی جا چکی تھی۔ جو راولپنڈی میں ایک عام سی جگہ 169 کنٹسن روڈ پر واقع ہے۔ لیکن ڈاکٹر خان کے کہنے پر اس سلسلے میں خصوصی اقدامات کئے گئے۔

اس عظیم پراجیکٹ میں پاکستان کی سلامتی و بقا تھی لہٰذا وزیر اعظم نے پاک فوج کے سربراہ جنرل محمد ضیاء الحق (سابق صدر پاکستان) اور دیگر اعلیٰ فوجی حکام کی ایک خفیہ میٹنگ بلائی اور ایٹمی پراجیکٹ کو خفیہ رکھنے کے لئے مختلف پہلوؤں پر غور کیا گیا۔ میٹنگ میں فوج کے سربراہ نے ڈاکٹر خان کو یقین دلایا۔ ''خان صاحب! آپ جیسا چاہیں گے، ویسا ہی ہو گا''۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے اپنی ضروریات بیان کیں جس کے بعد جنرل ضیاء الحق نے بریگیڈیئر زاہد علی اکبر (سابق چیئرمین واپڈا) کی خدمات ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے حوالے کر دیں جو اپنے کام کے ماہر اور نہایت مردم شناس تھے۔ اس کے ساتھ کرنل سجاول اور کرنل محمود جیسے محنتی، فعال اور پرخلوص لوگوں پر مشتمل ٹیم بھی ان سے منسلک کر دی۔ ڈاکٹر خان نے انہیں منتخب علاقہ دکھایا اور چند ہی ہفتوں میں وہ زمین سرکاری تحویل میں لے لی گئی۔ شروع میں سوا ایکڑ اراضی حاصل کی گئی تھی جس کے مالکان کو بہت معقول معاوضہ دیا گیا تھا۔ یہ کام اکتوبر 1976ء کے اختتام تک مکمل ہو چکا تھا۔

اس کے بعد تو ڈاکٹر خان میں جیسے برقی رو دوڑنے لگی۔ وقت اور ان کے درمیان مسابقت شروع ہو گئی۔ انہوں نے مجوزہ عمارت کے خاکے بریگیڈیئر زاہد علی اکبر کے حوالے کئے۔ انہوں نے لاہور کے ایک آرکیٹکٹ ڈاکٹر اقبال وہلہ سے تفصیلی نقشہ جات تیار کرائے اور مارچ 1977ء میں پلانٹ کی تعمیر کا کام شروع کر دیا گیا۔

کہوٹہ لیبارٹریز کی عملی شکل واضح کرنے کے لئے اس کے تعمیراتی ڈیزائنوں کا مسئلہ پیش آیا تو قرعہ لاہور کے ڈاکٹر محمد اقبال وہلہ کے نام نکلا جو تعمیراتی ڈیزائنوں میں بے مثال ہنر کے حامل سمجھے جاتے تھے۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے مشورے اور ملٹری انجینئرنگ سروس نے اس دوران کئی معتبر انجینئرز کے بارے میں غور و خوض کیا تھا۔ بالآخر ڈاکٹر محمد اقبال وہلہ کہوٹہ پراجیکٹ کے کنسلٹنٹ منتخب ہو گئے۔

کہوٹہ پراجیکٹ کی تعمیر ایک اعزاز بھی تھا۔ انجینئر ڈاکٹر محمد اقبال وہلہ اپنے اس انتخاب اور پاکستان کے ایٹمی پراجیکٹ کے علاوہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی خدمات اور ولولے کے نقوش واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں:

یہ 1976ء کے موسم گرما کی ایک خوشگوار صبح تھی۔ کرنل سکندر حیات خان جو اب جنرل ہیں اور پرائم منسٹر کے مانیٹرنگ سیل کے چیئرمین ہیں ان دنوں ملٹری انجینئرنگ سروس (ایم ای ایس) لاہور کے چیف انجینئر تھے۔ میرے ایک دوست ریاض محمود میرے دفتر آئے۔ انہوں نے بتایا کہ ایک اعلیٰ اختیاراتی فوجی ٹیم لاہور آ رہی ہے جو ایک بہت بڑے پراجیکٹ کے کنسلٹنٹ کا انتخاب کرے گی۔ آپ سے ملاقات ممکن ہے۔ مجھے خوشی ہوئی اور میں اس دوست کے ہمراہ کرنل کے دفتر گیا۔

ہماری ملاقات بے حد خوشگوار ہی اور متذکرہ ٹیم سے ملاقات طے کر لی گئی۔ توقع کے مطابق ایک روز فوجی ٹیم میرے دفتر آئی۔ میں نے پیشہ وارانہ پریکٹس کا آغاز کیا ہی تھا اور ایک چھوٹا سا ادارہ قائم کر لیا تھا۔ ہنرمند اور مستعد نوجوانوں کی فوجی ٹیم نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ یہ ایک ایسی ملاقات تھی جس میں گفتگو بہت کم ہوئی زیادہ وقت مشاہدے اور تحقیق و تفتیش میں صرف ہوا میرے لئے یہ تجربہ نیا بھی تھا اور انوکھا بھی۔ زاہد صاحب میرے سامنے ایک کرسی پر بیٹھے چپ چاپ چھت کی طرف دیکھتے رہے۔ ان کے ساتھی دونوں نوجوان فوجی افسروں نے میرے دفتر کے سامان کا جائزہ لیا۔ الماریوں درازوں میں سامان کی چھان بین کی۔ اس دوران زاہد صاحب نے میرے ساتھ کوئی بات نہیں کی۔ میں سسپنس اور تحیر کے عجیب و غریب احساس تلے دبا جا رہا تھا کہ دونوں افسر اپنا ''کام'' مکمل کر کے ''سب ٹھیک ہے سر'' کا اعلان کر کے ہمارے قریب آ کر بیٹھ گئے۔

بریگیڈیئر زاہد نے کہا ''ہم آپ کے ساتھ لاہور میں آپ کے تعمیر کردہ منصوبوں کا جائزہ لینے چلیں گے''۔

جب ہم مطلوبہ منصوبوں کے معائنے کے لئے جا رہے تھے تو بریگیڈیئر زاہد نے مجھے راستے میں بتایا۔

''ممکن ہے آپ کو ایک انتہائی اہم تعمیراتی منصوبے کی ذمہ داری تفویض کی جائے۔ یہ لوگ اس کا ابتدائی جائزہ

لے رہے ہیں۔ ممکن ہے آپ کو ذمہ داری سونپ دی جائے یہ انتہائی اہم اور حساس پراجیکٹ ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کو یہ ذمہ داری نہ دی جائے اور اگر آپ ہی کے نام قرعہ فال نکلتا ہے تو یہ ایک بہت بڑا چیلنج ہوگا"۔

جب یہ ٹیم میرے مکمل کردہ منصوبوں کا جائزہ لے چکی تو بظاہر اس کے تاثرات حوصلہ افزاء تھے۔ تاہم انہوں نے مجھے اپنے پراجیکٹ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

بریگیڈیئر زاہد نے مجھے واپسی پر کہا "ڈاکٹر صاحب میں متعدد کنسلٹنٹ کمپنیوں کے دفاتر گیا ہوں تاکہ اس حساس منصوبے کے لئے صحیح معنوں میں پوری طرح اہل اور باصلاحیت لوگ میسر آسکیں۔ مختصراً یہ کہ میں یہ عظیم کام آپ کی کمپنی ہی سے لینا چاہتا ہوں مگر ہم اس پراجیکٹ کے بارے میں ایک لحہ تاخیر برداشت نہیں کر سکتے"۔

کسی بھی سچے پاکستانی کے لئے پاکستان کے دفاع کے عظیم پراجیکٹ کی تعمیر کا اعزاز قابل صد فخر و انبساط ہی ہوسکتا ہے۔ یادگار پراجیکٹ کے تعمیر کنندہ کا نام بھی تاریخ میں یادگار کی حیثیت اختیار کر سکتا ہے۔ بنا بریں مجھے اس پر فخر کے ساتھ ساتھ خوشی بھی ہوئی۔

میں نے اس پیشکش پر بریگیڈیئر زاہد سے کہا "سر! مجھ ایسے عام پاکستانی انجینئر کو اس قابل سمجھا گیا اس پر غیر معمولی مسرت ہوئی ہے۔ تاریخ میں جس کا نام رہے گا اسے خوشی تو ہوگی مگر براہ کرم! یہ تو بتائیں! آپ لوگوں کی نظر انتخاب مجھ پر ہی کیوں پڑی"۔

انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں اطمینان کے ساتھ کہا "تین وجوہ کی بنا پر

(1) آپ اس کام کے لئے وطن عزیز کے سب سے زیادہ کوالیفائیڈ انجینئروں میں سے ایک ہیں۔

(2) ہم نے پورے ملک کی انجینئر برادری کا جائزہ لیا آپ ہی ایک ایسے انجینئر ہیں جو ٹھیکیداروں کو غیر ضروری طور پر منہ نہیں لگاتے۔

(3) ہمیں یقین ہے کہ آپ اس چیلنج سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

پراجیکٹ کے ڈیزائنر اور بلڈرز کی حیثیت سے یہ فریضہ انجام دینے کا ایک قابل فخر اعزاز تو ابتداء میں ہی حاصل ہو گیا۔ جب میرا تعارف پاکستان کے عظیم سپوت ڈاکٹر عبدالقدیر خان سے ہوا۔ مجھے زندگی میں لاتعداد انجینئروں اور سائنس دانوں سے ملاقات کا موقع ملا مگر ڈاکٹر قدیر کی بات ہی کچھ اور ہے۔ ہمیشہ مطمئن و مسرور رہتے ہیں۔ ان کے چہرے پر گھبراہٹ کام کی زیادتی یا اضطراب کے کبھی آثار دیکھنے میں نہیں آتے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی گتھیاں سلجھا رہے ہوں تو ایسے لگتا ہے جیسے کوئی لوسٹوری سنا رہے ہوں۔

جب انجینئر زکور کے جوانوں نے ایک تاریخی سنگ میل نصب کرنے کے لئے پہلا تیشہ چلایا تو اس وقت کہوٹہ کے اس حصہ میں خاص آبادی نہیں تھی۔ صرف چند ورکشاپ نما بیرکیں تھیں جو محدود مقاصد کے لئے مجبوری کی حالت میں آخری ترجیح کے طور پر استعمال کی جاتی تھیں مگر جونہی اس علاقہ کا انتظام انجینئر زکور کے جوانوں نے سنبھالا گویا اسکی قسمت ہی بدل گئی۔

کہوٹہ پلانٹ کے لئے مخصوص اراضی کے گرد فوج کے جوانوں نے رات دن ایک کر کے چند ہی دنوں میں 8 فٹ اونچی چار دیواری تعمیر کر دی اور اس پر آہنی باڑ بھی لگا دی۔ یہ دیوار مروجہ طریقہ کار کے مطابق ابتدائی کام کے طور پر تعمیر کی گئی تھی۔ اس وقت ڈاکٹر عبدالقدیر خان اپنے پراجیکٹ کو لیکر اس طرف منتقل نہیں ہوئے تھے لیکن ادھر بی بی سی نے ایک رات یہ رپورٹ نشر کر دی۔

"کہوٹہ کے اس علاقہ میں پانی اور بجلی کی فراہمی کے لئے خصوصی انتظامات کئے گئے ہیں۔ یہاں سینکڑوں لوگ رات دن کام کر رہے ہیں حتیٰ کہ جمعہ کو بھی چھٹی نہیں ہوتی۔ یہاں سخت حفاظتی انتظامات کئے گئے ہیں اور لوگوں کو خبردار کر دیا گیا ہے کہ وہ یہاں سے گذریں تو اپنی شناخت کرائیں۔ دیوار پر جگہ جگہ یہ عبارت لکھی ہے۔ "یہ فوجی ورکشاپ ہے" اس کے باہر پرانی فوجی گاڑیاں کھڑی ہیں تاکہ معلوم نہ ہو سکے کہ پاکستان یہاں اتنا اہم کارخانہ لگا رہا ہے"۔

قسط نمبر 13

"تمہارے شوہر نے ہمارے شوہر چھین لئے"

بیگم ہینی خان کہوٹہ کی پہلی اینٹ رکھنے میں شامل تھیں۔ وہ اپنے وعدہ پر قائم تھیں انہوں نے اپنے شوہر کے شانہ بشانہ پاکستان کی خاطر اپنے دن رات تیاگ دیئے۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ 1976ء کے آخر میں کہوٹہ پلانٹ کے منصوبہ پر عمل درآمد کے لئے متعلقہ علاقے کی زمین ہموار کی جانے لگی تو مسز ہینی خان ان چند لوگوں میں سے تھیں جو وہاں گاہے بگاہے جاتے تھے۔ اس وقت وہاں بلڈوزر چلانے اور مٹی ڈھونے والوں کو قطعاً علم نہیں تھا کہ وہ کتنے اہم کام کا آغاز کر رہے ہیں اور ان کے ہاتھوں سے کتنی عظیم اور شاندار کامیابی کی راہ ہموار ہو رہی ہے۔ اس وقت کو یاد کرتے ہوئے بیگم ہینی خان نے ایک بار کہا تھا۔

"اس وقت ہم وہاں آم کے بڑے تناور اور گھنے سایہ دار درخت کی خوب تعریف کرتے تھے۔ یہ درخت اب بھی وہاں ہے اس سے ہر سال پھل اتار دیا جاتا ہے البتہ اب اس درخت کے اردگرد کا ماحول بدل گیا ہے"۔

ڈاکٹر قدیر خان نے پراجیکٹ کی تعمیر میں بیوی اور بچوں کو بھی فراموش کر دیا تھا۔ وہ اٹھارہ بیس گھنٹے تک اس عظیم منصوبے کے ساتھ جاگتے رہتے۔ کبھی کبھار تو انہیں گھر لوٹنا بھی نصیب نہ ہوتا۔ بیگم ہینی خان اس بارے میں کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لاتیں اور ایثار و قربانی کرتی رہیں۔

ان دنوں بیگم ہینی خان پر یرقان کا حملہ ہوگیا اور وہ بیمار پڑ گئیں لیکن ڈاکٹر خان شدید خواہش اور کوشش کے باوجود ان کی ذاتی طور پر تیمارداری نہ کر سکے دونوں بچیوں دینا اور عائشہ کی عمر اس وقت بالترتیب سات اور پانچ سال کی تھی عموماً ایسا ہوتا کہ بچیاں اپنے باپ کا انتظار کرتے کرتے سو جاتیں یا ڈاکٹر خان علی الصبح سوتے میں ہی ان کو محبت بھرا بوسہ دے کر رخصت ہو جاتے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بچیاں اپنے باپ کی کمی شدت سے محسوس کرنے لگی تھیں ان کی عمر بھی اتنی نہیں تھی کہ حقائق سے آگاہ کیا جاتا تو وہ اس کو محسوس کر سکتیں۔

بیگم ہینی خان اس وقت کو یاد کرتے ہوئے کہتیں "پھر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا معاملات خود بخود طے ہوتے گئے۔ میں نے صورتحال کو قبول کرنا سیکھا اور بچیوں نے بھی شاید بے ربط معمولات سے سمجھوتہ کر لیا۔ ہمیں احساس ہوگیا تھا کہ پاکستان کے مفادات کی خاطر ہمیں کیا قربانی دینی ہے"۔

ڈاکٹر خان تو اپنے پراجیکٹ کے کاموں میں مشغول تھے لیکن ادھر ان کی شریک حیات گھر میں تن تنہا رہتی تھیں سیکورٹی کے سخت انتظامات کے باعث دوسرے لوگوں سے ان کا ملاپ تقریباً ناممکن تھا اور خود کسی کے گھر نہیں جا سکتی تھیں اور کسی دوسرے کا ان کے گھر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس زمانے میں وہ اگر کسی سے ملاقات کرتی تھیں تو وہ پراجیکٹ پر کام کرنے والے بعض افسران کی بیویاں ہی تھیں۔ ان میں سے بعض تو کبھی کبھار ازراہ تفنن انہیں یہ کہہ دیتیں۔

"آپ کے شوہر نے ہم سے ہمارے شوہر چھین لئے ہیں"۔

یہ سن کر ہینی خان کہتیں "آپ سے آپ کے شوہر چھیننے والا خود اپنی بیوی سے بھی دور ہوگیا ہے"۔

سانپوں کے گھر میں ایٹم کی تلاش

دنیا بھر میں جتنے سائنسی منصوبوں یا بڑے پراجیکٹ پر کام ہوتا ہے پہلے ان کا تخمینہ لگایا جاتا ہے پھر لیبارٹری کی سطح پر نمونے (ماڈل) بنائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد پائلٹ پلانٹ کام شروع کرتے ہیں اور پھر جا کر وسیع صنعتی پیمانہ پر عمل درآمد ہوتا ہے لیکن تقدیر نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو ایک اچھوتا شاہکار بنا دیا تھا۔ انہوں نے کہوٹہ پلانٹ کے تمام منصوبوں پر بیک وقت کام شروع کر کے سب کو ورطہ حیرت میں مبتلا کر دیا تھا۔ یعنی ایک طرف بڑا پلانٹ تیار ہو رہا تھا تو ادھر لیبارٹری میں اسکے تجربات بھی جاری تھے۔ گویا ڈاکٹر خان نے کہوٹہ کی ساری ٹیم میں ایک کُنبہ کی روح پھونک دی تھی کہ سب شب و روز اپنے کام میں مست تھے۔

ایٹمی منصوبے کے لئے کہوٹہ کی جگہ کا تعین کرنے سے پہلے اس منصوبے کے ابتدائی دفاتر اسلام آباد ائرپورٹ کے پرانے رن وے (چکلالہ) کے قریب فضائیہ کے ان گیراجز میں قائم کئے گئے تھے جو دوسری جنگ عظیم کی باقیات تھے ان سیل زدہ اور بوسیدہ کوارٹرز میں چمگادڑوں، بچھوؤں اور دوسرے حشرات الارض کے ڈیرے تھے۔ ان دفاتر کی صفائی کے دوران روزانہ یہاں زہریلے سانپ برآمد ہوتے تھے۔ گویا یہ علاقہ سانپوں کا گھر تھا لیکن جب ڈاکٹر خان کو اس پراجیکٹ کا نگران اعلیٰ بنایا گیا تو گویا انقلاب آ گیا۔ جس کمرے میں پہلے لیبارٹری قائم کی گئی وہاں سے بھی روزانہ سانپ نکلتے جنہیں مار دیا جاتا۔ ڈاکٹر خان نے آتے ہی سب سے پہلے لیبارٹریز کے لئے درکار سامان منگوایا اور نئے عملے کی بھرتی ہونے لگی تاکہ کام کو تیز کیا جا سکے۔ عین ان دنوں جب انجینئرنگ ریسرچ لیبارٹریز کی بنیادیں رکھی جا رہی تھیں وہاں پہلی سینٹری فیوج بنانے کا کام جاری تھا۔ ڈاکٹر خان سہالہ میں تجرباتی پلانٹ کی تیاریاں کر رہے تھے اور ساتھ ساتھ کہوٹہ پلانٹ کے نقشے تیار ہو رہے تھے۔

بالآخر 1978ء کے وسط میں منصوبہ ایک نازک موڑ پر آ گیا جب لیبارٹری میں سینٹری فیوج کے تحت یورینیم کو افزودہ کرنے کا تجربہ کامیاب ہوگیا۔ چنانچہ تجرباتی پلانٹ پر کام تیزی سے ہونے لگا اور ایک سال کے مختصر عرصہ میں یہ کام مکمل ہوگیا۔ کہوٹہ پلانٹ اس کی اساس پر ڈیزائن کیا جاتا تھا۔

کریش پروگرام

ڈاکٹر خان ہر محاذ پر یکساں مصروف ہو گئے تھے۔ کہوٹہ پلانٹ کا بنیادی ڈیزائن تیار ہوا' ادھر انہوں نے پہلی سینٹری فیوج تیار کر ڈالی۔ ان دنوں ڈاکٹر خان ایک گمنام سپاہی تھے وہ کسی کو اپنا تعارف نہیں کراتے تھے اور اپنی تمام صلاحیتیں تندہی اور سرفروشی کے ساتھ استعمال کر رہے تھے۔ وہ ایک پرانی سی پک اپ پر چپ چاپ سالخوردہ دفتر میں آتے اور سنجیدگی سے امور انجام دیتے۔ ان کے اکثر ساتھی ان کے درویشانہ طرز زندگی پر نہ صرف حیران بلکہ بعض اوقات بہت پریشان ہو جاتے تھے۔ بہرحال وہ بھی یہ بات تسلیم کرتے تھے کہ ڈاکٹر خان کوئی غیر معمولی شخصیت ہیں جو کسی ہمالہ کو سر کرنے کے لئے ہر روز ایک قدم آگے بڑھ رہے ہیں۔

ڈاکٹر خان نے اس منصوبے کو انقلابی انداز میں منظم کیا۔ انہوں نے اچھے اور مخلص لوگوں کی تلاش شروع کر دی اور جہاں بھی انہیں کوئی جوہر قابل نظر آیا اسے اپنے پراجیکٹ میں لے آئے۔ انہیں حکومت کا مکمل تعاون اور حمایت حاصل تھی لہٰذا وہ بیرون ملک کام کرنے والے چند ذہین پاکستانیوں کو بھی واپس وطن بلانے میں کامیاب رہے۔ ان میں سے چار انگلستان' تین کینیڈا اور کچھ امریکہ میں اعلیٰ اور منفعت بخش عہدوں پر فائز رہے تھے۔ ان کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ سائنسدانوں اور انجینئروں کی ایک ایسی جماعت تیار ہوگئی جو نہایت فعال محنتی اور قابل ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی ترقی یافتہ جوہری شعبے میں پاکستان کو خود کفیل بنانے کا عزم رکھتی تھی۔

ڈاکٹر خان نے اپنے ہم خیال سائنسدان اکٹھے کرنے کے ساتھ ساتھ انجینئرنگ ریسرچ لیبارٹریز راولپنڈی میں سینٹری فیوج بنانے کا کام بھی جاری رکھا۔ وہ دنیا بھر سے ضروری ساز و سامان خریدتے اور منگواتے رہے تھے جبکہ سہالہ میں تجرباتی پلانٹ کی تنصیب اور کہوٹہ پلانٹ کے تفصیلی نقشے بھی تیزی سے تیار کرا رہے تھے۔

یہ وہ دور تھا جب دنیا نے پاکستان کو ایٹمی ری ایکٹر کے آلات مہیا کرنے بند کر دیئے تھے۔ ان حالات میں سینٹری فیوج جیسی جدید ٹیکنالوجی کے آلات کا حصول بہت مشکل دکھائی دیتا تھا۔ مگر ڈاکٹر خان اہل مغرب کے بارے میں ایک ٹھوس رائے رکھتے تھے۔ وہ کہتے تھے ''مغربی تاجر کی نفسیات ایک ایسے تاجر کی ہے جو اپنی ماں کو بھی فروخت کرنے کے لئے ہر لحہ تیار رہتا ہے اگر مناسب قیمت ادا کی جائے تو'' انہوں نے مغرب کی اس کمزوری سے بھرپور فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا اور کھلی منڈی سے مال کی خریداری کا اہتمام کرنے لگے۔

انہوں نے کسی بھی پرزے یا آلات کی خریداری کے باقاعدہ اجازت نامے حاصل کر کے خریداری کی۔ البتہ ہر ملک کے قانونی سقم کا بھی فائدہ اٹھایا مثلاً یورینیم کی افزودگی کیلئے پلانٹ کے اہم حصے ممنوع قرار دیئے گئے تھے اور کئی ممالک میں ان کی برآمد کے لئے قانون اور ضابطے بنائے گئے لیکن ان کے الگ الگ پرزوں کی برآمد پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ پاکستان نے افزودگی پلانٹ کے لئے نہایت منظم طریقے سے خریداری کا آغاز کیا اور اس کے ضروری حصے اور پرزے مختلف ملکوں کی تقریباً ایک درجن کمپنیوں سے خرید لئے۔

یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ اوائل 1979ء میں جب امریکہ نے سوئٹزرلینڈ پر بعض پرزوں کی سپلائی روکنے کے لئے دباؤ ڈالا اور اسے ایٹمی عدم پھیلاؤ کے معاہدے کی خلاف ورزی کا مرتکب ٹھہرایا تو سوئس حکومت نے اس پر شدید ردعمل ظاہر کیا اور امریکی الزامات مسترد کر دیئے اور کہا کہ پاکستان سے جو بھی سودے کئے گئے ہیں وہ قانون کے عین مطابق ہیں کیونکہ اس وقت اس کی دو بڑی فرموں CORA, VAT کے انجینئر اور نمائندے پاکستان میں مذاکرات میں مصروف تھے۔

بعض ذرائع کے مطابق کہوٹہ پلانٹ کے لئے خریداریوں کا آغاز اکتوبر 1975ء سے ہوگیا تھا۔ ابھی ڈاکٹر خان ہالینڈ ہی میں تھے کہ ان کی ہدایت پر برسلز کے پاکستانی سفارت خانہ نے ہالینڈ کی مشہور فرم سے ''ہائی فریکوئنسی انورٹرز'' کے بارے میں استفسار کیا۔ یہ انتہائی حساس برقیاتی آلات سنٹری فیوج کی گردش کو کنٹرول کرتے ہیں اور پاکستان نے بعد کے پانچ برسوں میں یہ کم از کم چار دوسرے ممالک سے بھی خریدے۔ دسمبر 1975ء کے آخر میں ڈاکٹر خان کی وطن واپسی پر اس بارے میں ایک کریش پروگرام پر عمل شروع ہوگیا۔ یہ خریداریاں زیادہ تر باقاعدہ سفارت کاروں کے ذریعہ کی گئیں جنہوں نے انہیں راز میں کبھی نہیں رکھا بلکہ آرڈر دیتے وقت واضح کر دیا کہ مطلوبہ اشیاء کس مقصد کے لئے درکار ہیں البتہ آخری دنوں میں اس ضمن میں کچھ احتیاط کی جانے لگی تھی۔

پہلا سودا سوئٹزرلینڈ کی معروف فرم ویکیوم اپارات ٹیکنیک سے ہوا۔ اس فرم سے سنٹری فیوج افزودگی پلانٹ کے لئے خصوصی ''ہائی ویکیوم والوز'' اور ''کورا انجینئرنگ'' سے سنٹری فیوج کو فلورائیڈ گیس فراہم کرنے والے یونٹ خریدے گئے۔ ان کمپنیوں نے اپنی حکومت سے اجازت لی تھی۔ یہ اشیاء انفرادی طور پر ''لندن کلب'' کی ممنوعہ

اشیاء کی فہرست میں شامل نہ تھیں اور یہ تمام یونٹ پاکستان پہنچانے کے لئے تین سی 130 ہرکولیس طیارے باقاعدہ چارٹر کئے گئے تھے۔

امریکہ نے جب سوئس حکومت پر اعتراض کیا تو ان کمپنیوں نے کہا" ہمارا ایٹمی ہتھیاروں سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہم جانتے ہیں کہ ایٹمی ہتھیار کس طرح بنتے ہیں۔ یہ سودا تو دراصل نٹ اور بولٹ کا تھا" سوئس حکومت نے امریکی اعتراضات کے باوجود پاکستان کو بعض خصوصی نوعیت کی ٹیوبیں اور عمدہ فولاد بھی فروخت کیا۔

70ء کے عشرے میں ہالینڈ ایٹمی تنصیبات کا مرکز بنا ہوا تھا اور دنیا بھر کی جدید ٹیکنالوجی یہاں کے ایٹمی منصوبے میں آزمائی جارہی تھی۔ ڈاکٹر خان نے اس جدید ٹیکنالوجی کے مرکز سے آلات اور پرزوں کی خریداری کے لئے اپنے ذرائع استعمال کئے۔ وہ کئی ایسے سپلائرز کو جانتے تھے جن سے ہالینڈ میں قیام کے دوران انہوں نے خصوصی مراسم قائم کر لئے تھے۔ ڈاکٹر خان کی بدولت ہی ان کی آجر فرم ایف ڈی او نے بھی بھاری تعداد میں کئی اشیاء پاکستان کو فروخت کیں جبکہ ایک دوسری فرم وی ڈی ٹی نے ساٹھ ہزار کے قریب خصوصی طور پر سخت کی گئی فولادی ٹیوبیں پاکستان کو مہیا کیں۔ ان کی آخری کھیپ ستمبر 1979ء میں پاکستان روانہ کی گئی۔

ڈچ حکومت نے امریکہ کو راضی کرنے کے لئے ان تمام فرموں پر دباؤ ڈالا جو پاکستان کو حساس آلات فروخت کر رہی تھیں۔ وی ڈی ٹی پر بھی ڈچ حکومت نے بہت دباؤ ڈالا مگر اس فرم نے یہ کہہ کر حکومتی دباؤ مسترد کر دیا کہ "ڈچ قانون کسی ایسی فروخت کی مخالفت نہیں کرتا لہذا اہم معاہدے کی رو سے پاکستان کو سامان مہیا کریں گے"۔

حکومتی دباؤ کے باوجود ہالینڈ کی فرموں نے ڈاکٹر خان کے ساتھ کئے تمام وعدے پورے کئے اور ایک ایسی ہی فرم نے المونیم ٹیوبیں بھی فروخت کر دیں۔ جبکہ 1977ء کے موسم بہار میں پاکستان نے خصوصی نوعیت کے مارجنگ سٹیل کا ایک اور آرڈر دیا تو ڈچ حکام اس سے آگاہ ہونے کے باوجود ان فرموں کو سپلائی سے نہ روک سکے۔

لندن سے شائع ہونے والے جریدے ایٹ ڈیز نے اس بارے میں لکھا کہ سینٹری فیوج کے نہایت اہم سازو سامان کے حصول کے لئے پاکستان نے کئی "نمائشی کمپنیاں" قائم کیں۔ برطانیہ، ایمسٹرڈیم اور مغربی جرمنی کے کئی شہروں اور قصبات میں سرگرم عمل نمائشی کمپنیوں میں سے کئی ایک نے فقط ایک بار خریداری کی۔ سامان پاکستان کے ہاتھوں فروخت کیا اور اپنا بستر بوریا لپیٹ لیا۔

اس اخبار کے مطابق پاکستان آرڈیننس سروسز کے ایک افسر اکرام الحق خان نے 11 جنوری 1977ء کو بون کے اہم مضافاتی قصبہ واشبرگ چیچ میں ایک دفتر قائم کیا جہاں سے یورپ بھر میں سینٹری فیوج کے سامان کا تانا بانا بندھ گیا۔ سب سے پہلا آرڈر ڈیڑھ کروڑ پونڈ کی مالیت کے 31 انورٹروں اور غیر منقطع سپلائی سنٹر کے لئے ایمرسن الیکٹرک انڈسٹریل کنٹرولز کو دیا گیا جو برطانیہ میں ایک امریکی کمپنی کا ذیلی ادارہ ہے۔ آرڈر مغربی جرمنی کی ایک فرم "ٹیم انڈسٹریز" کی معرفت دیا گیا تھا۔

یہ سامان اگست 1978ء میں "ویئر گیٹ لمیٹڈ سو ان سی" کی وساطت سے ڈائریکٹر جنرل سپیشل ورکس آرگنائزیشن راولپنڈی کو بھجوا دیا گیا۔ دریں اثنا ٹیم انڈسٹریز نے ایمرسن کو مزید سامان کا آرڈر دیا تھا جو مغربی جرمنی ریلوے کے ذیلی ادارہ شیرز ٹرانسپورٹ کے ہیتھرو پورٹ پر واقع دفتر کے توسط سے بذریعہ ہوائی جہاز راولپنڈی پہنچا دیا گیا۔

اکرام الحق خان میاں عبدالوحید سے مل کر کام کر رہے تھے۔ انہوں نے جرمنی کی ویکیوم ٹیکنالوجی کی معرفت فرم "لی بولڈ" سے ساٹھ لاکھ جرمن مارک کے عوض گیس کو پلانٹ میں پہنچانے والا پلانٹ خریدا جو سنٹری فیوج کا کلیدی حصہ ہوتا ہے۔ اس سامان کی برآمد کے لئے کسی خصوصی اجازت کی ضرورت نہ تھی اور کمپنی کے مالکان کے مطابق "یہ کہیں سے بھی خریدا جا سکتا تھا" جبکہ ایک اور کمپنی نے چار کروڑ مارک کا سامان فروخت کیا جس میں مواد اور پاکستان کی فراہم کردہ تصریحات کے مطابق ویلڈ کئے گئے المونیم کے دس ہزار کے لگ بھگ چھوٹے پرزے بھی تھے۔ اور ان میں سے کوئی آئٹم بھی ایٹمی کلب کی فہرست کے مطابق "ممنوعہ" نہیں تھا۔

دوسری جرمن فرموں نے بھی اس سلسلے میں اپنا حصہ ادا کیا اور جون 1978ء تک اکرام الحق خان کے چھوٹے سے دفتر کے ذریعہ ایک کروڑ دس لاکھ ڈالر کا سامان خریدا گیا۔

اخبار کے مطابق صرف ایک کمپنی نے اکرام الحق خان کے آرڈر کی تعمیل سے انکار کیا۔ یہ سٹاف آئن فیورجی ایم جی ایچ تھی۔ جرمنی کے شہر ڈوسل ڈورف میں واقع یہ کمپنی تابکار اور مستحکم آئسوٹوپ بنانے میں مہارت رکھتی ہے۔ ٹیم انڈسٹریز نے اسے یورینیم ہیکسا فلورائیڈ فراہم کرنے کے لئے کہا تو اس نے انکار کر دیا۔ یہ مرکب گیس سنٹری فیوج میں استعمال کی جاتی ہے۔ اس کمپنی کا ماسکو کی ٹیکنالوجی ایکسپورٹ سے تعلق ہے اور غالباً روسی روابط کی وجہ سے ہی اس نے اکرام الحق خان کی فرمائش پوری نہیں کی۔

فرانس سے یورینیم پلانٹ کے لئے خریداری بہت کم رہی۔ تاہم شمالی فرانس کے ایک ادارے سے سنٹری فیوج کے

لئے 10 ہزار بیلوز کی خریداری کا معاملہ خاصا دلچسپ رہا۔ کہا جاتا ہے کہ فرانسیسی کسٹم نے متعلقہ فرم کو اس آرڈر کی تعمیل نہ کرنے کا مشورہ دیا تھا لیکن اس نے مطلوبہ مال بیلجیئم کی ایک فرم کے ذریعے پاکستان بھجوا دیا۔

1977ء میں مسٹر بھٹو کی وزارت عظمیٰ کے آخری ایام میں بھی کہوٹہ پراجیکٹ کی رفتار پر کچھ اثر نہ پڑا کیونکہ غلام اسحٰق خان نے اس کی سرپرستی لے لی تھی۔

بھٹو کے بعد جنرل ضیاءالحق نے برسراقتدار آ کر پہلے ہفتے ہی میں اپنے بھتیجے عبدالوحید کو پراجیکٹ کے لئے جرمنی بھیجا۔ ''ایٹ ڈیز'' اخبار کے مطابق یہ چپکے چپکے خریداریاں کبھی منظر عام پر نہ آتیں اگر 1978ء کے آخر میں ایک صنعتی تنازع جنم نہ لے لیتا۔

اخبار کے مطابق ایمرسن سوڈن نامی فرم ستمبر 1978ء میں پاکستان کے تیسرے آرڈر کی تعمیل میں مصروف تھی۔ یہ آرڈر ایک سو ایک انورٹرز اور فاضل پرزوں کے لئے تھا۔ اسے 4 ستمبر سے شروع ہو کر چار ماہ کے اندر مکمل ہونا تھا مگر اس دوران کسی نے برطانیہ کے لیبر ممبر پارلیمنٹ فرینک الون کو ان انورٹرز کے آرڈر کے بارے میں بتایا جس میں واضح طور پر ''پاکستان سپیشل پراجیکٹ'' کے الفاظ درج تھے۔ اس نے دارالعوام میں یہ مسئلہ اٹھایا اور وزیر توانائی ٹونی بن کو تحقیقات پر مجبور کر دیا۔ تحقیقات پر سب سے پہلے جو بات سامنے آئی وہ یہ تھی کہ انورٹرز کی برآمد قطعاً قانونی تھی اور اس کی پہلی کھیپ پاکستان روانہ کی جا چکی تھی لیکن بعد میں حکومت برطانیہ نے انورٹرز کو ایکسپورٹ کنٹرول لسٹ میں شامل کر کے ان کی مزید ترسیل رکوا دی۔

ایمرسن کے ایک انجینئر کا کہنا ہے کہ ہم واضح طور پر جانتے تھے کہ انورٹرز یورینیم پلانٹ کے لئے ہیں لیکن ہم اس بارے میں بالکل پریشان نہ تھے۔ کیونکہ ہمیں یقین تھا کہ پاکستانی اس انتہائی جدید سامان کو کبھی استعمال نہ کر سکیں گے اور یہ ڈبوں میں بند پڑا ناکارہ ہو جائے گا مگر پہلی کھیپ کے بعد جب ہمیں ایک طویل ٹیلکس کے ذریعہ پاکستان سے ان میں طویل اور پیچیدہ ترامیم کی ہدایات موصول ہوئیں تو ہم حیران رہ گئے۔ فرینک الون کے مطابق یہ انورٹرز بالکل ویسے ہی تھے جو برطانوی ایٹمی توانائی ادارے کے لئے بنائے جاتے تھے۔ یہ کسی طرح بھی ٹیکسٹائل فیکٹری کے لئے موزوں نہ تھے۔ جبکہ ٹونی بن کا خیال تھا کہ ''پاکستان ایٹمی پروگرام جاری رکھے ہوئے ہے''۔

اس انکشاف کے فوراً بعد اگرچہ برطانیہ امریکہ اور دوسرے ایٹمی ممالک نے ایکسپورٹ کنٹرول لسٹ پر نظر ثانی کی تھی اس کے باوجود پاکستان نے کسی نہ کسی طرح برطانیہ سے سنٹری فیوج پراجیکٹ کے لئے درکار دوسری غیر ممنوعہ اشیاء کی خریداری جاری رکھی' جس کے باعث برطانیہ 1979ء کے آغاز میں اپنے برآمدی ضوابط میں مزید توسیع کرنے پر مجبور ہو گیا۔

برطانیہ نے پہلی مرتبہ انورٹرز کے فاضل پرزوں اور سب اسمبلیز کی برآمد پر پابندی لگائی تھی اور دوسری بار ہر ایسی شے کی برآمد پر پابندی لگا دی جو کسی طرح بھی سنٹری فیوج پلانٹ میں استعمال ہو سکتی تھی۔ یوں پاکستان کو ایٹمی توانائی کے حصول سے روکنے کے لئے سب بڑے ممالک سرگرم ہو گئے اور ہمارا یورینیم کی افزودگی کا منصوبہ واقعتاً بحران کا شکار ہو گیا۔ مگر ان حالات میں ڈاکٹر قدیر خان نے خود کفالت کا نعرہ لگایا اور پراجیکٹ کی تکمیل کے لئے مقامی طور پر پرزوں اور آلات کی تیاری کا عمل شروع کر دیا۔ اس دوران وہ پاکستان کے چند بااثر لوگوں کے ذریعے ضروری نوعیت کا سامان منگوانے میں بھی کامیاب ہو گئے۔ مقامی طور پر انہوں نے جن اداروں کا تعاون لیا ان میں پاکستان آرڈیننس فیکٹری' ہیوی ری' مشین ٹول فیکٹری پاکستان انڈسٹریل اینڈ ٹیکنیکل سنٹر لاہور اور چند ایک دوسرے سرکاری و نیم سرکاری ادارے شامل تھے۔

ڈاکٹر خان کی دور اندیشی کہوٹہ پراجیکٹ کو خود کفالت کی طرف لے آئی تھی۔ اگر وہ پاکستان اور اسلام کے سچے خیر خواہ اور جفاکش نہ ہوتے تو مغربی ممالک کی عائد کردہ پابندیوں کے بعد اپنی حکومت کو یہی باور کرانے کی کوشش کرتے کہ ہم تو ایک سوئی بھی خود نہیں بنا سکتے مغربی ممالک کی جدید ٹیکنالوجی کے بغیر ایٹم بم کیسے بنا سکتے ہیں حالانکہ ایٹمی توانائی کمیشن نے 1967ء سے لے کر 1976ء تک یہی انداز فکر اپنایا تھا۔ ڈاکٹر خان نے خود کفالت کے بعد اپنی ان کامیابیوں پر ایک بار کہا: ''مغرب نے جب منہ موڑ لیا تو ہمارا زیادہ تر انحصار اپنی تنصیبات پر تھا۔ ان اداروں کے بارے میں ہمارا یہی رویہ تھا کہ جس نے جس کام کا وعدہ کیا' وہ اسے سونپ دیا گیا اور جیسا کام کیلئے کہا اسے قبول کر لیا۔ کبھی یہ نہ کہا کہ آپ کا کام حسب منشاء نہیں کیونکہ ہمارا پراجیکٹ انتہائی پیچیدہ اور جدید تھا اور اس کے لئے پرزوں میں جس قدر معیار کی ضرورت تھی اس کا انہیں تصور بھی نہ تھا۔ ساری ذمہ داری ہماری اپنی تھی۔ کہوٹہ میں سنٹری فیوج کے تمام اجزاء سو فیصد پاکستانی ہیں جبکہ خام مال یعنی لوہا اور ایلومینیم وغیرہ درآمدی ہیں۔ پرزے مقامی طور پر تیار کئے گئے اور ان کی تیاری کا طریق کار بھی خود ہی ایجاد کیا گیا' البتہ انتہائی حساس اور پیچیدہ مشینری مکمل طور پر درآمد کی گئی۔ پروسیسنگ مشینری اور کنٹرول مشینوں کے بیشتر پرزے جن میں انورٹرز' فلو کنٹرول والوز' ویکیوم والوز ابتداء میں بیرون ملک سے منگوائے گئے۔ مگر پھر بہت جلد ان کی تیاری مقامی طور پر شروع ہو گئی تھی۔

ڈاکٹر خان کے خفیہ ہتھیار

ڈاکٹر خان کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے بیرون ملک مقیم ایسے جرات مند پاکستانیوں سے رابطے پیدا کئے جو وقتاً فوقتاً ان کے پراجیکٹ کی مدد کرتے رہے۔ کہوٹہ پراجیکٹ کے لئے بے شمار گمنام مگر جرأت مند لوگوں نے گراں قدر خدمات انجام دیں حتیٰ کہ جب ان کو معلوم ہوتا کہ ان کی خدمات کا وطن عزیز کے مستقبل کی سلامتی اور خوشحالی سے گہرا تعلق ہے تو ان میں سے کسی نے مالی مفاد کی ہرگز پروا نہیں کی یہاں چند ایک معروف شخصیات کی خدمات کا ذکر کرنا بہت ضروری ہے۔ میاں شیخ فاروق اپنے وسیع کاروبار اور تعلقات کی بنیاد پر ایک بڑی شخصیت ہیں۔ ڈاکٹر خان سے میاں صاحب کے ذاتی مراسم تھے اور یہ مراسم ہی کہوٹہ پراجیکٹ کے لئے درپردہ اہم مقاصد کی تکمیل کے آڑے آتے رہے۔ میاں فاروق صاحب نے اس عظیم الشان منصوبہ کے لئے ایک سے زائد بار مشکلات اٹھا کر ضروری ساز و سامان کی فراہمی میں بے لوث اور بے خوف طریقے سے مدد کی۔

یہاں راقم ایک ایسی غلطی اور مبالغہ کی اصلاح بہت ضروری سمجھتا ہے۔ کچھ صحافی حضرات نے کہوٹہ پراجیکٹ کی ڈرامائی کہانیاں ترتیب دیتے ہوئے اس کا کریڈٹ سیٹھ عابد کو بھی دیا ہے۔ پورے پاکستان میں سیٹھ عابد کو اس حوالے سے بھی عزت دی جاتی ہے کہ انہوں نے کہوٹہ پراجیکٹ کے لئے سامان لا کر دیا مگر بقول ڈاکٹر عبدالقدیر خان سیٹھ عابد کا کہوٹہ پراجیکٹ میں کوئی کردار نہیں۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے راقم کو بتایا:

''سیٹھ عابد بظاہر بڑے درویش اور مرنجاں مرنج انسان ہیں۔ ہم سے بہت وعدے کرتے تھے کہ میں یہ لا دوں گا...... وہ لا دوں گا...... مگر انہوں نے کہوٹہ کے لئے ایک سوئی اور ایک پائی کی بھی مدد نہیں کی۔ اصل قصہ یہ تھا کہ میاں فاروق کے ایک صاحبزادے کا نام میاں عابد فاروق ہے۔ کچھ صحافی یار دوستوں نے اس معاملے کو گلیمرائز کرنے کے لئے سیٹھ عابد کا نام اڑا دیا۔ سیٹھ عابد نے بھی اس موقع سے خوب فائدہ اٹھایا اور کہوٹہ کے ہیرو بن کر عزت و احترام حاصل کیا۔ اللہ انہیں عزت دے۔ بہت سے سماجی کام کر رہے ہیں لیکن انہیں چاہیے کہ وہ کہوٹہ میں اپنے کردار کو کیش نہ کرائیں''۔

آغا حسن عابدی بھی ایک ایسے ہی مجاہد ہیں جنھوں نے پاکستان کی مالی مدد کرنے میں کبھی تکلف سے کام نہیں لیا۔ بینکنگ کی دنیا میں وہ قد آور شخصیت تھے۔ وہ ایک عرصے تک لندن میں بی سی سی آئی کے سربراہ کی حیثیت میں مقیم رہے مگر پاکستان کے معاملات سے وہ کبھی لاتعلق اور بے خبر نہ ہوئے۔ ایک بار وہ سابق امریکی صدر جمی کارٹر کے ساتھ پاکستان آئے تو کارٹر نے آغا حسن عابدی سے ازراہ تفنن کہا تھا۔

''کیا میں کہوٹہ دیکھ سکتا ہوں''؟

آغا حسن عابدی نے برجستہ سنجیدگی سے جواب دیا: ''آپ کو شاید یاد نہیں رہا کہ کہوٹہ کے لئے بہت بڑی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ جو شاید کوئی سابق امریکی صدر ادا نہیں کر سکتا''۔

آغا حسن عابدی بی سی سی آئی کو خیرباد کہنے کے باوجود وطن عزیز میں علوم و فنون کی ترویج اور فروغ کے لئے حتی المقدور کوششیں کرتے رہے۔ انہوں نے صوبہ سرحد میں ٹوپی کے مقام پر قائم ہونے والے غلام اسحاق خان انسٹی ٹیوٹ آف انجینئرنگ سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کے لئے 50 کروڑ روپے کی خطیر رقم بھی فراہم کی۔

ارشد پرویز نامی ایک پاکستانی کو بھی کہوٹہ پراجیکٹ کی خدمات کے نتیجے میں کینیڈا میں پابند سلاسل کر دیا گیا۔ 46 سالہ ارشد پرویز ایک طویل مدت سے کینیڈا میں مقیم تھا۔ وہ امریکی حکومت کے جاری کردہ قانونی لائسنس پر 25 ٹن مخصوص فولاد امریکہ سے باہر بھیجنا چاہتا تھا مگر اس خدشے کے تحت کہ یہ مال دراصل کہوٹہ کے لئے ارسال کیا جائے گا' اسے گرفتار کر لیا گیا۔ جولائی 87ء میں اسے 25 سال کی قید سنائی گئی۔ مگر بعد ازاں سزا میں کمی کر دی گئی۔ رہائی کے بعد ارشد پرویز نے 50 کروڑ روپے کا ہرجانہ دائر کر دیا جسے عدالت نے تسلیم کرتے ہوئے تمام مقدمات سے باعزت بری کر دیا۔

امریکی عدالت نے ارشد پرویز کی گرفتاری کے ساتھ ہی بریگیڈیئر (ر) انعام الحق کی گرفتاری کے وارنٹ بھی جاری کر دیئے۔ وہ ملٹی نیشنل لمیٹڈ نامی کمپنی کے سربراہ تھے۔ بریگیڈیر صاحب نے یہ کمپنی 1982ء میں لاہور میں قائم کی تھی اور وہ یہ سٹیل ریلوے کے لئے درآمد کرتے تھے۔ مگر امریکی حکام کے مطابق بریگیڈیئر انعام الحق اعلیٰ قسم کا سٹیل کہوٹہ کے لئے پاکستان بھجواتے تھے۔ بریگیڈیئر صاحب نے امریکی عدالت اور ایجنسیوں کی طرف سے خاصی پریشانیاں اٹھائیں مگر پاکستان کی سچی محبت کے عوض انہیں یہ پریشانیاں بہت معمولی لگتی تھیں۔

ڈاکٹر خان نے کہوٹہ پراجیکٹ کو کامیابیوں سے ہمکنار کرنے کے لئے ذاتی بنیادوں پر بہت سے لوگوں کو متحرک کیا۔ غیر ممالک میں ایسے محب وطن جناب ڈاکٹر خان کے وہ مہلک ہتھیار تھے جن کی مدد سے انہوں نے اپنے ٹارگٹ پر جب بھی فائر کیا، وہ کامیاب ہوئے۔ ان کی یہ سرگرمیاں امریکی اور یورپی ایجنسیوں کے علم میں آنا شروع ہو گئیں۔ اس دوران یورپ کے مختلف ممالک میں کئی ایسے غیر پاکستانی تاجر گرفتار کئے گئے جو ایٹی پراجیکٹ میں استعمال ہونے والے ممکنہ پرزے درآمد کر رہے تھے۔

امریکہ کے کان کھڑے ہو گئے

امریکی سی آئی اے نے مارچ 1979ء میں اپنی حکومت کو رپورٹ دی کہ پاکستان ایٹمی اسلحے کے لئے موزوں افزودہ یورینیم بنانے کے لئے سنٹری فیوج پلانٹ لگا رہا ہے اور اب تک دس ہزار سنٹری فیوجز کی پیداوار مہیا کرنے والے انورٹرز نصب کر چکا ہے جو سال میں ایک سو پچاس کلوگرام افزودہ یورینیم پیدا کر سکتے ہیں۔ اس سے چھ سات ایٹم بم تیار کئے جا سکتے ہیں۔ اس اطلاع نے امریکی حکام میں بے چینی پیدا کر دی اور اسلامی بم کے بارے میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

سی آئی اے نے مزید تحقیقات کے بعد حکومت کو چند حقائق پیش کئے اور امریکہ کے نائب وزیر خارجہ نے امریکی سینٹ کی ذیلی مجلس کے سامنے بیان دیا:

''ایٹم بم بنانے کے لئے پاکستان کو دو سال سے پانچ سال کا عرصہ درکار ہو گا''۔

تاہم وزیر خارجہ اس بات پر حیران ہوئے کہ پاکستان انتہائی ترقی یافتہ ٹیکنالوجی پر مبنی پلانٹ تعمیر کر رہا تھا جس میں یورینیم کو توانا بنانے کے لئے گیس سنٹری فیوجز سے کام لیا جا رہا تھا اور پاکستان کو افزودہ یورینیم کی قلت کا سامنا نہ تھا جس سے امریکی دوچار تھے۔ امریکی وزیر خارجہ کی یہ حیرانی خود امریکہ کے لئے شرمندگی کا باعث بن گئی۔ پاکستان کو ایٹمی ری ایکٹروں کا محتاج بنانے کے باوجود وہ ایٹمی قوت بن رہا تھا حالانکہ اس پر سخت پابندیاں عائد کی گئی تھیں۔

امریکی سینٹ نے پاکستان کے کہوٹہ پلانٹ کی تعمیر پر سوال اٹھایا کہ پاکستان نے یہ حساس اور گراں ترین سامان کس طرح سے حاصل کیا۔ امریکی سینٹ کی ذیلی مجلس نے اس بارے میں نکتہ پیش کیا کہ ممکن ہے پاکستان نے سنٹری فیوج چلانے والی مشینیں' انورٹر یا ہائی سپیڈ موٹرز امریکہ ہی سے خریدی ہوں کیونکہ مارچ 1979ء تک یہ انورٹرز امریکہ میں جنرل لائسنس کے تحت دستیاب تھے۔

کہوٹہ جاسوسوں کے نرغے میں

کہوٹہ پراجیکٹ اول روز سے ہی نہایت خفیہ پراجیکٹ تھا۔ سوائے چند افراد کے کسی کو معلوم نہ تھا کہ کہوٹہ میں کیا ہو رہا ہے اور یہ عمارتیں اور مشینری کس مقصد کے لئے وہاں لائی جا رہی ہے اور اس سارے پراجیکٹ کی شب و روز نگرانی کرنے اور تعمیراتی منصوبوں میں اپنی مطلوبہ فنی تبدیلیاں کرانے والا ڈاکٹر خان کون ہے اور اس نوجوان شخص کے عزائم کیا ہیں؟۔ ذوالفقار بھٹو اور دیگر افراد جو اس پراجیکٹ سے آگاہ تھے انہوں نے سیکورٹی کے معاملات نہایت سخت کئے ہوئے تھے' اس کے باوجود 1978ء میں فرانس اور امریکہ کو بھنک پڑ چکی تھی کہ کہوٹہ میں کیا ہونے والا ہے اور ڈاکٹر خان کن عزائم کے تحت ہالینڈ سے پاکستان آئے ہیں۔ شروع میں ڈاکٹر خان کو منیر احمد خان نے دلبرداشتہ کرنے اور ''یرغمال'' بنانے کی کوشش کی تھی اور وہ مطمئن تھے کہ اپنے امریکی آقاؤں کے حکم پر عمل کرتے ہوئے وہ کسی بھی غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک سائنسدان کو اٹھنے نہیں دیں گے۔ مگر تقدیر جب خود پاکستان پر مہربان ہو چکی تھی اس نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو حوصلہ' جرأت و ذہانت عطا کی تھی۔ جسے وہ بروئے کار لائے اور اپنے مشن میں مستغرق ہو گئے۔

ان حالات میں فرانس اور امریکہ کی بے کلی بڑھ گئی اور اس نے کہوٹہ اور ڈاکٹر خان کی جاسوسی شروع کر دی۔ آئی ایس آئی اور کہوٹہ کی سیکورٹی پر مامور ایجنسی اس معاملے میں بہت حساس تھی اور وہ تمام حساس ادارے آنکھیں کھول کر رکھتے تھے جونہی انہیں بھنک پڑتی کہ غیر ملکی جاسوس کہوٹہ کی سرزمین کی کھوج میں نکلے ہیں' وہ متحرک ہو جاتے۔

فرانس امریکہ کا بغل بچہ مشہور تھا۔ اس نے اپنے سفارت کاروں کو ہدایات کی ہوئی تھیں کہ وہ کہوٹہ کی کھوج لگائیں۔ ان حالات میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے فرانس اور امریکہ کے عزائم پوری طرح کھول دیئے۔ آئی ایس آئی کے سابق ڈائریکٹر بریگیڈیئر سید احمد ارشاد ترمذی کو ایک ایسا ہی ٹاسک دیا گیا تھا جب آئی ایس آئی کو فرانسیسی سفارت کاروں کی مشکوک حرکات کا علم ہوا اور بریگیڈیئر ترمذی کو اس کی انکوائری پر مامور کیا گیا۔

بریگیڈیئر ترمذی نے اس بارے میں جو رپورٹ مرتب کی اس میں انہوں نے لکھا:

1978ء میں فرانسیسی ری پروسیسنگ پلانٹ کا سودا منسوخ کروانے کے بعد امریکہ کی آنکھوں میں کہوٹہ کھٹک رہا تھا۔ وہ یہ جاننا چاہ رہا تھا کہ پاکستان اس جنگل بیابان میں کیا کر رہا ہے۔ امریکہ نے جہاں اپنے خلائی جہازوں اور جاسوسوں سے کام لیا وہاں اسلام آباد میں مقیم چند سفارتکاروں کو بھی اس بات پر مامور کیا کہ وہ کہوٹہ کے علاقے کی ''سیر'' کریں اور دیکھیں وہاں کیا ہو رہا ہے۔

کہوٹہ ایٹمی پلانٹ کی سیکورٹی آئی ایس آئی کی ذمہ داری نہ تھی۔ اس مقصد کے لئے ایک علیحدہ سیکورٹی

آرگنائزیشن قائم تھی جو کلی طور پر خودمختار سربراہ کی قیادت میں اپنے فرائض انجام دیتی تھی۔جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں' اس وقت میجر جنرل ریٹائرڈ سید اے زیڈ نقوی کو فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد پی اے ای سی سیکورٹی کا سربراہ تعینات کیا گیا تھا۔جنرل نقوی جب لاہور میں 10 ڈویژن کے جنرل آفیسر کمانڈنگ تھے میں ان دنوں کور ہیڈ کوارٹرز میں جی ایس او (آپریشنز) کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ہمارے باہم تعلقات کا آغاز اسی زمانے میں ہوا مگر بعد ازاں جنرل صاحب کے اسلام آباد آنے پر یہ تعلقات نئے سرے سے استوار ہو گئے۔ہمارے درمیان پائی جانے والی پیشہ وارانہ ورکنگ ریلیشن شپ کی بنیاد پر وہ کبھی کبھار آئی ایس آئی سے پاکستان اٹامک انرجی کمیشن کی سیکورٹی کے حوالے سے معاونت کے لئے کہتے یا کبھی ہمیں کسی اہم کیس پر تحقیقات کرنے کے لئے بھی کہہ دیتے۔

ایٹمی ریسرچ کی تنصیبات اور ادارے جن میں پاکستان انسٹیٹیوٹ آف نیوکلیئر سائنس اینڈ ٹیکنالوجی بھی شامل ہے روز آغاز ہی سے ہمارے دشمنوں کی انٹیلی جنس ایجنسیوں کی نظر خاص کا نشانہ ہے اور روز اول ہی سے دشمنوں کی کوشش یہی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طور یہ جان لیں کہ کہوٹہ کے اندر کیا ہو رہا ہے۔فرانسیسی سفارتکار اس معاملے میں دوسروں کی نسبت کچھ زیادہ ہی "متفکر" واقع ہوئے تھے اور اکثر اوقات انہیں کہوٹہ کے قرب و جوار میں "جڑی بوٹیاں" اور "پتھر" تلاش کرتے پایا گیا۔

آپ کو یقین نہیں آئے گا کہ 26 جون 1979ء کو اسلام آباد میں فرانس کے سفیر ہز ایکسیلینسی گوریک اور ان کے فرسٹ سیکریٹری جین فورلوٹ اپنی کار میں ایک ایسے ہی خفیہ مشن پر کہوٹہ کی طرف روانہ ہوئے۔فوٹوگرافی کا جدید سازوسامان ان کے ساتھ تھا اور ان کا ٹارگٹ کہوٹہ کمپلیکس اور اس کے گردونواح کی تصویر کشی تھی۔صاف ظاہر ہے کہ یہ مشن اتنا حساس اور اہم تھا کہ خود سفیر صاحب علاقے کے سروے کے لئے تشریف لے گئے اور اس سروے پلان میں پلانٹ کی عمارت کو جانے والے راستوں' اس کے در و دیوار' اس کے گردوپیش سیکورٹی کے سسٹم' حفاظتی انتظامات اور سارے ممنوع علاقے کا تفصیلی مطالعہ شامل تھا۔

بنیادی طور پر یہ فوٹوگرافی اور دیکھ بھال کا مشن تھا جو عام طور پر اس علاقے میں کیا جاتا ہے جہاں حملہ کرنا مقصود ہو۔تاہم یہ بات ابھی تک راز ہی ہے کہ پاکستان کو ایٹمی ری پراسسنگ پلانٹ کی فراہمی سے انکار کے بعد فرانس کہوٹہ کے بارے میں اس قدر تشویش میں کیوں مبتلا تھا اور کس کے ایماء پر اس نے اس خطرناک مشن پر اپنے دو اعلیٰ ترین سفارتکاروں کی زندگیاں داؤ پر لگانے کا فیصلہ کیا۔ایسے مشن کسی صورت بھی اعلیٰ اتھارٹی کی اجازت کے بغیر عمل میں نہیں لائے جاتے۔معلوم نہیں اس مشن کی اجازت فرانس کے صدر سے حاصل کی گئی تھی یا وہ سرے سے اس سے آگاہ ہی نہیں تھے۔تاہم یہ وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ فرانس کے سفیر کا مقصد محض کہوٹہ کے فطری حسن سے لطف اندوز ہونا اور اس کی تصویر کشی کرنا نہیں تھا۔انہیں اچھی طرح علم تھا کہ علاقے کی کیا اہمیت ہے اور وہ کسی صورت بھی اس سیکورٹی زون میں داخل نہیں ہو سکتے۔اس لئے ان کی یہاں آمد کا واحد مقصد علاقے کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا تھا تاکہ کہوٹہ پر کسی زمینی یا فضائی حملے کی صورت میں سو فیصد کامیابی کو یقینی بنایا جا سکے۔انہیں کن حالات' کس بات اور کن لوگوں نے ایک باعزت سفارتکار سے ایک گھٹیا قسم کا 007 جیمز بانڈ بننے پر مجبور کیا اس کا جواب تو وہی دے سکتے ہیں تاہم ہمارے نزدیک یہ ایک نہایت ہی بچگانہ اور احمقانہ حرکت تھی۔

گوریک اور جین فورلوٹ نے کہوٹہ پہنچ کر اس کے گردونواح میں مکانوں اور درختوں کے بیچ سے گزرتے ہوئے اور شتر مرغ کی چال چلتے ہوئے تصویریں اتارنا شروع کر دیں۔ان کی اس حرکت کا دیہاتیوں نے کوئی خاص نوٹس نہ لیا۔لیکن چند لڑکیوں نے سمجھا کہ یہ گورے ان کی تصویریں بنا رہے ہیں۔چنانچہ انہوں نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔گاؤں کے کچھ لڑکے جو ارد گرد کھیتوں میں کام کر رہے تھے یہ شور سن کر بھاگ کر آ گئے اور لڑکیوں نے چیخ چیخ کر انہیں بتایا "بھیا گورے ہماری تصویریں اتار رہے ہیں۔"

پھر کیا تھا لڑکوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ان کی دھنائی شروع کر دی۔یہ تو ان کی خوش قسمتی تھی کہ گاؤں کے چند بزرگ بھی پہنچ گئے اور انہوں نے بیچ بچاؤ کر کے ان کی جان چھڑوائی۔

بہرحال اس وقت تک لڑکے ان کی ہڈی پسلیاں توڑ چکے تھے۔

اس "مہمان نوازی" کے باوجود فرانسیسی سفارتکاروں نے ڈھٹائی اور بے شرمی کی حد کر دی اور انہوں نے اس واقعہ کے خلاف ہمارے دفتر خارجہ میں جا کر باقاعدہ احتجاج ریکارڈ کروایا۔دفتر خارجہ نے پہلے جنرل نقوی سے اس واقعہ کے بارے میں پوچھا مگر وہ اس سارے معاملے سے لاعلم تھے۔انہوں نے مجھے فون کیا اور پوچھا "ارشاد میاں کہوٹہ میں کیا ہوا؟"

میں نے فوراً جواب دیا "جی کیا ہوا؟ مجھے تو معلوم نہیں آپ ہی بتائیے؟"

لیکن انہوں نے فون بند کر دیا۔ میں نے سوچا کہوٹہ میں ضرور کوئی نہایت ہی اہم واقعہ رونما ہوا ہے اور ابھی جنرل اختر بھی مجھ سے پوچھیں گے۔ چنانچہ میں نے فوراً اپنا ایک افسر کہوٹہ کی طرف روانہ کیا تا کہ معلومات حاصل کی جا سکیں۔ جب جنرل اختر نے مجھے اپنے کمرے میں بلا کر پوچھا اس وقت تک میرا بھیجا ہوا افسر تمام معلومات حاصل کر کے آ چکا تھا۔

''کہوٹہ میں کیا ہوا ہے؟'' ظاہر ہے۔ ہمارے دفتر خارجہ نے صدر صاحب کو رپورٹ کیا ہو گا اور انہوں نے جنرل نقوی کے بعد جنرل اختر سے پوچھا ہو گا۔

میں نے جنرل اختر کو تمام تفصیل بتا دی۔

جنرل اختر چونکہ یہ جانتے تھے کہ ہماری ٹیم کے کان بہت لمبے اور آنکھیں بہت دور تک جاتی ہیں اس لئے انہوں نے ذرا اپنی آنکھیں سیکڑ کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا تمہارے لڑکے تو وہاں نہیں تھے؟''

میں نے جواب دیا کہ ہماری اطلاع کے مطابق فرانسیسی ''جاسوس'' اپنی گاڑی میں بیٹھ کر اسے خود ڈرائیو کرتے ہوئے واپس گئے ہیں' اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہماری ٹیم وہاں نہیں تھی۔ اگر ہمیں یہ علم ہوتا کہ وہ ہمیں کہوٹہ کے تفریحی دورے کا اعزاز ''بخش'' رہے ہیں تو ہم اس سے بہتر طریقے پر ان کی خاطر تواضع کرتے۔ انہیں بڑے اعزاز کے ساتھ رخصت کرتے اور شاید پھولوں کی دو خوبصورت ''چادریں'' بھی ان کے ہمراہ فرانس جاتیں۔

میری یہ گفتگو سن کر جنرل اختر کے چہرے پر ایک خاص فخریہ مسکراہٹ آ گئی اور انہوں نے من وعن صدر صاحب سے کہہ دیا۔

فرانسیسیوں نے ہمارے فارن آفس کے پاس اپنا احتجاج ریکارڈ کراتے ہوئے بیان دیا تھا کہ کہوٹہ کے سیکورٹی سٹاف نے انہیں زدوکوب کیا ہے مگر انہوں نے امریکیوں کو کچھ اور ہی کہانی سنائی' جس کا علم مجھے ایران سے شائع ہونے والی وہ کتاب پڑھ کر ہوا جو ایرانی طلباء کے امریکی سفارت خانے پر قبضے کے بعد حاصل کی جانے والی اہم دستاویزات پر مشتمل تھی اور جو ''اسنادوالانہ جاسوسی'' (45) ''پاکستان'' جلد ''امریکہ کی اسلامی ممالک میں مداخلت'' کے عنوان سے شائع کی گئی تھی۔ متعلقہ حصے کا ترجمہ کچھ یوں ہے۔

خفیہ:

امریکن سفارتخانہ اسلام آباد 29 جون 1979ء سیکرٹری آف سٹیٹ' واشنگٹن

عنوان:

فرانسیسی سفارتکاروں کا اسلام آباد ایٹمی صلاحیت والے کارخانے کے قریب زدوکوب اسلام آباد 12497

مختصر:

فرانس کے سفیر اور اول سیکریٹری جین فورلوٹ کو 26 جون کو کہوٹہ کے قریب کچھ ٹھگوں نے اس وقت زدوکوب کیا جب وہ اپنی گاڑی میں اس گاؤں کے نزدیک سے گزر رہے تھے۔ فورلوٹ جو پہلے ہی بیہوش ہو گیا' کہتا ہے کہ پاکستان کی حکومت نہیں چاہتی کہ کہوٹہ کے نزدیک جہاں یورینیم کا کارخانہ ہے کوئی غیر ملکی آئے''۔

تفصیل:

جین فورلوٹ نے 26 جون کو ہمیں اطلاع دی کہ 26 جون کی شام تقریباً پونے سات بجے وہ اور اس کا سفیر کہوٹہ کے علاقے سے جو اسلام آباد سے 30 میل کے فاصلے پر ہے واپس اسلام آباد آ رہے تھے کہ راستے میں چند ٹھگوں نے انہیں پیٹا۔ 1978ء میں فورلوٹ اپنے ایک آسٹریلوی سفارتکار کے ہمراہ اس علاقے میں گیا تھا۔ جہاں خیال کیا جاتا ہے کہ پاکستان ایٹم بم بنا رہا ہے اور انہوں نے اس علاقے کی کافی تصویریں اتاری تھیں۔ فورلوٹ نے اپنے سفیر کے ساتھ پچھلے ہفتہ میٹنگ کے دوران پاکستان میں ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری کے بارے میں استفسار کیا تھا۔ فورلوٹ نے رضا کارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کیں کہ وہ اپنے سفیر کو اس علاقہ میں لے جائے گا اور یہ علاقہ ویسے بھی بڑا خوبصورت ہے اور سیاحت کے کتابچہ میں بھی اس کا ذکر ہے۔

فورلوٹ اور اس کا سفیر شام تقریباً 4 بجے اسلام آباد سے کہوٹہ کی جانب روانہ ہوئے اور راستے میں چند ایک ''دیدہ زیب'' مقامات پر رکے۔ نہ ہی تو ان کے پاس کوئی کیمرہ تھا اور نہ وہ گاڑی سے باہر آئے۔ جیسے ہی انہوں نے کہوٹہ سے واپسی کا راستہ اختیار کیا۔ ایک بسنتی رنگ کی گاڑی جس میں چار آدمی سوار تھے ان کے پاس سے گزری اور آگے جا کر رک گئی۔ آگے سے ایک ٹرک بھی آ گیا اور راستہ تقریباً بند ہو گیا۔ فورلوٹ نے کار کو ریورس کرنا چاہا کہ پیچھے سے دو موٹر سائیکل سوار آ گئے اور راستہ روک لیا۔

چار آدمی گاڑی سے اترے اور دو موٹر سائیکل سے اور انہوں نے فورلوٹ اور بوڑھے سفیر کو کھینچ کر گاڑی سے نکال لیا۔ وہ زیادہ تگڑے نہیں تھے اور شلوار قمیص میں ملبوس تھے۔ فورلوٹ تو پہلے ہی ناک آؤٹ ہو گیا۔ پھر بوڑھے سفیر کی دھنائی شروع ہوئی۔ نہ ہی تو وہ فوجی لگ رہے تھے اور نہ ہی ان کے پاس کوئی ہتھیار تھے۔ پر ان کی شکلیں

غنڈوں جیسی تھیں۔فورلوٹ بیان کرتا ہے کہ وہ بہت سوچ سمجھ کر مار رہے تھے کہ نشانات کم پڑیں۔پھر بھی سفیر کا ایک دانت ٹوٹا اور گہری چوٹیں آئیں اور فورلوٹ کے سر کی ہڈی میں کریک آ گیا۔

فورلوٹ کہتا ہے کہ تقریباً دس منٹ بعد اسے ہوش آیا تو حملہ آور جا چکے تھے اور سفیر اپنی چوٹیں سہلا رہا تھا۔فورلوٹ کی عینک ٹوٹ چکی تھی۔انہوں نے کار کی چابیاں زمین پر سے اٹھائیں اور اسلام آباد پہنچ کر پولیس کو رپورٹ کی' پولیس نے پوری مدد کا وعدہ کیا۔پروٹوکول آفیسر اور صدر پاکستان کو بھی اطلاع ہوئی اور صدر نے سفیر کے ساتھ بہت ہمدردی کا اظہار کیا۔

قطع نظر اس کے کہ حکومت پاکستان نے مجرموں کو پکڑنے کا وعدہ کیا ہے فورلوٹ کو یقین ہے کہ یہ لوگ سرکاری غنڈے تھے اور انہوں نے سرکار کے حکم پر ہی ان کی پٹائی کی اور نہایت پھرتی اور صفائی سے یہ کام سرانجام دیا۔نہ گاڑی توڑی نہ کوئی مال لوٹا۔اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ آئندہ کوئی غیر ملکی اس طرف کا رخ نہ کرے۔فورلوٹ بتاتا ہے کہ کہوٹہ کے گردونواح کافی بدل چکے ہیں۔اس جگہ کو اب گاڑیوں کی ورکشاپ بھی کہتے ہیں اور کافی پرانی فوجی گاڑیاں ادگرد کھڑی ہیں۔تار کی باڑ کی بجائے اس علاقے کے گرد ایک اونچی دیوار بنائی جا رہی ہے کہ باہر سے کچھ دکھائی نہ دے۔

سرکار پاکستان کو یہ علاقہ ممنوعہ قرار دے دینا چاہیے تھا اور فرانسیسی بے چارے تو یونہی پھنس گئے۔بہرحال چونکہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہاں پاکستان کی ایٹمی تنصیبات ہیں اور اس کی نگہداشت لازمی ہے شاید اس لئے چند نوجوان افسروں نے جوش میں آ کر ان فرانسیسیوں کی پٹائی کر دی"۔کنگ بی ٹی 7335

یہ پڑھنے کے بعد کوئی قاری بھی یہ یقین کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ فرانس کا اول سیکریٹری جین فورلوٹ پاکستان کی ایٹمی تنصیبات کی جاسوسی کے لئے امریکی جاسوسی ادارے سی آئی اے کا تنخواہ دار اور ملازم تھا اور اس کا شاید فرانس کو بھی علم نہیں تھا۔اسی ایرانی کتاب میں ایک اور سفارتی پیغام درج ہے' جو فورلوٹ کی جاسوسی سرگرمیوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔پیغام کا ترجمہ:

خفیہ:

از طرف امریکی سفارتخانہ اسلام آباد

برائے سیکرٹری سٹیٹ واشنگٹن/قونصلر کراچی/امریکی سفارتخانہ دہلی/فرانس/ہنولولو

عنوان:

فرانسیسی آفیسر کے ساتھ ایٹمی معاملات پر بحث۔

1- جین فورلوٹ فرانس کے سفارت خانہ میں فرسٹ افسر ہے اور اہم ایٹمی معاملات پر اس سے باقاعدہ اطلاعات لی جاتی رہی۔19 دسمبر کو ہمارے پولیٹیکل قونصل کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے اس نے بتایا کہ کہوٹہ کے قریب عجیب قسم کی عمارتیں بہت تیز رفتاری سے تعمیر کی جا رہی ہیں۔کہوٹہ اسلام آباد کے جنوب مشرق میں ایک گاؤں ہے جہاں تقسیم ہند کے وقت بہت سے ہندو مارے گئے تھے۔

2- فورلوٹ کا کہنا ہے کہ اس نے اس جگہ کا بخوبی مطالعہ کیا ہے اور یہ ایک ایٹمی تنصیب والی عمارت لگتی ہے۔پچھلے چھ ماہ کے دوران تیزی سے 10 عمارتیں تعمیر ہو چکی ہیں جس میں ایک مستطیل شکل کی بہت بڑی عمارت ہے۔ پاکستان میں عموماً اتنی تیزی سے کام نہیں ہوتا جس تیزی سے اس عمارت پر ہو رہا ہے۔فورلوٹ کا کہنا ہے کہ اس نے کافی معلومات حاصل کی ہیں اور یہ پتہ چلا ہے کہ کراچی کی ایک فرم کو 50 لاکھ ڈالر کا ایئر کنڈیشنگ کا ٹھیکہ ملا ہے۔ فورلوٹ نے ہمارے پولیٹیکل کونسلر کو بہت سی تصاویر بھی دکھائی ہیں جو اس نے اور اس کے آسٹریلوی سفارتکار دوست نے اتاری تھیں۔(یہ ویسی ہی تصاویر ہیں جو آسٹریلیا کے سفارتکار نے ہمیں دی تھیں اور ہم بیگ میں بھجوا چکے ہیں یقیناً یہ ایٹمی تنصیبات کی تصاویر ہیں)۔فرانسیسی سفیر نے فورلوٹ سے بھی کہا وہ یہ تصاویر پہلے ہمیں دکھائے پھر ملٹری اتاشی کے ذریعے فرانس بھجوا دے۔

3- ہماری پولیٹیکل قونصلر نے کہا کہ اس نے بھی سنا ہے کہ کہوٹہ میں کچھ کام ہو رہا ہے لیکن اس سے زیادہ اسے بھی معلوم نہیں۔بہرحال اس نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

4- فرانسیسی ریپروسیسنگ پلانٹ کے متعلق فورلوٹ نے بتایا کہ باقی ماندہ دو افراد میں سے کیمسٹ 2 جنوری کو شاید واپس چلا جائے اور دوسرا جو انجینئر تھا اگر اسے فرانس میں کوئی خاطر خواہ کام نہ ملا تو وہ شاید واپس آ جائے۔لیکن مشکل معلوم ہوتا ہے چونکہ انجینئر کی بیوی بچے نہیں تھے اور انہوں نے قسم کھائی تھی کہ وہ واپس نہیں آئیں گے۔ سپروائزر جو پاکستان اور فرانس کے درمیان دورہ پر رہتا تھا' کراچی گیا ہوا تھا اور شاید واپس نہ آئے۔فرانس کا ایک قونصلر لاہور میں ہے جو انجینئر ہے۔لیکن وہ ایٹمی سائنس دان نہیں بلکہ بلڈنگ انجینئر ہے اور اس کی خدمات ایک فرانسیسی فرم S.E.E.E سے مستعار لی گئی ہیں۔فورلوٹ نے مزید کہا کہ اسے بھی کبھی کبھار مشورہ کے لئے بلایا

جاتا ہے اور شاید وہ یہیں رہے اور واپس نہ بلایا جائے۔

5- فورلوٹ کا ذاتی خیال ہے کہ پاکستان ازخود ری پروسیسنگ پلانٹ بنانے کی کوشش کرے گا جس میں شاید بہت وقت اور پیسہ لگے۔ جب فورلوٹ سے پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن کے چیئرمین منیر خان کے فرانسیسیوں کے ساتھ روابط کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے کچھ نہیں بتایا۔ (سی ٹی پی ٹی 2497)

ڈاکٹر قدیر خان سے ملاقات کی خواہش:

اسی زمانے میں ایک گورے اخباری نمائندے نے ہمارے دفتر خارجہ سے شکایت کی کہ ہماری ایک سیکورٹی ایجنسی کے اہلکاروں نے اسے زدوکوب کیا ہے۔ یہ شکایت باضابطہ طور پر رجسٹرڈ کرائی گئی اور اس کا پس منظر یہ تھا کہ یہ گورا اسلام آباد کی گلیوں میں ڈاکٹر قدیر خان سے خصوصی انٹرویو کے لئے جیمز بانڈ بنے پھر رہا تھا کہ غلط جگہ پہنچ گیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ اپنی ناک تڑوا کر اپنے ہوٹل کے کمرے میں دو دن لیٹا رہا۔

ہمیں اکثر اوقات اس بات پر حیرت ہوتی تھی کہ یہ گورے ابھی تک 1947ء سے قبل کے دور میں رہ رہے ہیں اور آج بھی ہمیں اپنی رعایا سمجھتے ہیں اور حکمرانی کے اس فوبیا نے انہیں اس غلط فہمی میں مبتلا کر رکھا ہے کہ وہ ہمارے قومی اور نجی معاملات میں جب چاہیں جہاں چاہیں اپنی ٹانگ اڑا سکتے ہیں۔ اس طرح کے واقعات کو وقوع پذیر ہونے سے روکنے اور اپنے غیر ملکی مہمانوں کے معاملات کو درست رکھنے کے لئے ہم نے دفتر خارجہ کو مشورہ دیا تھا کہ ایسے غیر ملکیوں کو جو سفارتکار نہیں ہیں ایسے خاص کار نمبر الاٹ کئے جائیں جو پہلے سے مستعمل نمبروں سے مختلف ہوں اور آسانی سے پہچانے جا سکیں۔ دفتر خارجہ نے ہمارے اس مشورے کو تسلیم کر لیا اور ابھی تک اس پر عمل بھی ہو رہا ہے۔

بہر حال وزارت داخلہ کے جوائنٹ سیکریٹری ضیاء حسن نے جو میرے اچھے دوست بھی تھے مجھ سے گورے اخباری نمائندے کی پٹائی کے بارے میں پوچھا...... ہماری نگرانی کرنے والی ٹیم کے ارکان مجھے ساری کہانی سنا چکے تھے ان کا کہنا تھا کہ اگر وہ مداخلت نہ کرتے تو اس گورے صاحب کی ہڈی پسلی ایک ہو جاتی۔

واقعہ کچھ یوں تھا کہ اس غیر ملکی صحافی کو جو ڈاکٹر قدیر خان کا انٹرویو کرنا چاہتا تھا ان کی رہائش گاہ کا علم نہیں تھا۔ وہ صرف ان کے رہائشی سیکٹر کے بارے میں جانتا تھا۔ اس نے مخصوص قسمت آزمائی کے لئے ایک گھر کے دروازے پر لگی ہوئی گھنٹی دبا دی۔ جواب میں ایک ملازمہ باہر نکلی۔ ہمارے اس صحافی دوست نے ٹوٹی پھوٹی اردو ملی انگریزی میں اس خاتون سے "ڈاکٹر قدیر خان جو ایٹم بم بنا رہے ہیں" انکا پتہ پوچھا۔

ظاہر ہے یہ سب اس خاتون کے لئے ناقابل فہم تھا۔ اس نے موصوف کو جھاڑ پلائی تو انہوں نے ایک پرانا حربہ استعمال کرنے کا فیصلہ غالباً یہ سوچ کر کیا کہ تیسری دنیا کے ممالک میں کام نکلوانے کا اس سے بہتر طریقہ اور کوئی نہیں ہے۔ چنانچہ اب ان کے ہاتھ میں چند کرارے نوٹ تھے اور وہ زبردستی یہ رقم اس ملازمہ کو دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ بے چاری اس صورتحال سے خاصی نروس ہوئی اور اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے چیخنا شروع کر دیا۔ اس کی یہ غیر متوقع چیخیں سن کر اندر سے اس کا شوہر اور بھائی بھاگتے ہوئے آئے۔ پیش منظر ناقابل فہم نہیں تھا۔ خاتون نے بتایا کہ یہ گورا نہ صرف اسے پیسے دے رہا ہے بلکہ اس کا ہاتھ بھی کھینچ رہا ہے۔ ادھر صاحب کے منہ سے شراب کی بو بھی آ رہی تھی۔ لہذا خاتون کی مدد کے لئے آنے والوں کے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ گورے صاحب ان کی عزیزہ کو "چالو مال" سمجھ کر لے جانا چاہتے تھے' انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور گورے صاحب کا بینڈ باجہ بجانا شروع کر دیا۔ یہ تو اس کے نصیب اچھے تھے کہ ہمارے آدمی اتفاق سے وہاں پہنچ گئے۔ اسی اثناء میں چند ہمسائے بھی گھروں سے باہر نکل آئے۔ گورے صاحب پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش بند ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ وہ ایک صحافی ہیں۔ جس پر انہیں باحفاظت ان کے ہوٹل پہنچا دیا گیا۔ اگر وہ بے وقوف آدمی شکایت نہ کرتا تو شاید ہمیں اصل کہانی کا علم ہی نہ ہوتا اگر وہ ہمارے آدمیوں کو بتا دیتا کہ وہ ڈاکٹر قدیر خان کے ہاں جانا چاہتا ہے تو شاید اس کی خاطر مدارت کسی اور طریقے سے ہوتی۔

ضیاء الحق بھی وہ نکلے

جنرل ضیاء الحق کے بارے میں مشہور تھا کہ امریکہ نے بھٹو کو تختہ دار پر لٹکانے کے لئے انہیں پاکستان کا اقتدار دلوایا اور پھر سی آئی اے نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے ایک طرف انہیں روس کے خلاف استعمال کیا تو دوسری طرف ان کے ذریعے پاکستان میں جمہوریت اور سیاسی شعور کا قلع قمع کر دیا۔ جنرل ضیاء الحق کے بارے میں یہ بات بھی سنی گئی کہ انہوں نے بھٹو کے عظیم پراجیکٹ ...... کہوٹہ پر عتاب نازل کیا اور ایٹمی پروگرام کو منجمد کر دیا تھا وہ امریکہ کو خوش کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی ایسی حرکت کرتے ہی رہتے تھے۔ جس زمانے میں امریکہ اور فرانس کہوٹہ کی فلمیں بنانے میں سرگرم عمل تھے ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ جس نے بعد میں پاکستان کے لئے بے پناہ مسائل پیدا کر دیئے۔ ہمارے حساس ادارے نے ایک امریکی جاسوس سے بڑی تگ و دو کے بعد کہوٹہ کی فلمیں حاصل کر لی تھیں مگر ضیاء الحق کے حکم پر آئی ایس آئی وہ فلمیں اسی حالت میں امریکہ کو بطور تحفہ پیش کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ زبان پر کلمۂ طیبہ اور اسلام' اسلام کا ورد جاری رکھنے والے اس شخص کا یہ کردار اس کی دوعملی کا بین ثبوت ہے۔ امریکی جاسوس سے وہ فلمیں حاصل کرنے کی تفصیل بریگیڈیئر ترمذی کی زبانی سنئے جو انہوں نے اپنی کتاب میں قلم بند کی ہے وہ لکھتے ہیں:

''امریکہ ہمارے ایٹمی پروگرام کی تفصیلات جاننے کے لئے ہر طرح کے ذرائع استعمال کر رہا تھا۔ اپنی معمول کی ڈیوٹی کے دوران ہمیں ایک ایسے پاکستانی نوجوان کے بارے میں علم ہوا جس نے کہوٹہ کی تصاویر بنائی تھی۔ یہ نوجوان کسی امریکی یونیورسٹی میں ریسرچ سکالر تھا۔ تحقیق کرنے پر علم ہوا کہ اس کے پروفیسر نے اسے کہوٹہ اور نواحی دیہات اور علاقے کی تصاویر بنا کر لانے کو کہا تھا کیونکہ اس کے تحقیقی مقالے کا موضوع ''دیہات کی سماجی زندگی'' تھا۔ ہم نے اس نوجوان کو مشورہ دیا کہ وہ اسلام آباد کے گرد و نواح میں کسی ملتے جلتے علاقے کی تصویریں بنا کر لے جائے اور اپنے پروفیسر سے کہے کہ یہ کہوٹہ کی ہیں۔ اس نے ہمارے کہنے پر عمل کیا مگر جب ہم نے اسے اس کے پروفیسر کے اس مشورے اور خواہشوں کی اصلیت سے آگاہ کیا تو وہ بے حد نروس اور پریشان ہوا۔

اس طرح کی متعدد ناکامیوں کے بعد امریکیوں نے کہوٹہ کی تصاویر کے لئے سی آئی اے کے ماہرین کو پاکستان بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ ایک روز مجھے جنرل نقوی نے بتایا۔

''ایک امریکی سیاح کہوٹہ اور اس کے ارد گرد کے علاقے کی مووی اور سٹل کیمروں سے تصاویر بناتے دیکھا گیا ہے' کہوٹہ کے سکیورٹی سٹاف نے اسے پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ انہیں جل دینے میں کامیاب ہو گیا' کہوٹہ سکیورٹی سٹاف اس کا پیچھا کرتا ہوا راولپنڈی کے پرل کانٹی نینٹل ہوٹل تک آیا مگر اسے قابو کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا' دیکھیں اسے یہ تصاویر لے جانے میں کامیاب نہیں ہونا چاہیے۔''

اس طرح کا ہر مشن خفیہ والوں کے لئے ہمیشہ ایک چیلنج ہوتا ہے۔ مگر یہ ایک خاص مشن تھا کیونکہ ہمیں اپنے ٹارگٹ کا کوئی اتہ پتہ نہیں تھا۔ ہماری ٹیم فوراً حرکت میں آئی اور تگ و دو شروع ہو گئی' ہم نے ہوٹل کا ریکارڈ چیک کیا۔ اس کا نام مہمانوں کے رجسٹر میں موجود تھا مگر جس وقت تک ہم ہوٹل پہنچے وہ ہوٹل چھوڑ کر جا چکا تھا اور اب اسے تلاش کرنا گھاس کے ڈھیر میں سوئی ڈھونڈنے والی بات تھی۔ لیکن میں نے بہت مرتبہ محسوس کیا کہ اللہ تعالیٰ کا فضل' کوئی غیبی ہاتھ ہر مشکل وقت میں ہماری مدد اور رہنمائی کرتا ہے' وہی قوت پاکستان کی رکھوالی کر رہی ہے اور ہمارے جیسے ناتواں اور نادانوں کو روشنی بخش رہی ہے۔ ہوٹل کی انتظامیہ سے نہ صرف ہمیں اس کے حلیے کا اچھی طرح پتہ چل گیا بلکہ اس کی کار کا نمبر بھی معلوم ہو گیا جو امریکی سفارتخانے سے اسے لینے کے لئے آئی تھی۔ اس سلسلے میں ویٹر اور بیل بوائے کی یادداشت بڑی معاون ثابت ہوئی۔ پہلے اور فوری قدم کے طور پر اس کار کو تلاش کرنے کا پیغام نشر کر دیا گیا اور گھنٹے بھر میں ہمیں اطلاع مل گئی کہ مطلوبہ کار نے اٹک پل پار کیا ہے اور پشاور کی طرف جا رہی ہے۔ ہم نے پشاور میں اپنی ٹیم کو خبردار کر دیا اور ہوٹل کے دونوں لڑکوں کو حتمی شناخت کے لئے پشاور بھیج دیا۔

سی آئی اے کی کارکردگی کے بارے میں ہمارا تجربہ ہے کہ اس کے آپریٹر کسی بھی غیر ملک میں کسی ایک مشن پر نہیں جاتے بلکہ ان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے قیام کے دوران ایک سے زیادہ مشن مکمل کر کے جائیں۔ ہمیں ان ہوٹلوں کا بھی علم تھا جہاں عام طور پر امریکی ٹھہرا کرتے تھے اور ان ہوٹلوں کے کارکنوں میں ان کے ایجنٹوں کے بارے میں بھی ہمیں مکمل خبر تھی لہٰذا ان کے لئے ایک خاص کمرہ تیار کرنا ہمارے لئے کچھ مشکل نہیں تھا۔

اس گاڑی میں دو امریکی تھے پہلے وہ پشاور میں اپنے افغان ایجنٹوں سے ملاقات کے لئے گئے۔ جن میں افغان مہاجرین کے کیمپوں میں قائم مراکز صحت میں کام کرنے والے کارندے بھی شامل تھے۔ ان لوگوں کے ساتھ انہوں نے طویل ملاقاتیں کیں' وہ رات گئے پشاور واپس آئے اور وہ نادانستہ طور پر ہوٹل میں ان کے لئے خاص طور پر تیار کرائے گئے کمرے میں پہنچ گئے۔ وہ صبح کاذب تک رپورٹیں وغیرہ مرتب کرتے رہے۔ ہم ان پر مکمل نظر

رکھے ہوئے تھے۔

اگلے روز انہوں نے سفارتی تھیلے میں جانے والی ڈاک کے لئے ان سفارتی رپورٹوں پر مبنی لفافے تیار کئے۔ ہمیں اس بات کا تو یقین تھا کہ کہوٹہ کی تصاویر پر مبنی فلمیں وغیرہ بھی اسی سفارتی تھیلے میں بھجوادی جائیں گی اور ان تھیلوں کو قابو کرنا ہمارے بس میں نہیں تھا۔ ہم اپنی سب محنت رائیگاں جاتی دیکھ رہے تھے۔

صبح سویرے انہوں نے یہ پیکٹ پشاور میں امریکی قونصلیٹ کے عملے کے حوالے کیا اور ایک بار پھر افغان مہاجرین کے کیمپوں کی طرف روانہ ہوگئے۔ اس مشن پر مامور ہمارے نوجوانوں کے لئے یہ صورتحال خاصی مایوس کن تھی۔ یہ ایک طرح سے مشن کی ناکامی تھی۔ پھر بھی وہ امید کا دامن ہاتھ سے چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھے۔ اسی امید کے سہارے انہوں نے کمرے کی تلاشی لینے کا فیصلہ کیا۔ ان کے سوٹ کیسوں سے 8 ایم ایم کی مووی ٹیپ کے دو سپول اور کیمرے کی آٹھ سیل بند شدہ فلمیں برآمد ہوئیں یہ اسی غیبی قوت کا معجزہ تھا کہ امریکیوں نے یہ فلمیں سفارتی تھیلے کی بجائے بذات خود لے جانے کا فیصلہ کیا تھا اور یوں یہ ہمارے ہاتھ لگ گئیں۔

صبح دس بجے کے قریب یہ برآمد شدہ مال میری میز پر تھا۔ میں نے اپنے ڈائریکٹر جنرل اور جنرل نقوی کو خبر دی کہ مشن کامیاب رہا ہے۔

جنرل نقوی صدر ضیاء کو پہلے ہی یہ اطلاع دے چکے تھے کہ ایک امریکی نے کہوٹہ کی فلمبندی کی ہے۔ لہٰذا ہم نے انہیں خوشی خوشی یہ اطلاع دی کہ ہم نے فلمیں حاصل کرلی ہیں' تاہم ابھی یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ یہی مطلوبہ فلمیں ہی ہیں یا ہم کچھ اور لے آئے ہیں۔

مجھے ذاتی طور پر یہ دیکھنے کی بے چینی تھی کہ ان فلموں میں کیا عکس بند کیا گیا ہے۔ میری خواہش تھی کہ انہیں اپنی فوٹو لیبارٹری میں دھلوائیں مگر ڈی جی نے مجھے ہدایت کی کہ میں انہیں جنرل نقوی کے حوالے کردوں۔ میں نے جنرل نقوی سے رابطہ کیا تو وہ صدر سے ملنے جا چکے تھے' شاید یہ بتانے کہ آئی ایس آئی کی ٹیم نے فلمیں برآمد کرلی ہیں۔

سہ پہر کو ڈی جی نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور پوچھا "وہ فلمیں کہاں ہیں تم جن کا تذکرہ کررہے تھے؟"

"وہ میرے پاس ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"انہیں یہاں لے آئیے۔" ڈی جی نے حکم دیا اور میں نے وہ "مال" ڈی جی کی میز پر رکھ دیا۔

"ہمیں یہ امریکیوں کو واپس کرنا ہیں' یہ صدر کا حکم ہے" جنرل صاحب بولے۔

ان کا یہ حکم سن کر مجھے بہت پریشانی ہوئی ...... جس مشن کو ہم نے اتنی محنت اور بھاگ دوڑ کے بعد مکمل کیا تھا اس کے بارے میں صدر مملکت یہ حکم دیں گے یہ میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔

میں نے شکستہ دلی سے کہا "سر! کم ازکم ان فلموں کو روشنی تو دکھا دیں تاکہ ان پر ہماری ایٹمی تنصیبات کا عکس باقی نہ رہے" مگر ڈی جی صاحب کچھ بھی سننے کے موڈ میں نہیں تھے۔ انہوں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"صرف وہ کرو جو صدر صاحب نے حکم دیا ہے' وہ بہتر جانتے ہیں"

صدر کے حکم کی اس اندھی تقلید پر اپنے ڈی جی کے بارے میں میرے دل میں پہلی بار منفی جذبات پیدا ہوئے مگر میں بے بس تھا۔ وہ فلمیں امریکی سفارتخانے کو واپس کردی گئیں۔ میں کئی روز تک پریشانی میں مبتلا رہا اور ایک روز میرے استفسار پر جنرل نقوی نے مجھے بتایا۔

"تم جانتے ہو میں صدر کو پہلے ہی اطلاع دے چکا تھا کہ ایک امریکی نے کہوٹہ اور اس کے اردگرد کے علاقے کی عکس بندی کی ہے۔ پھر امریکی سفیر نے صدر سے شکایت کی کہ کسی سیکورٹی ایجنسی کے افراد نے پشاور کے ایک ہوٹل میں ایک امریکی سیاح کے کمرے کی تلاشی لے کر اس کے سوٹ کیس سے پاکستان کے قدرتی مناظر کی عکس بندی پر مشتمل کچھ فلمیں چرالی ہیں۔ ان فلموں میں محض پوٹھوہار کی دیہاتی زندگی کے مناظر ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔ میں نے جب صدر کو اس واقعہ کی اطلاع دی تھی تو انہیں یہ بھی بتایا تھا کہ وہ فلمیں حاصل کرلی گئی ہیں اور آئی ایس آئی نے میرے کہنے پر یہ سب کچھ کیا ہے۔ تاہم صدر نے میری ایک نہیں سنی اور ان فلموں کو واپس کردیا۔

اس واقعہ سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ امریکی ہمارے ایٹمی پروگرام کے بارے میں کس جنون میں مبتلا تھے تاہم صدر ضیاء کی مداخلت پرسی آئی اے کے کارندے کہوٹہ کی تصویریں لے جانے میں کامیاب ہوگئے۔ امریکی سفیر نے یقینی طور پر ان فلموں کی واپسی کے لئے صدر سے منت سماجت کی ہوگی مگر صدر نے ہماری کارکردگی کو سراہنے کے بجائے امریکی سفیر کی درخواست پر عمل کیوں کیا؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب کوئی حاضر سروس سرکاری ملازم نہیں دے سکتا۔

پراپیگنڈہ جنگ شروع ہوتی ہے

کہوٹہ میں افزودگی کے منصوبے کا انکشاف ہونے کے بعد اسلام دشمن عالمی طاقتیں اپنے تمام تر وسائل کے ساتھ

بھوکے گدھوں کی طرح پاکستان پر جھپٹ پڑیں۔ ہالینڈ میں اسرائیل کے وزیراعظم بیگن کے دباؤ کے تحت ڈاکٹر خان کے خلاف ایک بے بنیاد مقدمہ قائم کر دیا گیا جو ڈچ سکینڈل کے نام سے مشہور ہوا۔ برطانیہ اور امریکہ نے برآمدات کے ضابطے سخت کر دیئے جس کے لئے انہیں اپنے صنعت کاروں کی سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔
امریکی سی آئی اے نے مغرب کی دوسری انٹیلی جنس ایجنسیوں کے تعاون سے جو رپورٹ تیار کی' اس کے مطابق پاکستان 1979ء تک کہوٹہ پلانٹ کے لئے درکار ہر ضروری شے خرید چکا تھا جبکہ ڈاکٹر خان کی زیر نگرانی کئی ایسے پرزے مقامی طور پر تیار ہو رہے تھے جو کھلی مارکیٹ سے خریدے نہ جا سکتے تھے۔
امریکہ نے سوئس حکومت' سویڈن' برطانیہ' ہالینڈ' بلجیم' جرمنی اور دوسرے کئی ممالک کو سخت نوٹس بھیجے کہ پاکستان ان کی صنعتی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر ایٹمی طاقت بن گیا ہے اور اب وہ یہ ٹیکنالوجی دوسرے اسلامی ممالک کو بھی فراہم کرے گا جس سے یورپی ممالک کو اپنے تحفظ کے لئے اب پہلے سے دوگنی طاقت حاصل کرنا پڑے گی۔
صدر ضیاء الحق نے عنان اقتدار سنبھالتے ہی ذوالفقار علی بھٹو کے بنا کردہ ایٹمی پراجیکٹ کو جاری رکھنے کا حکم دیا تھا اور وسائل مہیا کرنے میں بھی کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ امریکہ نے صدر ضیاء کو شیشے میں اتارنے کے لئے جدید اسلحہ دینے کی پیشکش کی لیکن جب بات نہ بنی تو تمام ترقیاتی اقتصادی امداد بند کرنے کا اعلان کر دیا۔ مغربی دنیا میں اس حوالے سے پاکستان اور ڈاکٹر خان کے خلاف پراپیگنڈہ عروج پر تھا۔ مغربی پریس انہیں بدمعاش' جھوٹا' چور اور جاسوس قرار دے رہا تھا۔ ڈاکٹر خان کے خلاف یہ ساری مہم ان کے اعصاب کمزور کرنے کے لئے چلائی جا رہی تھی۔ اس پس منظر میں انہوں نے جرمن روزنامہ ''ڈیر سپیگل'' کو ایک تلخ و ترش خط لکھا۔ جس کا ایک اقتباس یہ ہے:
''مغربی صحافی ترقی پذیر ممالک کے بارے میں جھوٹی اور گمراہ کن رپورٹنگ کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں اور اس وقت تو ان کی خباثت میں اور بھی شدت پیدا ہو جاتی ہے جب وہ کسی مسلم ملک کے بارے میں لکھ رہے ہوتے ہیں۔ میں ان واہیات خود پسند امریکیوں اور برطانویوں کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا وہ خدائی فوجدار ہیں جنہوں نے خود تو لاکھوں جوہری بم تیار کر رکھے ہیں اور ''خداداد'' اختیار کے تحت ہر ماہ دھماکے کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر ہم کوئی چھوٹا سا پرامن پروگرام بھی شروع کر دیں تو ہم شیطان اور بدمعاش بن جاتے ہیں۔ سارے مغربی صحافی ہمارے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور جھوٹی شر انگیز خبریں گھڑنا اپنا فرض سمجھتے ہیں''۔
مغربی پریس کی حرکات نے ڈاکٹر خان کو غصے میں مبتلا کر دیا اور انہوں نے جوابی مضامین میں کھری کھری سنا ڈالیں۔ انہوں نے اس حوالے سے اپنے ایک مضمون میں امریکہ اور یورپ کی منافقت کا پردہ چاک کرتے ہوئے لکھا:
''ہمارے خلاف تو بے بنیاد اور متعصبانہ پراپیگنڈہ شروع کر دیا گیا لیکن مغربی دنیا جس طرح ہمارے ہاتھ ہر چیز فروخت کرنے کے لئے تیار رہتی تھی اس کا نام کوئی نہیں لیتا۔ جب ہم نے انگلستان کی فرم ایمرسن سے انورٹر خریدے اور ان کی کارکردگی ہماری توقع سے بہت کم نکلی تو ہم نے ایمرسن سے درخواست کی کہ اس کو بہتر بنانے کے لئے کچھ تبدیلیاں کر دی جائیں۔ ہمیں بعد میں بی بی سی کی بدنام زمانہ فلم ''پراجیکٹ 706۔ اسلامی بم'' سے پتہ چلا کہ ہم نے جن تبدیلیوں کی درخواست کی تھی انکو افشا کر دیا گیا تھا۔ اس موقع پر ہمیں بہت سے خطوط اور ٹیلکس موصول ہوئے اور لوگ اس مشینری کی تفصیلات لے کر ہمارے پیچھے پڑ گئے۔ جو انہوں نے (دیگر پلانٹوں المیلو اور کے پن ہرسٹ وغیرہ کو فروخت کی تھیں۔ صحیح معنوں میں انہوں نے ہاتھ جوڑ کر ہم سے کہا تھا کہ ہمارا سامان خرید لو۔ ہم نے اپنے پلانٹ کی مناسبت سے جو سامان درکار تھا' خرید لیا اور کبھی ضرورت کے مطابق تبدیلی کی درخواست بھی کی۔ ان لوگوں کو خیال کرنا چاہیے کہ ہم نے جو کچھ خریدا وہ روایتی ٹیکنالوجی تھی۔ یہ ایک معمولی کیمیکل پراسیس اور ویکیوم ٹیکنالوجی کا سامان تھا جس کے ہزاروں دوسرے استعمالات بھی تھے۔ اس کی ایک مثال کینیڈا میں دسمبر 1980ء میں تین ایشیائی تاجروں کی گرفتاری ہے جن پر ایسا برقی ساز و سامان پاکستان کو فروخت کرنے کا الزام تھا جو سنٹری فیوج میں کام آ سکتا ہے۔ حالانکہ اس سے قبل وہ ایک لاکھ 70 ہزار ڈالر مالیت کے اس آرڈر کے تحت مال مونٹریال سے بذریعہ ہوائی جہاز پاکستان کے لئے روانہ کر چکے تھے۔ یعنی گیارہوں کھیپ روک لی گئی اور ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ حالانکہ کینیڈا میں متعین پاکستان کے سفیر الطاف اے شیخ کے الفاظ میں ''پاکستان نے ٹرانسفارمر اور انورٹر وغیرہ کی خریداری کر کے کوئی جرم نہیں کیا تھا کہ یہ غیر ایٹمی سامان تھا اور اس پر کوئی بھی پابندی نہ تھی''۔
کینیڈین حکومت کا اصرار تھا کہ اس آرڈر میں شامل ''کو ایکسیل کیبل'' چونکہ زیر زمین ایٹمی دھماکے میں استعمال کی جا سکتی ہے اس لئے یہ آرڈر سنٹری فیوج پلانٹ کے لئے ہے۔ 1984ء میں ایک پاکستانی تاجر کو ہیوسٹن کی ایک عدالت نے 50 ہائی سپیڈ سوئچ درآمد کرنے پر سزا سنا دی کہ یہ سوئچ بم ٹریگر کے طور پر استعمال ہو سکتا ہے حالانکہ اس

کے کئی غیر فوجی استعمال ہیں۔ جن میں آئل ایکسپلوریشن بھی شامل ہے اور پاکستانی ذرائع کے مطابق اس آرڈر کا تعلق کسی طور پر بھی کہوٹہ پلانٹ سے نہ تھا مگر اسے کینیڈا کی براڈ کاسٹنگ سروس نے ''فرنٹ لائن'' نامی دستاویزی فلم کے ذریعے پاکستان کے افزودگی پلانٹ کو رسوا کرنے کا بہانہ بنایا''۔

ڈاکٹر خان کہوٹہ پلانٹ کی کامیابی کے لئے مختلف محاذوں پر جنگ کر رہے تھے۔ جوں جوں منزل قریب آ رہی تھی آستین کے سانپ انہیں تنگ کر رہے تھے وہ یورپی اور امریکی پروپیگنڈے کا جواب دیتے تو ان کی سازشوں کے منہ کھل جاتے۔ ایٹمی توانائی کمیشن کے سربراہ مسٹر منیر احمد خان ڈاکٹر خان کے کردار کو متاثر کرتے رہے مگر ڈاکٹر خان کے جوابی حملے انہیں پسپا کرتے رہے اور وہ اپنے مذموم عزائم میں کامیاب نہ ہو سکے۔

یہ سلسلہ ابھی بھی جاری ہے اور خاص کر کراچی کا ایک صحافی جو کبھی اپنے سسر کے ساتھ ڈاکٹر خان کے گھر کے چکر لگا لگا کر favour مانگا کرتا تھا وہ اب ڈاکٹر خان پر طرح طرح کے بہتان لگاتا رہتا ہے۔ ڈاکٹر خان کے ایک دیرینہ رفیق کا کہنا ہے کہ یہ منافقین کافروں اور یہودیوں سے بدتر ہیں جو محسن ملک' محسن پاکستان کی ذات پر گندے اور جھوٹے الزامات سے باز نہیں آتے۔

دہشت گرد سامنے آگئے

80ء کے بعد پاکستان کا عظیم الشان منصوبہ سازشوں میں گھر گیا۔ 22 جون 1984ء کو کینیڈا میں نذیر دید اور اس کے دو ساتھیوں کو ممنوعہ اشیاء پاکستان روانہ کرنے کے الزام میں گرفتار کر کے ملک بدر کر دیا گیا' حالانکہ کینیڈا کے کسٹم ڈیپارٹمنٹ نے اس کی تصدیق کر دی تھی کہ ان لوگوں نے کوئی ایٹمی مواد پاکستان نہیں بھیجا۔ جولائی 1987ء میں خبر آئی کہ ایک سوئس فرم کے بعض افسروں کو پاکستان کو ایسا سامان فراہم کرنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے جو یورینیم کی افزودگی میں کام آتا ہے۔

1980ء میں پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو سبوتاژ کرنے کے لئے سی آئی اے نے عالمی دہشت گردی کا منصوبہ بنایا اور ان تمام فرموں کو خوفزدہ کر دیا جو منع کرنے کے باوجود پاکستان کو حساس ساز و سامان فروخت کر رہی تھیں۔ خصوصاً فرانس اور اٹلی کی بعض فرموں کو تحفظ برصغیر کی لیگ "The Sub Continent League of protecting" نامی فرضی تنظیم کی طرف سے دھمکی آمیز خطوط موصول ہوئے' جن میں کہا گیا تھا کہ مال روانہ کرنے والے افراد اور فرموں کے خلاف تشدد کے استعمال سے گریز نہیں کیا جائے گا۔ اس تنظیم کا حدود اربعہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔

فروری 1981ء میں جرمن فرم ''کورا انجینئرنگ'' کے ایم ڈی کے گھر بم کا دھماکہ ہوا۔ اس کی ذمہ داری ''جنوبی ایشیا میں ایٹمی عدم فروغ کے گروہ'' نے قبول کی اور پولیس حکام کے مطابق فون کرنے والا کوئی ایسا شخص تھا جس کی مادری زبان انگریزی نہیں تھی۔ متعلقہ حکام نے کہا یہ سی آئی اے کی کاروائی تھی۔ اس سے قبل اطالوی فرم الکومہ کو بھی فون پر اسی لب و لہجہ کے کسی شخص نے دھمکی دی تھی کہ پاکستان کو کوئی مال نہ بھیجا جائے۔

جرمنی کے ڈاکٹر Heinz Mebas کے گھر کتاب میں ایک بم بھیجا گیا مگر عقلمندی سے اس نے اس کو نہیں کھولا اور پولیس کو دے دیا۔ پولیس نے تصدیق کی یہ اسرائیلی بم تھا۔

ہالینڈ کے ڈاکٹر سلے بوس کو سامان بھیجنے کے جرم میں پکڑ لیا گیا اور بڑی مشکل سے اس کی جان چھوٹی۔

مغربی سفارت کاروں کے مطابق اسرائیل بھارت اور سی آئی اے نے پاکستان کے کہوٹہ پراجیکٹ کے خلاف مشترکہ کاروائیوں کا منصوبہ بنایا تھا جس پر مرحلہ وار کام شروع کیا گیا تھا جس میں سب سے نمایاں ہدف ڈاکٹر خان تھے۔

صدر ضیاء کو امریکی دھمکی

1979ء میں کہوٹہ پراجیکٹ کی خبریں عام ہو چکی تھیں اور تمام بڑی طاقتیں پاکستان کے پیچھے لٹھ لے کر پڑ گئی تھیں۔ امریکی حکومت نے پاکستان پر دباؤ ڈالا کہ وہ اس پلانٹ پر بین الاقوامی ایٹمی ادارے کی نگرانی اور تحفظات کو تسلیم کرلے مگر پاکستان امریکی دباؤ کو خاطر میں نہ لایا۔ امریکی صدر جمی کارٹر کو پاکستان کی یہ جرأت پسند نہ آئی اور امریکہ نے آئندہ سالوں کے لئے پاکستان کی اقتصادی امداد بند کر دی۔ علاوہ ازیں پاکستان کو فوجی تعلیم و تربیت کے معاہدے کے تحت جو مراعات حاصل تھیں ان پر پابندی لگا دی۔ حالانکہ انہی دنوں امریکہ کے وزیر توانائی جیمز شلسنگر اور اسسٹنٹ سیکریٹری خارجہ تھامس پکرنگ اعتراف کر چکے تھے کہ پاکستان آئندہ تین چار سال تک ایٹمی ہتھیاروں کی صلاحیت حاصل نہیں کر سکتا جبکہ پاکستان بھی امریکہ کو یقین دہانی کرا چکا تھا کہ اس کا ایٹمی پروگرام خالصتاً پرامن مقاصد کے لئے ہو گا۔

صدر جمی کارٹر نے 40 ملین ڈالر کی اقتصادی امداد محض اس لئے روک دی تھی کہ سی آئی اے کی معلومات کے مطابق پاکستان الٹرا سینٹری فیوج پلانٹ لگا رہا تھا۔ امریکی حکومت نے اس اطلاع کے بعد صدر ضیاء الحق سے رابطہ کیا اور

انہیں دھمکی دی کہ پاکستان کا پروگرام ان کے لئے خطرناک ثابت ہوسکتا ہے لہذا ایٹمی پراجیکٹ کا خیال چھوڑ دیا جائے مگر صدر ضیاء الحق نے مصلحتاً امریکہ پر واضح کر دیا کہ پاکستان ایٹمی ہتھیار بنانے کی جانب قدم نہیں بڑھا رہا۔ اس سلسلے میں امریکی نائب وزیر خارجہ کرسٹوفر نے اسلام آباد آ کر پاکستانی حکام سے بھی مذاکرات کئے مگر کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا جس کے باعث امریکہ نے پاکستان میں جاری اپنے تمام تر ترقیاتی منصوبے سمیٹنے شروع کر دیئے۔ امریکی دباؤ پر ورلڈ بینک نے بھی پاکستان کو قرضوں کی ادائیگی میں کسی قسم کی رعائت دینے سے انکار کر دیا۔

انہی دنوں امریکی ٹیلی ویژن سسٹم سی بی ایس پر "پاکستان اور اسلامک بم" کے عنوان سے ایک خصوصی پروگرام پیش کیا گیا جو انتہائی گمراہ کن اور مبالغہ آمیز تھا۔ پاکستان نے اس پر احتجاج کیا اور واضح کیا کہ پاکستان کا ایٹمی پروگرام یکسر پر امن مقاصد کے لئے ہے اور پاکستان جنوبی ایشیا میں ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری پر مکمل پابندی کے کسی بھی معاہدہ پر دستخط کرنے کے لئے تیار ہے بشرطیکہ جنوبی ایشیا کے دوسرے ممالک بھی اس پر آمادہ ہوں۔

یہ وہ وقت تھا جب افغانستان میں روس کی مدد سے آنے والی حفیظ اللہ امین حکومت کے باعث پاکستان کی شمالی اور مغربی سرحدوں پر پاکستان کی سلامتی کے حوالے سے خاصے بحرانی حالات پیدا ہو چکے تھے۔ انہی دنوں نیویارک ٹائمز کی 11 اگست 1979 کی اشاعت میں یہ خبر شائع ہوئی کہ امریکی انتظامیہ نے پاکستان کے یورینیم پلانٹ کو تباہ کرنے کے لئے تین متبادل صورتوں پر غور کیا ہے جن میں اسے سبوتاژ کرنا یا کمانڈو ایکشن کے ذریعے اڑا دینا شامل ہے۔

یہ خدشہ بھی ظاہر کیا گیا کہ پاکستان کو اسلامی بم سے نوازنے والے واحد انقلابی سائنسدان ڈاکٹر اے کیو خان کو ہلاک کیا جا سکتا ہے۔ ان مقاصد کے لئے خبر کے مطابق امریکی وزارت خارجہ کے جیرارڈ سمتھ کی نگرانی میں ایک انٹر ایجنسی ٹاسک فورس قائم کر دی گئی تھی۔

ناراض پاکستان

ہندوستان ٹائمز نے بھی امریکی دفتر خارجہ کے ایک افسر کے حوالے سے یہ خبر شائع کی کہ اگر بھارت ۱۴ دن میں مشرقی پاکستان میں اپنے مشن میں کامیاب ہوسکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ کہوٹہ پراجیکٹ کو ۱۴ منٹ میں تباہ نہ کر سکے جبکہ ۱۰ اگست ۱۹۷۹ء کو امریکی سینیٹر پرسی نے کلکتہ میں بیان دیا کہ پاکستان اس سال کے آخر تک بم بنا لے گا جس کے بعد پاکستان جب چاہے دہلی، بمبئی اور کلکتہ کو تباہ کر سکتا ہے۔

عالمی طاقتیں تیزی کے ساتھ پاکستان کے گرد سازشوں کا جال بن رہی تھیں۔ یہ صورتحال مارشل لاء حکومت کے لئے انتہائی پریشان کن تھیں۔ حکومت نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی فول پروف سیکورٹی کے انتظامات کر دیئے اور افواج کو چوکس رہنے کا حکم دے دیا۔ چنانچہ ۳۰ اگست ۱۹۷۹ء کو ضیاء الحق نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے پاکستان کے ردعمل کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

"پاکستان کے ایٹمی پروگرام میں رکاوٹیں ڈالنے کے امریکی اقدامات کے باعث پاکستان نے سینٹو سے علیحدگی اور غیر وابستہ ممالک کی تحریک میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ امریکہ نے ہماری ہر قسم کی اقتصادی امداد روک دی ہے اور مغربی ذرائع ابلاغ سے ہمارے خلاف انتہائی شر انگیز مہم جاری ہے۔ ہم واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ہمارا ایٹم بم بنانے کا کوئی ارادہ نہیں لیکن ہم اپنا ایٹمی پروگرام ترک بھی نہیں کریں گے"۔

ضیاء الحق کا یہ اعلان قومی امنگوں کا ترجمان تھا اور قومی سطح پر اس کا زبردست خیر مقدم کیا گیا جبکہ امریکی وزیر خارجہ سائرس وانس کو تین ہفتے بعد یہ اعتراف کرنا پڑا "ہم نہ تو پاکستان کو ایٹمی پروگرام پر عمل درآمد کرنے سے روک سکے ہیں اور نہ ہی پاکستان کے ہاتھوں ایٹمی مواد اور آلات کی فروخت کے خلاف ہماری مہم موثر ثابت ہوئی ہے"

امریکی حکومت پاکستان پر حد سے زیادہ دباؤ ڈالنے کے بعد بالآخر خود پچھتانے پر مجبور ہو گئی اور اس نے یہ تاثر دینا شروع کر دیا کہ اگر پاکستان یہ یقین کرا دے کہ وہ ایٹمی ہتھیار بنائے گا اور نہ ہی پر امن ایٹمی دھماکہ کرے گا تو اس کی امداد بحال کی جا سکتی ہے۔ لیکن پاکستان نے امریکہ کی یہ تجویز بھی مسترد کر دی۔

ان دنوں پاکستان میں امریکہ کے خلاف جذبات عروج پر تھے۔ چنانچہ جب ۲۱ نومبر ۱۹۷۹ء کو خانہ کعبہ پر بعض شر پسندوں کی طرف سے قبضہ کی خبر آئی تو پاکستانیوں نے اس پر شدید ردعمل ظاہر کیا اور اسلام آباد میں واقع امریکہ سفارتخانہ نذر آتش کر دیا۔

اس سے قبل کہ امریکہ پاکستان کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کرتا' سوویت یونین نے ساری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ 27 دسمبر 1979ء کو روسی افواج افغانستان میں داخل ہو گئیں۔ سوویت یونین کے توسیع پسندانہ عزائم امریکہ کے سپر پاور بننے کی راہ میں حائل ہو گئے۔ یہ صورتحال پاکستان کے لئے بھی خطرناک تھی۔ امریکہ نے اس موقع پر کروٹ بدلی اور صدر کارٹر نے افغانستان میں سوویت یونین کا قبرستان بنانے کے لئے پاکستان کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ امریکی صدر نے صدر ضیاء الحق سے ٹیلیفون پر بات چیت کی اور کہا "امریکہ پاکستان کی سلامتی کے لئے ہر قسم کی مدد دینے کو تیار ہے"۔

۲ جنوری ۱۹۸۰ء کو نائب امریکی وزیر خارجہ وارن کرسٹوفر نے اسلام آباد پہنچ کر روسی خطرہ کے پیش نظر پاکستان کو مدد دینے کے عزم کا اظہار کیا اور پاکستان کو دو سال میں ۴۰۰ ملین ڈالر کی امداد دینے کا اعلان کر دیا۔

صدر ضیاء الحق نے تمام امریکی امداد مسترد کر دی اور کہا کہ امریکہ نے یکطرفہ طور پر ہماری امداد بند کر کے اپنا اعتماد کھو دیا ہے۔ ہم اس پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔ صدر ضیاء نے مزید کہا کہ بجائے اس کے کہ صدر کارٹر "مونگ پھلیوں" سے ہمیں بہلانے کی کوشش کریں' انہیں سوچنا چاہیے کہ اگر امریکہ نے وعدہ خلافیوں اور کہہ مکرنیوں کی روش ترک نہ کی تو ویتنام سے لے کر تک کوئی اسے پوچھنے والا نہ ہوگا۔

پاکستان کے مضبوط موقف نے امریکی حکومت کو اضطراب میں مبتلا کر دیا۔ امریکہ کو مشرق وسطیٰ' جنوبی ایشیا اور مشرق بعید میں اپنے مفادات خطرے میں پڑتے نظر آئے تو اس نے صدر ضیاء الحق کو اور پاکستان کو خوش کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ امریکی وزیر خارجہ ایڈمنڈ مسکی نے پاکستان کے مشیر امور خارجہ آغا شاہی اور صدر کارٹر نے صدر ضیاء الحق کو واشنگٹن کے دورے کی دعوت دی لیکن پاکستان کا فیصلہ اٹل رہا۔ آغا شاہی نے کہا "امریکہ نے جاری امداد روکنے کا فیصلہ یکطرفہ طور پر کیا تھا کہ ہم ایٹم بم بنا رہے ہیں اور اس مسئلے پر ہمارے تعلقات ۱۹۷۶ء سے کشیدہ ہیں جبکہ اس سارے عرصے میں بھارت کو ہر ممکن مدد دی جاتی رہی اور ضروری ایٹمی مواد فراہم کیا جاتا رہا ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے ساتھ سوتیلا سلوک نہ کیا جائے"۔

جمی کارٹر تو ناراض پاکستان کو خوش نہ کر سکے لیکن ان کے جانشین صدر ریگن نے اقتدار سنبھالتے ہی پاکستان کے لئے ہر قسم کی اقتصادی' سیاسی اور فوجی امداد کی بحالی اور دوستانہ تعلقات استوار کرنے کی مہم شروع کر دی۔ اگرچہ امریکہ اور پاکستان کے تعلقات خوشگوار ہو گئے تھے تاہم ایٹمی پروگرام کے لحاظ سے اس دور میں بھی پاکستان پر دباؤ جاری رہا جبکہ امریکہ نے بھارتی اور اسرائیلی ایٹمی پروگرام سے کوئی تعرض نہ کیا اور فاضل پرزہ جات کے علاوہ افزودہ یورینیم کی سپلائی بھی جاری رکھی۔

قسط نمبر 16

مغرب کا مجرم

امریکہ نے جب دیکھا کہ پاکستانی حکمران امریکی پابندیوں پر پریشان ہونے کی بجائے انہیں خندہ پیشانی سے قبول کر رہے ہیں اور اپنا ایٹمی پروگرام ترک کرنے پر رضامند نہیں تو اس نے کہوٹہ پراجیکٹ پر براہ راست حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔

امریکہ کی شہہ پر اسرائیلی وزیراعظم بیگن نے ہالینڈ پر دباؤ ڈالا کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان پر جاسوسی اور ایٹمی راز چوری کرنے کا مقدمہ قائم کیا جائے۔ پاکستان اس وقت تک افزودگی کے پلانٹ کے لئے درکار ہر ضروری شے خرید چکا تھا جبکہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی زیرنگرانی پراجیکٹ کے پرزہ جات مقامی طور پر تیار کئے جا رہے تھے جو پابندیوں کے باعث کھلی مارکیٹ سے خریدے نہ جاسکتے تھے۔

مغربی پریس نے ڈاکٹر خان کی کردارکشی کی مہم تیز کردی اور انہیں بدمعاش' جھوٹا' چور اور جاسوس قرار دیا جانے لگا۔ ڈاکٹر خان ان دنوں Herpes Zoster کے عارضہ میں مبتلا تھے اور خاصی کمزوری محسوس کر رہے تھے۔ جسمانی ناتوانی اور ذہنی پریشانی نے انہیں خاصا مضطرب کر دیا تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے مغربی پریس کا دوٹوک اور ٹھوس انداز میں تحریری طور پر جواب دیا اور یہودی نواز پریس کو اس کا اصل چہرہ دکھایا۔ ان دنوں مغربی دنیا کا کوئی اخبار' جریدہ' ٹیلی ویژن اور ریڈیو اسٹیشن ایسا نہیں تھا جس نے ڈاکٹر خان اور پاکستان کے اسلامی بم کو تضحیک کا نشانہ نہ بنایا ہو۔ یہ دباؤ دراصل پاکستان کو دنیا بھر میں نکو بنا دینے کی ایک سازش (جیسا کہ آج کل پابندیوں کے باعث ہو رہا ہے) تھی جس کا پاکستان بالخصوص ڈاکٹر خان نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

ہالینڈ نے اسرائیلی وزیراعظم کے خط پر مارچ 1979 میں ایک بین الوزارتی کمیٹی تشکیل دی۔ جسے ہدایت کی گئی کہ وہ ڈاکٹر خان کی ہالینڈ میں قیام کے دوران سرگرمیوں اور الميلو کی ملازمت کے حوالے سے رپورٹ پیش کرے کہ آیا ڈاکٹر خان نے واقعی الميلو کے راز چوری کئے ہیں یا نہیں؟ کمیٹی نے ایف ڈی او سے شہادتیں طلب کیں اور تفصیلی تحقیق و تفتیش کے بعد 1982ء میں اپنی رپورٹ پارلیمنٹ میں پیش کردی جس میں کہا گیا:

''ڈاکٹر خان نے کوئی چوری نہیں کی ان کے خلاف کوئی قانونی مقدمہ نہیں بنتا' وہ یہاں سے کچھ نہیں لے کر گئے اور یہ کہ پاکستان میں یورینیم کی افزودگی کا جو طریقہ زیرعمل لا رہا ہے' وہ دوسرے وسیع پیمانے پر طبع شدہ مواد اور آزادی سے میسر آجانے والے وسائل پر مبنی ہے''۔

رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا کہ ڈاکٹر خان کو ہالینڈ میں ایف ڈی او نے بطور ماہر فلزیات ملازم رکھا تھا۔ ان کی اہلیت و مہارت صرف اس مواد تک محدود تھی جو ڈچ طرز کے سینٹری فیوج میں استعمال ہوتا تھا اور جسے یورنیکو نے ناکارہ سمجھ کر مسترد کر دیا تھا''۔

یہ رپورٹ صداقت پر مبنی تھی تمام سامراجی ممالک کی نظریں ڈچ حکومت پر مرتکز تھیں لیکن ڈچ حکومت انصاف کے ازلی تقاضوں کو بروئے کار لانا چاہتی تھی۔ اسے نہ صرف اپنے عدالتی وقار کو سربلند رکھنا تھا بلکہ اپنے سائنسی پراجیکٹ کو بھی محفوظ تر ثابت کرنا تھا۔

رپورٹ میں مزید بتایا گیا کہ 1974ء میں ڈاکٹر خان کو دو غیر اہم رپورٹوں کا جرمن سے ڈچ زبان میں ترجمہ کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی جو ان بارہ رپورٹوں میں سے تھیں جو جرمن طرز کے سینٹری فیوج پلانٹ کے بارے میں تیار کی گئی تھیں۔ اس کے لئے انہیں 16 دنوں تک الميلو فیکٹری کے باہر ایک عمارت میں رکھا گیا اور انہیں صرف فیکٹری کے غیر اہم کیفے ٹیریا اور آرام گاہوں تک جانے کی اجازت تھی۔ چنانچہ ان وجوہات اور صرف 128 گھنٹوں کے دوران دو رپورٹوں کا ترجمہ کرنے کی مشغولیت نے انہیں اتنا موقع ہی نہیں دیا کہ وہ کسی دوسرے معاملے میں دلچسپی لیتے۔ کنسورشیم ڈاکٹر خان کی خدمات کا معترف ہے۔ کیونکہ وہ ان چند سائنسدانوں میں سے ایک ہیں جو ڈچ اور جرمن زبان پر مناسب عبور رکھتے تھے۔

ہالینڈ کی حکومت پاکستان کے ایٹمی پراجیکٹ سے پوری طرح آگاہ تھی اور ایف ڈی او آزادانہ تجارت کے ذریعے پاکستان کو کہوٹہ پراجیکٹ کے لئے اہم پرزہ جات فراہم کرتی رہی تھی۔ اس سلسلے میں ایف ڈی او کے سیلز منیجر مسٹر کاکس کئی بار پاکستان آ چکے تھے اور ان کی تجزیاتی رپورٹس کے بعد ہی کہوٹہ پراجیکٹ کو سامان مہیا کیا گیا تھا۔

ہالینڈ کی ایک دوسری کمپنی ڈی اے ایف نے بھی سینٹری فیوج میں استعمال کے لئے اعلیٰ درجے کے لوہے مارے جنگ سٹیل کی چھ ہزار ٹیوبیں فراہم کی تھیں۔ ایف ڈی او 1979 تک پاکستان سے تجارتی لین دین کرتی رہی تھی۔ اسرائیل کے ایماء پر جب ہالینڈ کی حکومت دباؤ میں آئی تب بھی ایف ڈی او کے ایک نمائندے نے مارچ 1979ء میں پاکستان کا دورہ کیا اور تحقیقاتی کمیٹی نے ڈاکٹر خان کو ہر طرح کے الزام سے بری الذمہ قرار دے دیا تھا لیکن

یہودی لابی کو قرار نہ آیا اور انہوں نے ڈاکٹر خان کے خلاف شر انگیز پروپیگنڈہ کی مہم تیز تر کر دی نتیجتاً پاکستان پر عائد پابندیاں مزید سخت کر کے ان کی مدت بڑھا دی۔
آخر کار یہودی دباؤ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو گیا اور 1983ء میں ہالینڈ کی پارلیمنٹ نے اس معاملے کو از سر نو زندہ کر دیا۔ پارلیمنٹ نے متعلقہ شعبے کے وزیر کو ہدایت کی کہ ڈاکٹر خان کے خلاف جاری پروپیگنڈے اور الزامات کی مکمل چھان بین کرے۔ چنانچہ ہالینڈ حکومت نے ڈاکٹر خان کے خلاف مقدمہ قائم کر دیا اور اس کے لئے دو ایسے خطوط کو بنیاد بنایا گیا جو 1976ء میں لکھے گئے تھے۔ جن کا جواب بھی نہ دیا گیا۔
ڈاکٹر خان نے یہ دو خطوط اپنے المیلو کے ایک رفیق کار "فیئر مین" کو اس وقت لکھے تھے۔ جب اس نے ڈاکٹر خان کو پاکستان میں ریسرچ پراجیکٹ میں اپنی مدد کی پیشکش کی تھی۔ چنانچہ جب ڈاکٹر خان نے کہوٹہ پراجیکٹ پر کام شروع کیا تو انہیں ایک فولادی پلیٹ میں معمولی سوراخ کے لئے استعمال ہونے والے تیزاب کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے اس رفیق کار کی مدد کی ضرورت پیش آئی۔ یہ معلومات نہایت معمولی قسم کی تھیں۔ حالانکہ ایف ڈی او پاکستان کو جدید اور حساس نوعیت کی مشینیں فراہم کرنے کے علاوہ اہم نوعیت کا لٹریچر بھی فراہم کر چکی تھی۔ فیئر مین نے ڈاکٹر خان کو خط کا جواب نہ دیا تو ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے انہیں دوبارہ خط لکھا لیکن اس خط کا بھی جواب نہ آیا۔
ہالینڈ حکومت نے ڈاکٹر خان کے خلاف یکطرفہ کاروائی کی اور عدالتی کاروائی کے لئے ایک یہودی خاتون جج کو مقرر کر دیا۔ مقدمہ میں ڈاکٹر خان پر درج ذیل الزامات لگائے گئے۔
1-ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے منظم طور پر یورینیم کی افزودگی کے راز غیر قانونی طور پر حاصل کرنے کی کوشش کی جو برطانیہ مغربی جرمنی اور ہالینڈ کی ملکیت تھی۔
2-اس نے اسلامی بم بنانے کے لئے پراسرار انداز میں ایٹمی راز چوری کر لئے۔ وہ اس صدی کا ایک بڑا چور ہے۔ وہ کلاس فکشن اور ایلین نن کے ایٹمی راز چرا کر سوویت یونین لے جانے کے بعد سب سے کامیاب چور ثابت ہوا ہے۔
3-1974ء کے آخر میں بیلجیم اور فرانس سے سفارتی پلیٹوں والی کاریں ڈاکٹر خان کے گھر آتی تھیں اور مہمان صبح تک ٹھہرے رہتے تھے۔
4-وہ ایک پراسرار انسان ہیں جن تک مغرب کے صحافیوں کی رسائی آسان نہیں ہے۔
5-1975ء میں ڈاکٹر خان بداحتیاطی کا مظاہرہ کرنے لگے تھے۔ ایک بار انہوں نے اپنے ایک ساتھی کو گھر آنے اور الٹرا سینٹری فیوج کے نقشوں کی تصویریں اتارنے کے لئے کہا تھا۔
6-انہوں نے ایک بیان داخل کیا کہ وہ ہالینڈ کی شہریت حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اپنی جنوبی افریقہ کی اہلیہ کو ڈچ قومیت کی ظاہر کیا۔
7-ایک موقع پر نوٹ کیا گیا کہ وہ اجنبی رسم الخط میں کچھ لکھ رہے تھے۔ ان کے ایک ساتھی نے پوچھا کہ وہ کیا لکھ رہے ہیں؟ تو ڈاکٹر خان نے مسکراتے ہوئے کہا کہ وہ اپنے وطن میں گھر والوں کو خط لکھ رہے ہیں۔
8-انہیں 16 دن تک برین بکس اور سینٹری فیوج تک رسائی رہی۔ یہ ایک نادر موقع تھا اور انہوں نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا جبکہ بالخصوص حفاظتی انتظامات خاصے ناقص تھے۔ اسی اثنا میں انہیں ایسی دستاویزات بھی پڑھتے دیکھا گیا جن کا ترجمہ کرنے کے لئے انہیں نہیں کہا گیا تھا چنانچہ انہیں شائستگی مگر سختی سے المیلو سے واپس کر دیا گیا مگر وہ اپنا مطلب پورا کر چکے تھے۔
9-دسمبر 1975ء میں وہ اپنا مشن مکمل کر کے پاکستان واپس چلے گئے اور کہوٹہ کے لئے یورینیم افزودگی کے پلانٹ کے نگران بن گئے۔ پاکستان واپس آتے ہوئے وہ الٹرا سینٹری فیوج کے نقشے بھی ساتھ لیتے آئے تھے۔
10-انہوں نے ڈچ حکومت سے شہریت حاصل کی تا کہ وہ یورٹیکو میں کام کر سکیں۔
11-اگرچہ انہوں نے شالربرگ کی سائنس کانفرنس میں پاکستانی وفد کے ساتھ شرکت کی تھی لیکن انہوں نے کوئی مقالہ نہیں پڑھا اور صرف ایک سوال پوچھا۔
12-انہوں نے یورپ کے تمام متعلقہ فراہم کاروں کی فہرست تیار کی۔ المیلو پلانٹ کے سینٹری فیوجز کے نقشے بنوائے اور انہیں اپنے ساتھ لے گئے۔
یہ چند الزامات مغربی پریس کے پروپیگنڈے اور ڈچ حکومت کی جانبدارانہ تحقیقات کی ایک مختصر جھلک ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مغربی پریس نے اس سے کئی گنا زیادہ الزامات عائد کر کے ڈاکٹر خان کو رسوائے زمانہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔
ہالینڈ کا عدالتی نظام دنیا بھر میں عزت و توقیر کی علامت سمجھا جاتا ہے لیکن ڈاکٹر خان کے معاملے میں انصاف کے

تمام تقاضے نظر انداز کر دیئے گئے اور ڈاکٹر خان پر "جاسوسی اور خفیہ معلومات" حاصل کرنے کی کوشش کے جرم میں نہایت خاموشی کے ساتھ مقدمہ چلایا گیا۔ اصولی طور پر ڈاکٹر خان کو مقدمے کے اندراج سے آگاہ کیا جانا چاہیے تھا لیکن ایسا نہ کیا گیا اور نہ ہی دوران تفتیش انہیں گواہان استغاثہ پر جرح کرنے اور وکیل کی مدد سے اپنے دفاع کا موقع دیا گیا۔ عدالتی نظام کا یہ خاصہ ہے کہ مجسٹریٹ تفتیش مکمل ہونے کے بعد ملزم کو تحریری طور پر تفتیش کے مندرجات سے آگاہ کرتا ہے اور اسے یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اب باقاعدہ مقدمہ چلانے کے لئے وکیل سرکار کو بھیجا جا رہا ہے۔ لیکن ڈچ حکومت نے یہ تمام کاروائی انتہائی خاموشی سے مکمل کی۔ ڈاکٹر خان اور حکومت پاکستان کو باضابطہ مطلع کئے بغیر مقدمہ ماتحت عدالت کے سپرد کر دیا گیا جس نے نہایت عجلت میں کاروائی مکمل کی اور عدالت نے 14 نومبر 1983ء کو یکطرفہ طور پر ڈاکٹر خان کو چار سال قید کی سزا کا حکم سنا دیا۔ یہ سزا انہیں "ہالینڈ" سے جانے کے بعد "خفیہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش اور امن مخالف مقاصد کے تحت غیر محتاط استعمال کے لئے عام کرنے کے مفروضہ جرم میں سنائی گئی جبکہ استغاثہ "جاسوسی" اور خفیہ راز چرانے کے الزامات ثابت نہ کر سکا۔ یہودی پریس نے عدالتی فیصلے کو خراج تحسین پیش کیا اور دنیا بھر میں اس کی خوب تشہیر کی گئی۔ لیکن ڈچ عوام نے اس فیصلے پر شدید ردعمل ظاہر کیا اور اسے غیر منصفانہ اور یکطرفہ قرار دیا جبکہ عالمی ماہرین قانون نے بھی اس فیصلے پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور ڈچ کورٹ کے باہر لوگوں نے مظاہر کیا۔

ڈاکٹر عبدالقدیر کو مقدمہ کے فیصلہ سے تین روز قبل یعنی 11 نومبر کو اطلاع مل گئی تھی کہ ڈچ حکومت انہیں چار سال قید با مشقت کی سزا سنا رہی ہے۔ اس روز وہ کراچی سے اسلام آباد پہنچے تو وہاں ڈیلفٹ یونیورسٹی میں ان کے ہم درس اور ہالینڈ کے شہرہ آفاق ماہر فلزیات انجینئر ڈاکٹر سلے بوس ان کے منتظر تھے۔ وہ اپنے ساتھ ایمسٹرڈیم ٹیلیگراف کا یکم نومبر کا شمارہ لائے تھے جس میں یہ خبر نمایاں انداز میں چھپی تھی کہ 31 اکتوبر 1983 کو ڈاکٹر خان کے خلاف غیر قانونی طور پر "خفیہ معلومات" حاصل کرنے کی کوشش میں قید با مشقت کی سزا پر زور دیا گیا تھا۔ عدالت نے فیصلہ پیر کی صبح 14 نومبر کو دینا تھا۔

چار سال قید با مشقت کی سزا

ڈاکٹر عبدالقدیر خان یہ خبر پڑھتے ہی حرکت میں آ گئے اس روز جمعہ تھا اور تمام سرکاری دفاتر بند تھے۔ انہوں نے اپنا دفتر کھلوایا اور ڈچ عدالت کی یہودی خاتون جج لیسر عیاں کو روزنامہ ٹیلیگراف کی خبر کے حوالے سے ایکسپریس ٹیلیگرام بھیجا جس میں لکھا تھا:

"مجھے آج مورخہ 11 نومبر 83ء کو روزنامہ ٹیلیگراف کا یکم نومبر کا شمارہ ملا ہے جس میں یہ پڑھ کر صدمہ بھی ہوا اور حیرانی بھی کہ میرے خلاف آپ کی عدالت میں ایک مقدمہ زیر سماعت ہے۔ میں مندرجہ ذیل باتیں آپ کے علم میں لانا چاہتا ہوں:

☆ مقدمے کی تمام کارروائی میرے علم میں لائے بغیر کی گئی۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ میرے خلاف الزامات کے دفاع میں پیروی نہیں ہوئی۔ ان حالات میں جبکہ ڈیفنس موجود نہ تھا' ہالینڈ کے قانون کے مطابق مقدمے کی سماعت نہیں ہونی چاہیے تھے۔

☆ بی بی سی کے پنورama پروگرام میں دکھائی جانے والی "اسلامی بم' نامی فلم اور وہ تمام مواد جو روزنامہ دی نائیڈ' دی ٹیلیگراف' دی فولکس کرانٹ میں شائع ہوا ہے وہ غلط اور خود ساختہ الزامات پر مبنی ہے۔ انہوں نے مجھے ایک مخصوص سیاسی منظر میں لا کھڑا کیا ہے۔ ہالینڈ کی عدالتوں کا اپنا ایک سنہری اور آزادی کا شاندار ماضی ہے۔ اس لئے میری استدعا ہے کہ آپ اس مقدمے کو خارج کر دیں۔ میرے نقطہ نظر سے اس مقدمے کا کوئی جواز ہے نہ کوئی قانونی بنیاد اس لئے بھی کہ اس کی سماعت میری عدم موجودگی میں ہو رہی ہے اور مجھے اپنے دفاع اور صفائی کا موقع میسر نہیں۔ میری عدم موجودگی میں مقدمے کا فیصلہ میری قوم' اساتذہ اور دنیا بھر میں پھیلے ہوئے میرے دوست احباب کی نظروں میں میرے وقار کو مجروح کر دے گا' بالخصوص ہالینڈ میں کہ یہاں لوگ ابھی تک میرے بے قصور ہونے پر پورا یقین رکھتے ہیں اور مجھ سے اکثر ملتے رہتے اور میرے ساتھ خط کتابت بھی رکھتے ہیں۔

☆ جناب عالی! اگر بالفرض محال اس جرم کو مان بھی لیا جائے تو اس کا ارتکاب ہالینڈ کی سرزمین پر نہیں ہوا۔ اس سے ہالینڈ کو کوئی نقصان پہنچا ہے نہ ہی ہالینڈ کی سلامتی کو نقصان پہنچانے کے کسی ارادے کا اظہار ہو رہا ہے۔ لہذا درخواست ہے کہ اس مقدمے کو ختم کر دیا جائے۔ میں نے آپ کے ملک کے خلاف کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ آپ کے ملک نے مجھے بہت کچھ دیا ہے۔ اس لئے اس امر کا کوئی امکان نہیں کہ عمر بھر بھی اس کے خلاف کوئی منفی خیال میرے دل میں پیدا ہوگا۔ مگر مجھے اپنے ملک کی مدد و خدمت کرنے کے سلسلہ میں مجرم قرار نہ دیا جائے۔

☆ میں نے 4 اگست 1978ء کو اس وقت کے وزیر خارجہ جناب فن ڈیر کلاؤس کی خدمت میں مسٹر آر ایم ایف فن ڈیر کوان کی وساطت سے ایک طویل اور تفصیلی خط بھیجا تھا۔ مسٹر کوان ان دنوں اسلام آباد میں ہالینڈ کے

سفارتخانے میں سیکنڈ سیکریٹری تھے۔ اس خط کی رسید مجھے دو ہفتے بعد جناب سفیر کی وساطت سے مل گئی تھی۔ میں نے اس خط میں تمام حالات پر روشنی ڈالی تھی اور ضروری کاغذات اور فوٹو نقلیں بھی ساتھ منسلک کی تھیں جن سے میری پوزیشن واضح اور بے داغ ثابت ہوتی ہے۔

ڈاکٹر خان کے خلاف ڈچ عدالت کے مقدمے اور ان کی سزایابی پر عالمی شہرت یافتہ وکیل ڈاکٹر ڈین ڈرائیور کو بھی وکلائے صفائی میں شامل کیا گیا۔ مقدمے کی کارروائی اور اپیل پر کام کی نگرانی کے لئے پاکستان کے مایہ ناز قانون دان ایس ایم ظفر اور سابق مغربی پاکستان کے سابق ایڈووکیٹ جنرل مسٹر ایم بی زمان کو ہالینڈ بھیجا گیا۔ دونوں نے نہایت مستعدی سے یک جان ہو کر کام کیا۔

ڈاکٹر خان نے اس مقدمے پر خود بھی بے حد محنت کی اور سازش کا ایک حصہ تشت از بام کیا جس میں ہالینڈ میں واقع پاکستان فارن آفس بھی برابر کا شریک تھا۔ جس وقت ہالینڈ کی عدالت ڈاکٹر خان کے خلاف مقدمہ چلا رہی تھی' فارن آفس کا عملہ میٹھی نیند سو رہا تھا اور کسی نے حکومت پاکستان اور ڈاکٹر خان کو اس صورتحال سے آگاہ کرنے کی کوشش نہیں کی لیکن جونہی ڈاکٹر خان کو 4 سال قید با مشقت کی سزا سنائی گئی' فارن آفس میں کھلبلی مچ گئی۔ حکومت پاکستان نے بعجلت تمام ہالینڈ کی اعلیٰ عدالت میں اپیل دائر کرنے کا فیصلہ کیا اور ادھر ڈاکٹر خان نے بھی فوراً ہالینڈ میں پاکستانی سفیر ڈاکٹر خورشید حیدر کے ذریعے ہائیکورٹ میں اپیل داخل کر دی۔ اس مقصد کے لئے ہالینڈ کے ایک سابق سینٹر اور مشہور قانون دان ڈاکٹر ولیم رسل کی خدمات حاصل کیں گئیں جبکہ ہیگ کی مشہور قانونی فرم بلیک سٹون کے ایک نوجوان اور قابل وکیل کو بھی مقرر کیا گیا۔ ڈاکٹر خان خود پر عائد الزامات کو بے وقعت ثابت کرنے کے لئے عالمی سائنسدانوں کے طریقہ کار پر مبنی دلائل اکٹھے کرتے رہے۔ ایک دوست کے بقول ڈاکٹر خان نے اس مقدمے پر اتنی محنت کی کہ اپنی زندگی کے کم از کم دس سال اس میں ضائع کر دیئے۔ ڈاکٹر خان نے از خود دنیا کے بڑے بڑے ماہر قانون دانوں' اساتذہ اور سائنسدانوں سے رابطے کر کے انہیں مقدمہ کی تفصیلات سے آگاہ کیا۔ ان سب نے ڈاکٹر خان سے صاف صاف کہا کہ ان کے خلاف مقدمہ غیر قانونی اور بدنیتی پر مبنی ہے۔

مقدمہ کے خلاف اپیل دائر کرنے کے دوران ڈاکٹر خان کو ذہنی طور پر شدید دھچکا اس وقت لگا جب اٹیمی تو انائی کمیشن کے کارپردازوں نے ان سے تعاون نہ کیا۔

ڈاکٹر خان کو اٹیمی تو انائی کمیشن کی لائبریری سے ایک ایسا عالمی رسالہ درکار تھا جن میں شائع ہونے والے مضامین بطور ڈھال ان کے لئے مفید ثابت ہو سکتے تھے مگر یہ رسالہ انہیں فراہم نہ کیا گیا تو ڈاکٹر خان کو مجبوراً ہالینڈ سے ہی یہ رسالہ منگوانا پڑا۔

اس مقدمہ کا ایک خوفناک پہلو یہ تھا کہ حکومت نے اس مقدمے کے سلسلے میں کسی قسم کی دلچسپی نہیں لی اور ڈاکٹر خان سے کہا کہ وہ سزا کی پروانہ کریں۔ انہیں کونسا ہالینڈ جانا ہے۔ ڈاکٹر خان نے راقم سے اس مقدمے کے حوالے سے فرمایا:

"حقیقت تو یہ ہے کہ اس مقدمے سے ظاہری طور پر مجھے کوئی نقصان نہیں تھا لیکن میں تاریخ کا طالب علم ہوں اور اللہ سے بہت ڈرتا ہوں۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ جب میں نے کوئی غلط کام کیا ہی نہیں تو اس کا الزام کیوں برداشت کروں۔ ہالینڈ اور امریکہ کہہ رہا تھا کہ قدیر خان ایک جاسوس اور چور سائنسدان ہے۔ میں اسے کسی صورت برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ آنے والے وقت میں میری نسل کو یہ کہا جائے کہ تمہارا باپ ایک چور سائنسدان تھا۔ میں نے مقدمہ لڑا اور اس کے لئے میں نے اپنے عزیز دوست ایس ایم ظفر کو بطور وکیل مقرر کیا۔ وزارت قانون کی جانب سے ایم بی زماں ایڈووکیٹ مقرر کئے گئے۔ ایس ایم ظفر کی معاون کرتے تھے ایس ایم ظفر صاحب مجھے اعتماد تھا۔ اگر چہ ضیاء الحق اور منسٹر آف لا ان سے نالاں تھی۔ مگر میں نے کہہ دیا کہ ایس ایم ظفر میرے انارنی ہوں گے۔ میں نے حکومت سے کہہ دیا کہ اگر مجھے اپنی مرضی کا وکیل نہ کرنے دیا گیا تو میں ملک چھوڑ کر دوبئی چلا جاؤں گا اور کام اس وقت واپس آ کر کروں گا جب میرا مقدمہ ختم ہو جائے گا۔ لہٰذا حکومت میرے دباؤ میں آ گئی۔ دراصل میں کوئی کام بیوروکریسی پر نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ ان کی میرے مقدمہ میں دلچسپی ظاہر ہو چکی تھی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے مقدمہ کو خراب کرے۔ ایس ایم ظفر کی صلاحیتوں کو میرے ڈچ وکلاء نے بھی سراہا۔ جو نظریہ ظفر صاحب نے پیش کیا وہ بالکل صحیح تھا اور عدالت نے وہی نظریہ قبول بھی کیا۔

ایس ایم ظفر صاحب نے بھی اس مقدمہ کی پوری تفصیل اپنی تصنیف "میرے مشہور مقدمے" میں بیان کر دی ہے جس میں انہوں نے اس مقدمے کے محرکات ہالینڈ اور پاکستانی حکومت کی مجرمانہ چشم پوشیوں اور رکاوٹوں کا مفصل ذکر کیا ہے۔

تقریباً دو سال کی قانونی اور سفارتی اعصاب شکن جنگ کے بعد 28 مارچ 1985 کو عدالت نے ڈاکٹر خان کو تمام الزامات سے باعزت بری کر دیا۔ ڈاکٹر خان کو باعزت بری کر کے نہ صرف ان کے وقار کی علامت بن گیا بلکہ یہ

پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے پر امن ہونے کا اعتراف بھی تھا۔

یہودی پریس نے اپنے طور پر ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو ذہنی طور پر دو سال تک منتشر کئے رکھا لیکن یہ اس کی خام خیالی تھی۔ 1985ء تک پاکستان یورینیم کی افزودگی میں مکمل کامیابی حاصل کر چکا تھا اور کہوٹہ پراجیکٹ بھی تکمیل کے مراحل سے گزر چکا تھا۔ ڈاکٹر خان کی جفاکش ٹیم اب مغرب کے سینے پر مونگ دل رہی تھی اور خطرات کو پس پشت ڈال کر "اسلامی بم" کا خواب شرمندہ تعبیر ہو چکا تھا۔ ادھر امریکہ کو پاکستان کی ایٹمی سرگرمیوں کی خبریں متواتر موصول ہو رہی تھیں اور پاکستان کو ہر قسم کی مالی امداد سے محروم کرنے کے لئے دباؤ ڈالا جا رہا تھا۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خان اپنے عظیم مقصد میں کامیاب ہو چکے تھے۔ اس دوران انہوں نے میزائل سازی کا بیڑہ بھی اٹھایا اور 89ء میں پاکستان کو عنزہ کے نام سے جدید میزائل کا تحفہ دیا۔ یوں کہوٹہ پراجیکٹ میزائلوں کی کھیپ در کھیپ پاکستانی افواج کے سپرد کرنے لگا۔

ڈاکٹر خان اندرونی و بیرونی محاذ پر اپنے مخالفین سے نبرد آزما بھی ہوتے رہے اور اپنے کام کی رفتار میں بھی کمی واقع نہ ہونے دی۔ حکومت پاکستان نے ان کی خدمات کے عوض انہیں 23 مارچ 1990ء کو ہلال امتیاز سے نوازا انہوں نے اس اعزاز کے بدلے میں پاکستان کو عنزہ میزائل اور دیگر ہتھیاروں کے تحفے دیئے اور بالآخر 98ء میں غوری جیسے مہلک اور جدید ترین میزائل پیش کر دیئے۔

قسط نمبر 17

ڈاکٹر خان پر نواز شریف کا حملہ

1993ء میں میاں نواز شریف بظاہر طاقتور وزیر اعظم تھے مگر ایوان صدر جی ایچ کیو اور پرائم منسٹر ہاؤس کے درمیان ایک سیاسی دلدل تیار ہو رہی تھی جس میں لامحالہ میاں نواز شریف نے دھنس جانا تھا۔ وزیر اعظم نواز شریف کو معلوم ہوا کہ صدر غلام اسحاق خان اسمبلیاں توڑ کر ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو نگران وزیر اعظم بنانا چاہتے ہیں۔ نواز شریف اور غلام اسحاق تعلقات میں دراڑوں کا ایک وسیع پس منظر تھا لیکن اسٹیبلشمنٹ نے اس میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو بلاوجہ ملوث کر دیا اور نواز شریف اور ان کے درمیان شخصی تصادم کی راہ ہموار کی جانے لگی۔ غلام اسحاق خان کسی مضبوط شخصیت کو نگران وزیر اعظم بنا کر نواز شریف کی مقبولیت ختم کرنا چاہتے تھے۔ مگر سیاسی چتا میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی نیک نامی اور وقار کو بھینٹ چڑھانے کا منصوبہ پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا کیونکہ ڈاکٹر خان نے سیاسی دلدل میں اترنے سے انکار کر دیا تھا۔

صدر غلام اسحاق خان نے نواز شریف حکومت برخاست کر دی لیکن سپریم کورٹ نے معزول حکومت کو چالیس روز کے چلہ کے بعد بحال کر دیا۔ مگر نواز شریف کے دل میں ڈاکٹر خان کے لئے گرہ پڑ گئی تھی۔ لہٰذا چند مخصوص ہاتھوں نے دونوں طرف خوب آگ بھڑکائی۔ انہی دنوں نواز شریف بیرون ملک گئے تو ان کے پیچھے سی ڈی اے نے آپریشن بنی گالہ کی آڑ میں ڈاکٹر خان کے خلاف انتقامی کاروائی شروع کر دی۔

بنی گالہ میں ڈاکٹر خان نے زندگی بھر کی کمائی سے اپنی شریک حیات کے لئے ایک ایسا گھر تعمیر کیا تھا جو بقول ڈاکٹر خان انہوں نے زندگی میں پہلی بار اپنی بیگم کی خواہش کے احترام میں اسے پہلے تحفہ کے طور پر دیا تھا۔ اس گھر کی تعمیر میں ڈاکٹر خان اسی طرح جذباتی تھے جس طرح انہوں نے KRL کی بنیاد رکھی اور اس کی تعمیر کی تھی۔ یہ گھر راول ڈیم کے قریب واقع ہے اس جگہ گھر بنانے کی وجہ یہ تھی کہ بیگم ہینی کو یہاں ایک ایسا منظر دیکھنے کو ملتا تھا جو منظر کبھی ہالینڈ میں اپنے آبائی گھر میں دیکھتی تھی۔ ہالینڈ کے اس گھر کی کھڑکیاں دریائے رائن کی جانب کھلتی تھیں۔ بیگم ہینی کو یہ منظر بے حد پسند تھا۔

ڈاکٹر خان کا کہنا ہے کہ وہ اس گھر کے سوا اپنی بیگم کو کچھ نہیں دے سکے جبکہ بدلے میں اس خاتون نے ان کے اور ملک کے لئے اپنے جذبات 'حقوق' مال کی قربانیاں دی ہیں اور اس خاتون کی بدولت ہی وہ مکمل سکون اور یکسوئی کے ساتھ ایٹم بم کے محاذ پر ڈٹے رہے ہیں۔

آپریشن بنی گالہ کا اصل مقصد ڈاکٹر خان کو ذہنی و مالی نقصان پہنچانا اور دنیا کو یہ باور کرانا تھا کہ انہوں نے زمین پر ناجائز قبضہ کیا ہے۔ آپریشن بنی گالہ کی نگرانی روئیداد خان نے کی جبکہ CDA کی نمائندگی اس وقت کے ڈائریکٹر لینڈ خالد خان طور نے کی تھی۔ انور سیف اللہ، نواز کھوکھر، ملک نعیم اور CDA کے چیئرمین میاں فرید ایک وفد کی صورت میں اسلام آباد میں واقع KRL کے گیسٹ ہاؤس میں گئے اور ڈاکٹر خان سے کہا کہ وہ بنی گالہ سے اپنی رہائش ختم کر دیں۔

ڈاکٹر خان کو اپنے ذرائع سے معلوم ہو چکا تھا کہ نواز شریف کی کچن کیبنٹ اپنے وزیر اعظم کی اجازت سے ان کے خلاف میدان میں اتری ہے۔ انہوں نے آپریشن بنی گالہ کی وجہ پوچھی تو انہیں جواز پیش کیا گیا۔

''ڈاکٹر صاحب حکومت کے علم میں آیا ہے کہ راول ڈیم کی جھیل آلودہ ہو گئی ہے جس سے اسلام آباد کی فضا زہریلی ہونے کا خدشہ ہے۔ اس لئے CDA نے فیصلہ کیا ہے کہ بستی بنی گالہ کو ہموار کر کے جھیل کو کشادہ کر دیا جائے''۔

ڈاکٹر خان نے ان کی معلومات اور جواز کو تسلیم نہ کیا تو اس پر انہیں آفر دی گئی۔

''ڈاکٹر صاحب! آپ کو اسلام آباد میں بہترین جگہ پر کمرشل اور رہائشی پلاٹ دیئے جا سکتے ہیں۔ آپ پلازہ لے لیں۔ مگر آپ راستے سے ہٹ جائیں۔ یہ جگہ تجاوزات میں آتی ہے۔ ہم راتوں رات اس کو مسمار کر دیں گے''۔

''یہ غیر قانونی اور انتقامی حرکت ہو گی۔ میں جانتا ہوں اس کی اصل وجہ یہ نہیں ہو سکتی''۔ ڈاکٹر خان نے اپنی فطرتی سچائی کے ساتھ بے باکی سے بات کی اور کہا۔ ''اگر اس جگہ پر ناجائز قبضہ کیا گیا ہے تو آپ کو پہلے کیوں نہیں خبر ہوئی۔ کیا آپ اس وقت سو رہے تھے جب میں نے یہ جگہ خریدی تھی''۔ انہوں نے CDA کے چیئرمین سے پوچھا ''کیا آپ نے میرے پلاٹ اور گھر کے کاغذات دیکھے ہیں۔ کیا یہ جعلی دستاویزات ہیں''۔

پھر انہوں نے وفد سے دوٹوک بات کی۔

''میں نے یہ جگہ اوپن مارکیٹ سے خریدی ہے۔ ضلع کونسل اسلام آباد سے نقشہ پاس کرایا ہے۔ تحصیلدار جناب فرخ کو میں نے یہاں بلایا' جہاں آپ بیٹھے ہیں۔ اپنی تسلی کے لئے اس سے پوچھا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب اس جگہ کا کوئی جھگڑا نہیں اور نہ ہی یہاں گھر بنانا غیر قانونی ہو گا۔ آپ انہیں بلا کر پوچھیں۔ پھر میں نے انتقال کرایا۔ واپڈا نے کنکشن دیا۔ ٹیلیفون لگے۔ یہ سب ناجائز نہیں تھا۔ بلکہ قانونی عمل ہوا ہے۔ آپ لوگ مجھے

یہاں سے نکل جانے کے لئے مجبور نہیں کر سکتے ۔ میں عدالت سے رجوع کروں گا۔"
اس پر نواز کھوکھر نے کہا "ڈاکٹر صاحب آپ جب تک عدالت کے دروازے تک پہنچیں گے ۔ آپ کا گھر اور سارا بنی گالہ مسمار ہو چکا ہوگا۔"
وفد ڈاکٹر صاحب کو دھمکیاں دے کر چلا گیا ۔ ڈاکٹر خان نے راتوں رات ایس ایم ظفر سے رابطہ کیا اور عدالت سے رجوع کیا ۔ جس پر عدالت نے حکومتی اقدام کو غلط قرار دیا اور فیصلہ میں پوری بستی بنی گالہ کو جائز قرار دیتے ہوئے لکھا ۔
"ڈاکٹر عبدالقدیر خان جیسے محسنوں کے لئے ایک گھر تو کیا پوری بستیاں اور شہر حاضر ہیں" زندہ قومیں اپنے محسنوں کو اذیتیں نہیں دیا کرتیں ۔"
یہ عہد ساز عدالتی فیصلہ حکومت کے منہ پر طمانچہ تھا ۔ کسی نے دوبارہ بنی گالہ کی طرف رخ نہ کیا ۔ البتہ اس آپریشن میں بستی کے مکینوں کا لہو بہہ چکا تھا اور ہلاکتیں بھی ہوئیں ۔
وزیراعظم نواز شریف نے بعد ازاں ڈاکٹر خان کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ انہوں نے آپریشن بنی گالہ کا حکم نہیں دیا تھا ۔ لیکن قد آور شخصیات کے خلاف جب بھی کوئی کارروائی کی جاتی ہے اسے اعلیٰ حکومتی احکامات کے بغیر انجام نہیں دیا جا سکتا ۔ سیاستدانوں کے منافقانہ رویوں کے باوجود ڈاکٹر خان نے ان کے بارے میں نرم گوشہ ہی رکھا ہے اور انہوں نے 1998ء میں نواز شریف کو ہیرو بنا دیا ۔ نواز شریف ایٹمی دھماکوں کے باعث دنیا بھر میں مقبول ہو گئے اور انہی دھماکوں کا صدقہ ہے کہ وہ جان بچا کر سعودیہ میں بیٹھے ہیں ۔
ذرائع کا کہنا ہے کہ جس طرح بھٹو کی پھانسی معاف کرانے کے لئے ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے ضیاء الحق سے سفارش کی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ بھٹو جیسا ذہین سیاستدان پھانسی سے بچ جائے مگر ضیاء الحق ضد پر اڑ گئے تھے اور انہوں نے کہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب بھٹو کے بدلے کچھ اور مانگ لیں اسی طرح انہوں نے نواز شریف کو بچانے کے لئے فوج کا دل نرم کیا اور سعودی عرب جو ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو محسن اسلام سمجھتا ہے اس نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے کہنے پر نواز شریف خاندان کو اپنے ملک میں پناہ دی ہے ۔

بے نظیر کی عجیب و غریب فرمائش

بے نظیر بھٹو ہمیشہ امریکہ کے مشروط تعاون پر حکومت میں آتی جاتی رہی ہیں ۔ 1994ء میں بے نظیر نے امریکہ کو یہ عہد دیا تھا کہ وہ اب گذشتہ غلطیاں نہیں دہرائیں گی لہٰذا انہیں ایک موقع اور دیا جائے ۔ امریکہ کو یہ اطلاع مل چکی تھی کہ پاکستان ایٹم بم بنا چکا ہے ۔ لہٰذا اس نے بینظیر سے وعدہ لیا کہ وہ ایٹمی پروگرام منجمد کر دیں گی ۔ بے نظیر حکومت نے اپنے پہلے دور حکومت میں جس طرح سینڈک جیسی سونے کی کان کے منصوبے پر مشروط محبت کے تحت چشم پوشی اختیار کی تھی اقتدار میں آتے ہی اس نے KRL میں ایٹم بم کے منصوبوں کو تعطل پذیر کرنے اور پھر مکمل طور پر منجمد کرنے کا عمل شروع کر دیا ۔
اپریل 1994ء میں ٹالبوٹ نے پاکستان کا دورہ کیا تو بے نظیر سے ایفاء عہد کے لئے کہا ۔ اسے جب پاکستانی افواج اور عوام کی KRL سے وابستگی کا احساس ہوا تو اس نے خاموشی سے اس عہد کو پورا کرنے کے لئے کہا "لہٰذا وزیراعظم بے نظیر بھٹو نے اگست 1994ء کو ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو اپنے پاس بلایا اور کہا
"ڈاکٹر صاحب! اگر امریکہ KRL میں ایک کیمرہ لگا لے تو کیا حرج ہے ؟"
ڈاکٹر خان کو معاملے کی تہہ میں پہنچتے دیر نہ لگی ۔ فوراً کہا ۔
"محترمہ بات کیمرے کی نہیں ہے ۔ یہ بات بہت دور تک جائے گی ۔ امریکہ کا جاسوس کیمرہ پاکستان کی سلامتی اور وقار کو تباہ کر دے گا ۔"
"ڈاکٹر صاحب آپ اس بات کی فکر نہ کریں ۔ ملک کی سلامتی اور وقار کا خیال ہم بہت بہتر طریقے سے کر سکتے ہیں ۔" بے نظیر بھٹو نے انہیں قائل کرنا چاہا ۔
"اگر آپ یہی چاہتی ہیں تو پھر ٹھیک ۔ میں استعفیٰ دے دیتا ہوں ۔ کیونکہ یہ کام میری موجودگی میں نہیں ہو سکتا ۔"
ڈاکٹر خان کی دوٹوک اور فیصلہ کن بات سے بے نظیر گھبرا گئیں کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ ان حالات میں کہ جب امریکہ پاکستان پر ایٹمی توانائی کی وجہ سے پابندیاں لگانے کے لئے دھمکیاں دے رہا ہے اگر ڈاکٹر خان نے استعفیٰ دے دیا تو عوام کا غیض و غضب ان کی حکومت کے لئے خطرہ ثابت ہو گا ۔ لہٰذا انہوں نے KRL میں کیمرہ لگانے کا منصوبہ ختم کر دیا ۔ لیکن امریکہ کا یہی منصوبہ ایک اور شکل میں ظاہر ہو گیا جب پرویز مشرف حکومت نے ڈاکٹر خان کو مشروط معاہدے کے تحت KRL کی ذمہ داریوں سے ریٹائر کر دیا اور KRL کی ذمہ داری کچھ خاص مقاصد کے لئے ایک جنرل کے سپرد کر دی جو فی الحال "GHQ" کی ہدایات کے مطابق KRL کی نگرانی کر رہا ہے ۔

الوداع کھوٹہ

11 ستمبر 2001 سے چند روز قبل امریکہ نے MTCR کے تحت پاکستان پر ایک بار پھر پابندیاں عائد کر دی تھیں اور الزام لگایا کہ پاکستان میزائل سازی اور جدید ٹیکنالوجی کے عالمی معاہدوں کی خلاف ورزی کر رہا ہے سو اس پر پابندیاں ضروری ہیں۔ 11 ستمبر کے روز امریکہ میں دہشت گردی ہوئی تو امریکہ نے افغانستان میں القاعدہ اور طالبان کے خلاف جنگی بنیادوں پر آپریشن شروع کیا اور پاکستان کو اپنے احکامات وہدایات کا پابند بنا کر اسے یہ خوف دلا کر کہ اسکے کھوٹہ پراجیکٹ کو بنیاد پرستوں سے خطرات ہیں، اسکی امریکی انداز میں مانیٹرنگ شروع کر دی۔ پاکستان نے اپنی سلامتی اور عالمی دباؤ کے تحت اپنا کردار نبایا جس سے دنیا نے یہ باور کرلیا کہ پاکستان کو اسکے کردار کا اجر ضرور ملے گا۔ مارچ 2003ء میں امریکہ نے جب اتحادیوں کے ساتھ مل کر عراق پر حملہ کر دیا اور اسے وہاں شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تو امریکہ نے واویلا مچانا شروع کر دیا کہ انہیں معلوم ہوگیا ہے کہ عراق کی مدد ایران اور شام کر رہے ہیں اور انہیں یہ بھی معلوم ہوگیا ہے کہ ان دونوں ممالک کے پیچھے کون ہے؟ یہ اشارہ پاکستان کی جانب تھا۔ اس دوران روس بھی عراق میں امریکہ کی وحشیانہ بمباری سے تنگ آ کر چیخا تو امریکہ کو خدشہ لاحق ہوگیا یا پھر اس کے کان بھر دیئے گئے کہ پاکستان کا کھوٹہ مرکز اسلامی ممالک کی توقعات پوری کرسکتا ہے یا پھر پاک کوریا ایٹمی معاہدہ ہوگیا تو خطے میں امریکہ کیلئے خطرات بڑھ جائیں گے۔۔۔۔ لہٰذا پاکستان کی پہلے خبر لو۔ پس امریکہ نے مارچ 2003 کے آخری ہفتے میں پاکستان کے ایٹمی مرکز کھوٹہ پر دو سال کے لئے تجارتی پابندیاں لگا دیں اور کہا کہ پاکستان کسی قسم کی خرید وفروخت نہیں کرسکتا۔ امریکہ نے پابندی کا جواز یہ بتایا کہ پاکستان کا کوریا کے ساتھ ایٹمی ٹیکنالوجی کے بدلے میزائل ٹیکنالوجی کا لین دین ثابت ہوگیا ہے۔ کھوٹہ پر یہ پابندی نئی نہیں تھی۔ اس نئی پابندی کا پس منظر نہایت گھناؤنا ہے۔ پریسلر اور سمنگٹن ترامیم جو عرصہ دراز سے کھوٹہ کے سر پر لٹک رہی تھیں اپریل 1998ء میں غوری میزائل کے منظر عام پر آنے کے بعد ان کا دائرہ مزید وسیع کر دیا گیا تھا۔ MTCR یعنی میزائل کنٹرول ٹیکنالوجی معاہدے کے تحت نئی پابندیوں کے لئے امریکی سینٹ میں قانون سازی شروع ہوگئی تھی۔ امریکی محکمہ خارجہ نے مئی 1998ء کے آغاز میں اس امر کی تصدیق بھی کر دی تھی کہ پاکستان میزائل سازی میں حدود کراس کر گیا ہے لہٰذا عنقریب پاکستان پر میزائل سازی اور ٹیکنالوجی کے لین دین پر پابندی کر دی جائے گی۔ ان دنوں مسودہ تیار ہو رہا تھا کہ پاکستان نے ایٹمی دھماکے کر دیئے۔ ان ایٹمی دھماکوں کے بعد امریکہ نے پاکستان پر دباؤ ڈالنا شروع کیا اور وزیر اعظم نواز شریف سے کہا کہ وہ کھوٹہ پر پابندی عائد کرنے میں تعاون کریں۔ لیکن ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی موجودگی میں کوئی بھی سول حکومت امریکہ کے آگے گھٹنے نہیں ٹیک سکتی تھی۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے واضح الفاظ میں وزیر اعظم تک یہ پیغام پہنچا دیا کہ وہ یقیناً ایسے معاہدے پر دستخط نہیں کریں گے جس سے ڈاکٹر اے کیو خان لیبارٹریز کو عالمی ادارے مانیٹر کرنے لگ جائیں۔ اور نہ ہی ایسا کوئی سسٹم بنایا جائے کہ جس کے تحت کھوٹہ میں جاری کام کا طریقہ کار متاثر ہو۔

بیوروکریسی' امریکی ایجنٹوں اور نواز حکومت پر پابندیوں کی عملداری کے لئے امریکی دباؤ تھا۔ یہ تمام قوتیں محض ایک فرد واحد ڈاکٹر خان کی وجہ سے اپنے آقاؤں کو خوش کرنے میں نا کام ہو رہی تھیں۔ کیونکہ ڈاکٹر خان سے زیادہ ٹھوس اور بے لوث شخص کوئی اور نہ تھا جو سینہ تان کر کھوٹہ کو امریکی یلغار سے بچا سکتا۔ ان حالات میں ڈاکٹر خان کو راستے سے ہٹانے کا پروگرام بنایا گیا اور ان کے خلاف "منیر لابی" کو متحرک کر دیا گیا۔ ڈاکٹر ثمر مبارک اور ایٹمی توانائی کمیشن نے کہنا شروع کر دیا کہ ڈاکٹر خان کا ایٹم سازی میں کوئی کردار نہیں۔ اس پر ڈاکٹر خان نے مستعفی ہونے کا ارادہ بھی کر لیا مگر جنرل جہانگیر کرامت کی سرزنش کے بعد مخالف لابی کے منہ بند کر دیئے گئے۔ لیکن جب 12 اکتوبر 1999ء میں فوج نے اقتدار سنبھالا تو ڈاکٹر خان کے خلاف متحرک یہودی لابی اور اس کے کارندوں نے ایک بار پھر ان کا راستہ کاٹنے کی کوششیں کیں۔ اس بار مخالف لابی نے فوج کو ڈاکٹر خان کے خلاف استعمال کرنے کا فیصلہ کیا اور چیف ایگزیکٹو صاحب کے حکم پر SPD کے نام سے ادارہ بنا دیا گیا جس کے سربراہ جنرل خالد احمد قدوائی مقرر کیے گئے۔ اس ادارہ کے قیام کا مقصد کھوٹہ پراجیکٹ کو مانیٹر کرنا تھا۔ اس کی مرضی کے بغیر کوئی نیا تحقیقی کام نہیں ہوسکتا تھا۔ اس ادارے کے قیام کا ایک مقصد ڈاکٹر خان کی جرأت اور سرگرمیوں کو بھی قابو کرنا تھا۔ ڈاکٹر خان کو بھٹو سے لے کر نواز شریف تک ہر حکمران سے ون ٹو ون ملاقات کا اختیار حاصل تھا۔ وہ اپنی ملاقات کے دوران کھوٹہ کے تمام پیچیدہ معاملات کو فوری حل کرا لیتے تھے۔ انہیں کسی حکمران نے اس معاملے میں تنگ نہیں کیا تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ڈاکٹر خان جو کہہ رہے ہیں وہ ملکی مفاد کے لئے محفوظ اور بہتر ہوگا۔ البتہ نواز شریف جب دوسری بار اقتدار میں آئے تو وہ ڈاکٹر خان سے خاصے بدگماں ہوگئے تھے۔ اس کی شاید یہ وجہ تھی کہ نواز شریف عقل سے قدرے کورے تھے اور انہیں کھوٹہ کی باریکیوں اور ضرورتوں سے آگاہی نہیں تھی پھر وہ اپنے "آقاؤں" کے اشاروں کے تحت چشم پوشی اختیار کرتے تھے۔ ڈاکٹر خان جب ان کے پاس کھوٹہ کا کوئی کام لے کر

جاتے تھے تو وہ تردد سے کام لینے لگ جاتے تھے۔

فوجی حکومت نے آتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ڈاکٹر خان کی وزیراعظم ہاؤس اور ایوان صدر میں ملاقاتوں کو نئے سسٹم میں لانے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر خان کو اس پر کوئی اعتراض نہ تھا لیکن انہیں معلوم تھا کہ کھوٹہ کے کام کا ایک اپنا طریقہ کار اور فول پروف رازداری ہے جو بیوروکریسی کے مخصوص طریقہ کار کے تحت نہیں چل سکتا۔ فوری تحقیق نوعیت کے کاموں میں ڈاکٹر خان نہایت مستعدی اور سرگرمی سے کام لیتے تھے لیکن جب انہیں SPD کے جنرل صاحب کے حضور پیش ہونے کا پابند بنایا جانے لگا تو معاملہ بگڑ گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ SPD کا اصل مقصد ان امریکی پابندیوں کی راہ ہموار کرنا ہے جو پاکستان میں یورینیم کی افزودگی کے عمل کو روکنے کے لئے لگائی جاتی رہی ہیں۔ ڈاکٹر خان سمجھوتے کے قائل نہیں اور نہ ہی ان کی فطرت میں جھکنا لکھا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ڈاکٹر خان نے ان حالات میں واضح کہہ دیا تھا کہ یہ سارا عمل انہیں کھوٹہ سے ہٹانے اور کھوٹہ کے پراجیکٹ کو منجمد کرنے اور اس کے کلچر کو تبدیل کرنے کے لئے کیا جا رہا ہے۔

ایٹمی دھماکوں کے بعد حکومت نے ڈاکٹر خان کو تاحیات چیئرمین بنانے کا بھی فیصلہ کیا تھا کیونکہ یہ ان کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کا بہترین تحفہ تھا۔ لیکن جب ڈاکٹر خان نے دیکھا کہ فوجی حکومت کھوٹہ کے معاملے میں انہیں جھکانا چاہتی ہے تو وہ شیر کی مانند انگڑائی لے کر بیدار ہو گئے۔ انہوں نے کسی قسم کا سمجھوتہ نہ کیا۔ فوج نے بالآخر انہیں ریٹائر کر دیا۔ ڈاکٹر خان کی یہ ریٹائرمنٹ معمول کا حصہ تھی اور سروس رول کے مطابق مارچ 2001ء کو انہیں ریٹائر ہو جانا تھا جس کے بعد یہ طے تھا کہ حکومت انہیں تاحیات چیئرمین بنا دیتی۔ مگر ڈاکٹر خان چونکہ سودے بازی کے خلاف تھے لہٰذا انہوں نے ریٹائر ہونا ہی گوارا کیا۔ ڈاکٹر خان کی ملازمت میں پہلے دو بار توسیع کی جا چکی تھی۔ ملکی قانون کے مطابق انہیں 1996ء میں ریٹائر ہونا تھا لیکن بے نظیر بھٹو حکومت نے ان کی ملازمت میں 3 سال توسیع کر دی۔ اس کے بعد میاں نواز شریف نے 99ء میں دو سال مزید اضافہ کر دیا جس کے بعد انہیں 2001ء میں ریٹائر کیا جانا تھا۔

فوجی حکومت کو معلوم تھا کہ پوری قوم چاہتی ہے کہ ڈاکٹر خان تاحیات کھوٹہ کے چیئرمین رہیں اور ان سے ان کے شایان شان سلوک کیا جائے۔ لہٰذا انہیں چیف ایگزیکٹو کے مشیر برائے سٹریٹیجک پروگرام بنایا گیا جسے ڈاکٹر خان نے یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ انہیں اب کسی عہدے کی ضرورت نہیں۔ وہ ذاتی طور پر سماجی بہبود کے کام کرنا اور گھر والوں کو وقت دینا چاہتے ہیں۔ قوم نے ڈاکٹر خان کی ریٹائرمنٹ کے پس منظر میں کارفرما سازش کو محسوس کر لیا تھا۔ ڈاکٹر خان کو کھوٹہ افیئرز کے مشیر کے طور پر بھی اضافی عہدہ دیا گیا۔ کھوٹہ ڈاکٹر خان کو اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے اور یہ ان کی کمزوری ہے لہٰذا انہوں نے یہ مشاورت قبول کر لی۔

ڈاکٹر خان کی ریٹائرمنٹ سے حکومت کے راستے صاف ہو گئے۔ امریکہ بھی خوش ہو گیا لیکن قوم کو جرنیلوں کے اس اقدام پر بے حد رنج ہے کہ ڈاکٹر خان کو نالائق وزیروں مشیروں کی صف میں کیوں کھڑا کر دیا گیا ہے۔ قوم کھوٹہ کے معاملے میں بھی بے حد حساس ہے۔ فوج ہمارا مقدس ادارہ ہے۔ ڈاکٹر خان کو کھوٹہ کے منظر سے ہٹانے میں یہ مقدس ادارہ ملوث نہیں۔ یہ محض این جی اوز مافیا کے ہاتھوں سرگرم چند جرنیلوں کی ہٹ دھرمی کا نتیجہ ہے۔ اس میں ایسے جرنیل بھی شامل ہیں جو ایک زمانے میں ڈاکٹر خان کا بریف کیس اٹھاتے تھے اور انہیں دیکھ کر ادب سے ان کی گردن جھک جاتی تھی لیکن آج یہ لوگ ڈاکٹر خان کو سٹک کے اشارے سے بلانا' ملاقات کے دوران لائن میں لگنے اور جھکنے کے لئے مجبور کرنا چاہتے ہیں' لیکن تقدیر جب خود اپنے قدیر کی حفاظت پر مامور ہو تو وہ اپنے برگزیدہ بندوں کو نہ جھکنے دیتی ہے نہ ان کی عزت پامال ہونے دیتی ہے۔

کھوٹہ اب فوج کی صوابدید اور ہدایت کے تحت عمل پیرا ہے اور GHQ کی مرضی کے بغیر اسے سانس لینے کی بھی اجازت نہیں رہی۔ ایک ایسا ادارہ جو اپنے وسائل خود پیدا کرتا اور آزادی سے کام کرتا تھا۔ بالآخر امریکی خواہشات کی نذر ہو گیا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب کسی قوم یا ادارے کی اپنی ثقافت اور نظام ختم کیا جاتا ہے تو وہ تباہ ہو جاتا ہے۔ کھوٹہ کا کلچر بھی تباہ ہو گیا ہے' الوداع اے کھوٹہ تو نے کمزور پاکستان کو زندگی دی۔ تو نے انہیں توانا بنایا جنہوں نے 71ء میں ہتھیار پھینک دیئے۔ آج انہوں نے تیرے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے ہیں۔

قسط نمبر 18

منیر احمد خان

امریکی ایجنٹ

اس ایمان فروش اور کینہ پرور شخص کا اصلی چہرہ جس نے ایٹمی توانائی کمیشن کو نمائشی ادارہ بنا کر ملک کا مستقبل داؤ پر لگا دیا اور کہوٹہ پراجیکٹ کو سبوتاژ کرنے کے لئے دشمنوں کا آلۂ کار بنا رہا۔

مولانا کوثر نیازی کے انکشافات

ایٹمی توانائی کمیشن پاکستان کا ایک معتبر ادارہ ہے لیکن منیر احمد خان نے اسے نمائشی اور سفید ہاتھی بنا کر رکھ دیا تھا۔ اس ادارہ کے قیام کا بنیادی مقصد پاکستان کو ایٹمی صلاحیتوں سے بہرہ ور کرنا تھا لیکن منیر احمد خان نے مبینہ طور پر اپنے امریکی آقاؤں کو خوش رکھنے کے لئے نہ صرف بھٹو کو فریب دیئے بلکہ نوجوان اور محب وطن سائنسدانوں کی صلاحیتوں کو بھی زنگ لگا دیا۔ منیر احمد خان کے دور میں ایٹمی توانائی کمیشن سازشوں کا گڑھ بن گیا تھا اور یہاں کوئی ایسا غیر معمولی کام نہیں کیا گیا تھا جس کی بنیاد پر ایٹمی حصول کی عمارت کھڑی کی جا سکتی۔ بھٹو جو اپنے عزائم کی تکمیل اور پاکستان کو ایٹمی طاقت سے سرفراز کر کے ایک ناقابل تسخیر ملک بنانا چاہتے تھے' امریکہ کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو گئے تھے انہوں نے منیر احمد خان پر بے حد بھروسہ کیا تھا مگر جب وہ اپنے عہد پر پورے اترتے نظر نہ آئے تو بھٹو ان سے بدظن ہو گئے تھے۔ 18 مئی 1974ء کو بھارت نے جب پہلا باقاعدہ ایٹمی دھماکہ کیا تو بھٹو نے اس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے منیر احمد خان سے توقعات وابستہ کی تھیں جنہوں نے انہیں یقین دلایا کہ وہ بہت جلد پاکستان کو ایٹمی صلاحیتوں سے مالا مال کر دیں گے لیکن بجائے اس کے کہ منیر احمد خان ایٹمی توانائی کمیشن کو ترقی و کامیابی کی راہ پر ڈالتے ہوئے انہوں نے حیلے بہانے سے بھٹو کو اس مقصد سے باز رکھنے کی کوشش کی جس پر منیر احمد خان کے خلاف حساس اداروں نے انکوائریاں بھی کیں۔

شرمناک بات تو یہ ہے کہ آج ایٹمی توانائی کمیشن کے کچھ کاغذی سائنسدان اس کارنامے کا کریڈٹ اپنی جھولی میں ڈال رہے ہیں جس میں ان کا کوئی بنیادی کردار نہیں ...... ایٹمی توانائی کمیشن کے مخصوص کلچر میں پروان چڑھنے والے سائنسدان اپنے گرو منیر احمد خان کے نقش قدم پر ہی چل رہے ہیں۔ وہ ایک طرف تو ایٹم بم کو اپنے کھاتے میں ڈال رہے ہیں تو دوسری طرف شاہین میزائل کی ایجاد اور کامیاب پرواز کے دعوے کر رہے ہیں۔ ایٹم بم کس ادارے نے بنایا اور اس کا سہرا کس کے سر بجنا چاہیے۔ اس کے جواب میں یہاں ان سطور میں چند معتبر شخصیات کی تحریروں کے انکشافات پر مبنی حوالہ جات پیش کئے جا رہے ہیں۔ برسبیل تذکرہ پہلے شاہین میزائل کے بارے میں بھی کچھ عرض کر دیں۔

شاہین یا کرگس؟

شاہین میزائل ایٹمی توانائی کمیشن کی ایجاد قرار دیا گیا۔ یہ شاہین ہو یا غوری میزائل۔ بہرحال ان کا مقصد پاکستان کے دفاع اور سلامتی سے وابستہ ہے۔ اس حوالے سے یہ اور ایسے تمام میزائل بنانے والے ادارے ہمارے لئے معتبر اور قابل رشک ہیں۔ لیکن جھوٹ بول کر اور انگلی کٹوا کے شہیدوں میں نام لکھوا کر معتبر بننے والوں کو شیشہ دکھانا بھی ضروری ہوتا ہے۔

آپ میں سے بہت سے قارئین کو یاد ہو گا کہ 23 مارچ 1998ء کو افواج پاکستان کی پریڈ میں غوری اور شاہین میزائل کا تعارف کرایا گیا۔ غوری کی نسبت شاہین کو زیادہ بہتر میزائل قرار دیا گیا۔ مگر جب 6 اپریل 1998ء کو غوری اور شاہین اکھاڑے میں اترے تو شاہین کرگس ثابت ہوا اور چاروں شانے چت ہو گیا۔ شاہین سومیانی فائرنگ رینج کراچی سے صبح چھ بجے فائر ہونا تھا اور ساڑھے سات بجے غوری نے ٹلہ جوگیاں سے پرواز پکڑنی تھی۔ غوری کی رینج 15 سو کلومیٹر ہے اور اس کا ایندھن مٹی کا تیل اور آکسیجن پر مشتمل ہوتا ہے۔ جبکہ شاہین کی رینج چھ سو سے نو سے کلومیٹر ہے اور یہ سالڈ فیول سے چلتا ہے۔

شاہین میزائل کے داغے جانے کا وقت ہوا تو انکشاف ہوا کہ شاہین ٹھس ہو گیا ہے۔ اس کی تخلیق کے دعویدار ڈاکٹر ثمر مند مبارک کے پسینے چھوٹ گئے اور ایٹمی توانائی کمیشن کے سائنسدانوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے کہ اگر شاہین نہ اڑا تو وہ اڑ جائیں گے۔ ان کی جگ ہنسائی ہو گئی۔ شاہین کا تجربہ اس وقت ملک کی سلامتی سے منسوب ہو چکا تھا۔

ادھر ٹلہ جوگیاں پر غوری کے پاس کھڑے انجینئرز اور سائنسدان اس خوشخبری کو سننے کے لئے منتظر تھے کہ شاہین کب فضا میں بلند ہو گا۔ ان کے لبوں پر پاکستان کی سلامتی کے لئے دعائیں تھیں۔ پھر بہت جلد انہیں مطلع کر دیا گیا کہ شاہین میں فنی خرابی ہو گئی ہے لہٰذا غوری کو فوراً چھوڑ دیا جائے۔ اس وقت ایک عجیب صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ کچھ لوگوں کے دلوں میں خدشہ پیدا ہوا کہ خدانخواستہ اگر غوری بھی شاہین ثابت ہوا تو ....

ڈاکٹر خان کے کانوں میں بات پڑی تو ان کی جبیں پر شکن پڑ گئی اور آنکھوں میں لازوال اعتماد کی چمک پیدا ہوئی۔ وہ بولے "غوری کو غوری کے مسکن سے چھوڑا جا رہا ہے۔ یہ میرے ایمان محنت اور خون پسینے سے پیدا ہوا ہے۔ غوری مجھے مایوس نہیں کرے گا"۔

سات بج کر تینتیس منٹ پر ڈاکٹر خان کے معتمد ساتھی بدرالاسلام نے بٹن دبایا غوری فائر کر دیا گیا تو کہوٹہ کے شاہینوں کی آنکھیں تشکر بھرے آنسوؤں سے بھر آئیں۔ سائنسدان اللہ کا شکر بجا لائے۔

اخبارات میں شاہین کی ناکامی کی خبر اس لئے شائع نہ ہوئی کہ یہ ملکی سلامتی اور دفاع کے وقار کا سوال تھا۔ لیکن بعد میں یہ راز ...... راز نہ رہا۔

سنا ہے کہ ایٹمی توانائی کمیشن نے راتوں رات شاہین الہٰ دین کا چراغ رگڑ کر "پیدا" کر لیا تھا اور اسے جینوئن کلر میں ہی داغ دیا۔ اس کا رنگ سفید تھا۔ لیکن جو شاہین میزائل پاک فوج کی پریڈ میں دکھایا گیا اس کا رنگ اور تھا۔ اس وقت تو ایٹمی توانائی کمیشن کی اس پھرتی پر کسی نے توجہ نہ دی۔ لیکن بعد میں عقدہ کھل گیا۔ اس کامیابی پر ڈاکٹر ثمر مبارک نے اعلان کیا کہ اب ہم شاہین II بنائیں گے جس کی رینج 1900 کلومیٹر ہو گی۔ کہوٹہ والوں نے بھی کہا کہ ہم غوری II بنائیں گے۔ دونوں ادارے پارٹ II کی تیاریاں کرنے لگے۔ عملی کام کرنے والے اس بار بھی بازی لے گئے اور غوری II کا تجربہ 14 اپریل 1999ء کو کر دیا گیا۔ جبکہ شاہین II کا تجربہ تا حال نہیں ہوا۔ البتہ شاہین I کی طرح شاہین II کی بھی 23 مارچ 2001ء کی پریڈ میں بلند دعوؤں کے ساتھ نمائش کر دی گئی ہے۔ اب دیکھئے کہ شاہین اب کی بار شاہین ہی ثابت ہوتا ہے یا پھر کرگس؟

منیر احمد خان ایٹمی توانائی کمیشن کی دیمک:

ذوالفقار علی بھٹو جیسے بھی تھے لیکن پاکستان کو عالمی طاقت بنانے اور اسے ایٹمی قوت بنانے کا جنون ان میں بے پناہ تھا۔ وہ ایٹمی پاکستان کے لئے بنیادیں کھود کر عمارتیں کھڑی کرنا چاہ رہے تھے لیکن وہ اس دیمک کا فوری علاج نہ کر سکے جو ان بنیادوں کی مٹی میں موجود تھی۔ منیر احمد خان ایک ایسی ہی دیمک ثابت ہوئے تھے۔ پاکستان کے حساس ادارے کی رپورٹس اور ایٹم سازی کے منصوبوں میں عملی طور پر شریک رازدانوں نے ان کی اصلیت ظاہر کر دی تھی لیکن اس وقت تک بھٹو اپنی بے پناہ توانائیاں صرف کر چکے تھے۔ قدرت پاکستان کو بچانا چاہتی تھی اس لئے ڈاکٹر خان کی صورت میں ایک فرشتہ بھٹو کی مدد کے لئے بھیج دیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کا پاکستان کو ایٹمی قوت بنانے کا عزم اور ان کا جنون کس انتہا کو پہنچا ہوا تھا؟ بیرونی طاقتیں ری پراسیسنگ پلانٹ کی آڑ میں پاکستان کو کیسے بلیک میل کر رہی تھیں اور سب سے بڑھ کر ایٹمی توانائی کمیشن کے چیئرمین منیر احمد خان کا کردار اور کارکردگی سے کیا ظاہر ہو رہا تھا؟ ان تلخ حقائق کی جھلک دیکھنے کے لئے یہاں آپ کو مولانا کوثر نیازی کی شہرہ آفاق کتاب "اور لائن کٹ گئی" میں سے چند اقتباسات دکھاتے ہیں۔ آپ خود اندازہ کر لیجئے کہ پاکستان اس عہد میں کیسے کیسے میر جعفر اور میر صادق اپنی گود میں لئے بیٹھا تھا۔ مولانا کوثر نیازی بتاتے ہیں:

"18 مئی 1974ء کو بالآخر بھارت نے پہلا باقاعدہ ایٹمی دھماکہ کیا اور پاکستان کے عوام کی اکثریت پر اس کے جو اثرات مرتب ہوئے' وہ وزیر اعظم بھٹو کے لئے بجائے خود ایک چیلنج کی حیثیت رکھتے تھے۔ لوگ لامحالہ مسٹر بھٹو کی طرف سے کسی جوابی اقدام کے منتظر تھے لیکن وزیر اعظم بھٹو کی مجبوری یہ تھی کہ وہ اس ضمن میں جو کچھ کر چکے تھے او جو کچھ کرنے والے تھے' اسے عالمی تنازعات کے سبب ظاہر کرنے سے قاصر تھے پھر بھی انہوں نے اپنی بیشتر تقاریر اور بیانات کے ذریعے نہ صرف اندرون ملک عوام کا مورال بلند رکھا اور مجھے وزیر اطلاعات و نشریات کے علاوہ پارٹی کا سیکریٹری اطلاعات ہونے کی حیثیت میں خصوصی اقدامات کے لئے ہدایات دیں بلکہ قومی اسمبلی میں بھی برملا بھارت کے ایٹمی دھماکے پر شدید ردعمل کا اظہار کیا اور واضح طور پر یہ دھمکی دے دی کہ اب ہمیں بھی اس اقدام سے باز نہیں رکھا جا سکے گا۔ مجھے انہوں نے عالمی سطح پر بھارت کے خلاف پروپیگنڈہ سائنٹیفک بنیادوں پر چلانے کی ہدایت کی اور خود نہایت خاموشی کے ساتھ اس مذاکراتی مہم میں لگے رہے جو انہوں نے فرانس کی ایس۔ جی۔ این نامی فرم کے ساتھ 1973ء میں شروع کی تھی۔ جس کے تحت یہ فرم پاکستان کو ری پراسیسنگ پلانٹ کی فراہمی کی شرائط طے کر رہی تھی۔

وزیر اعظم بھٹو خارجہ امور پر جتنی گہری نظر رکھتے تھے اس کے پیش نظر یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ بھارت کے متوقع ایٹمی دھماکے سے بے خبر تھے ان کے پاس اس سلسلے میں تمام تازہ ترین اطلاعات تھیں اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ بھارت نے کس طریق کار کے ذریعے اور کتنا سرمایہ خرچ کر کے یہ کامیابی حاصل کی ہے۔ تاہم انہوں نے بھارت کے ایٹمی دھماکے کے بعد بعض نمایاں پاکستانی سائنسدانوں کی اچھی خاصی گوشمالی کی تھی' جو یہ دعویٰ کرتے تھے کہ بھارت کی طرح کا ایٹمی دھماکہ کرنا ہمارے لئے بچوں کا کھیل ہے۔

فرانسیسی فرم کے ساتھ معاہدہ میں فرانسیسی حکومت باقاعدہ فریق کی حیثیت سے شریک تھی اور تین سال تک جو

مذاکرات ہوتے رہے ان میں وزیراعظم نے فرانسیسی حکومت سمیت ایٹمی تحفظات کے عالمی ادارے آئی۔اے۔ای۔اے کو بھی ہر قسم کی ضمانتیں اور یقین دہانیاں فراہم کردی تھیں۔ان کی تمام شرائط من وعن تسلیم کر لی تھیں۔انہوں نے یقین دلایا تھا کہ پاکستان کو دیا جانے والا ری پراسیسنگ پلانٹ صرف صنعتی مقاصد کے لئے توانائی کے حصول تک محدود رہے گا۔لیکن ساری یقین دہانیاں کرانے کے بعد مسٹر بھٹو نے جو اپنا کارڈ کھیلا' وہ یہ تھا کہ معاہدے میں کوئی ایک بھی ایسی شق موجود نہ تھی جس کے ذریعے پاکستان اس امر کا پابند ہوتا کہ خود اپنے ذرائع سے اپنے سائنسدانوں کے ذریعے وہ ویسا ہی دوسرا پلانٹ نہ لگا سکے گا' جس کی فراہمی فرانس سے ہونا تھی یا یہ کہ وہ دوسرا پلانٹ پاکستان کسی عالمی ادارے کی نگرانی میں دینے کا پابند ہوگا۔

بین الاقوامی تحفظات کے ضمن میں وزیراعظم اس حد تک چلے گئے تھے کہ تسلیم کردہ پابندیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا تصور بھی محال تھا کہ پاکستان ری پراسیسنگ پلانٹ سے جوہری بم بنا سکے گا۔

ری پراسیسنگ پلانٹ کی خریداری آئیڈیا مسٹر بھٹو کے ذہن میں ان کے سائنسی امور کے مشیر ڈاکٹر عبدالسلام اور ایٹمی توانائی کمیشن کے چیئرمین مسٹر منیر احمد خان نے ڈالا تھا۔کسی بھی معاملے کی تمام تر جزئیات پر نظر رکھنے والے بھٹو نیوکلیئر ٹیکنالوجی کے باب میں نامکمل معلومات اور اندرون و بیرون ملک دوسرے بے شمار مسائل میں پھنسے ہونے کے سبب اس پروجیکٹ کے تمام پہلوؤں کا خود جائزہ نہ لے سکے اور یہ سارا کام پاکستان سائنس فاؤنڈیشن اور اٹامک انرجی کمیشن کے ذمے ڈال کر خود اس مسئلہ کے سیاسی اور معاشی پہلوؤں میں الجھ گئے۔سب سے بڑی بات تو 300 ملین ڈالر کے اس منصوبے کے لئے سرمائے کے حصول کا سوال تھا جس کے لئے انہوں نے عالم اسلام خصوصاً خلیجی ریاستوں اور تیل کی دولت سے مالا مال عرب ممالک سے رجوع کیا جہاں سے انہیں مثبت یقین دہانیاں حاصل ہوئیں۔

خصوصاً لیبیا' سعودی عرب' متحدہ عرب امارات' کویت اور عراق کی جانب سے انہیں ہر قسم کے مالی تعاون کی پیشکش ہوئی۔عرب اسرائیل جنگ کے دوران پاکستانی افواج کے ہاتھوں اسرائیلی فوج کے دانت کھٹے کرا کے وہ عرب دنیا میں بے پناہ وقار پہلے ہی حاصل کر چکے تھے اور عرب سربراہوں کو اس امر میں ذرا بھی شک نہ تھا کہ پاکستان کا ایٹم بم اسرائیل کے مقابل خود ان کے تحفظ کی بہت بڑی ضمانت ہوگا۔ادھر خود مسٹر بھٹو اپنی زبان سے اس معاملے پر ایک لفظ بھی کسی کو بتانے پر آمادہ نہ تھے' ملک بھر میں گنتی کے چند لوگ ان کے اصل پروگرام سے آگاہ تھے۔جب اراکین اسمبلی بعض وزراء اور اعلیٰ حکام کی اس سلسلے میں تشویش کو انہوں نے حد سے گزرتے دیکھا تو آخر ایک روز انہوں نے اعتماد میں لیا اور ایک میٹنگ میں نہایت معنی خیز انداز میں کہا..........

"ہمیں اس ٹیکنالوجی کو ہر قیمت پر حاصل کرنا ہے' بین الاقوامی تحفظات صرف اس ایک پلانٹ تک محدود ہوں گے۔میں نہیں سمجھتا کہ ہمارے سائنسدان اور ہنرمند اتنے نااہل ہوں گے کہ ایک ٹیکنالوجی کو دیکھنے اور سمجھنے کے باوجود خود اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ویسا ہی دوسرا پلانٹ تعمیر نہ کر سکیں جس پر ہم کسی بھی قسم کے بین الاقوامی تحفظات قبول کرنے کے پابند نہ ہوں گے۔"

وزیراعظم جانتے تھے کہ ان کا پروگرام طویل اور صبر آزما ہے لیکن انہیں اس کا بھی یقین تھا کہ آخر کار وہ عرب دوستوں کے تعاون سے اپنے خواب کو شرمندۂ تعبیر ہوتے دیکھ سکیں گے۔

اس ضمن میں شاہ فیصل مرحوم کے پاس گفت و شنید کے لئے صرف مجھے ہی انہوں نے کم و بیش چار مرتبہ بھیجا تھا۔ جب کہ دوسرے ممالک کے ساتھ آغا شاہی' عزیز احمد' اے۔جی۔این قاضی' غلام اسحٰق خان' منیر احمد خان اور نجانے کتنے لوگ اس سلسلے میں ان کی بہت سی ایسی ہدایات پر عمل کر رہے تھے جن کے مقاصد سے شاید وہ خود بھی کم ہی آگاہ تھے۔لیکن جب 1974ء میں بھارت نے راجستھان میں ایٹمی دھماکہ کیا تو اچانک ساری صورت حال ہی بدل گئی۔

ایک بہت بڑی اور انقلابی تبدیلی ستمبر 1974ء میں یہ آئی کہ وزیراعظم کو ہالینڈ سے ایک خط موصول ہوا جس میں میٹالرجی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے والے ایک محب الوطن پاکستانی ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے انہیں آگاہ کیا تھا کہ وہ فلزیات کے ماہر اور لاتعداد تحقیقی مضامین کے مصنف ہونے کے علاوہ ایک عالمی شہرت یافتہ کتاب کے بھی مصنف ہیں۔لیکن کراچی سٹیل مل کے نااہل اہلکار ان کی خدمات سے استفادہ نہیں کر رہے اور انہوں نے ان کی کسی پیشکش کا کوئی موزوں جواب نہیں دیا۔انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ یورینیم کی افزودگی ایسے پیچیدہ اور مشکل ترین کام میں بھی مہارت رکھتے ہیں اور آج کل ہالینڈ میں المیلو کے مقام پر یورینکو نامی پروجیکٹ پر ایف ڈی او کے تحت کام کر رہے ہیں جس کا مقصد سینٹری فیوج سسٹم کے ذریعے یورینیم کی افزودگی ہے اور یہ پلانٹ برطانیہ ہالینڈ اور جرمنی کے مشترکہ سرمائے اور سائنسدانوں کے اشتراک سے عرصہ 20 سال سے اس کام میں مصروف ہے۔ڈاکٹر قدیر نے لکھا تھا کہ وہ سٹیل مل کے لئے بے حد مفید خدمات سرانجام دے سکتے ہیں۔لیکن اس سلسلے میں ان کی پیشکشوں کا کوئی مثبت جواب نہیں دیا جا رہا۔

اس خط نے گویا وزیراعظم کے ذہن میں طوفان برپا کر دیا اور ان کی تیز نگاہ نے تمام باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے المیلو پلانٹ سے ڈاکٹر قدیر کی وابستگی اور یورینیم کی افزودگی میں مہارت کو بھانپ لیا۔انہوں نے خفیہ ذرائع سے ڈاکٹر قدیر کو اطلاع بھجوائی کہ وہ چھٹی لے کر پاکستان آئیں اور ان سے ملاقات کریں۔

اس کے ساتھ مسٹر بھٹو نے پاکستانی سیکرٹ سروسز اور سفارتخانوں کو المیلو پلانٹ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کے مشن پر لگا دیا۔جب وہ تمام معلومات ان کے سامنے آئیں تو جیسے ان کی آنکھوں کے سامنے سے بہت سے پردے ہٹ گئے انہوں نے ڈاکٹر قدیر کے بارے میں بھی تحقیقات کرائیں اور ان کے بارے میں مفصل معلومات حاصل کیں۔جن کی روشنی میں وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ یہی وہ آدمی ہے جو پاکستان کو ایٹمی قوت بنانے کے ان کے خواب کو جلد از جلد پایہ تکمیل تک پہنچا سکتا ہے۔انہوں نے ڈاکٹر قدیر کو ہدایات بھجوائیں کہ وہ کسی کو کسی بھی قسم کے شک و شبہ کا موقع دیئے بغیر نارمل انداز میں چھٹی لے کر پاکستان پہنچیں اور ان کے ملٹری سیکرٹری بریگیڈیر امتیاز سے رابطہ قائم کریں۔

دسمبر 1974ء میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان اپنی بیگم اور بچیوں سمیت کراچی پہنچے۔بھٹو صاحب نے فوراً انہیں اسلام آباد بلوایا اور سمجھایا کہ آپ لوہا بنانے کے چکر میں نہ پڑیں بلکہ ہمیں یہ بتائیں کہ یورینیم کی افزودگی کا کام کس طرح شروع کیا جا سکتا ہے۔

بھٹو صاحب اس وقت منیر احمد خان پر بھی بے حد اعتماد کرتے تھے چنانچہ انہوں نے انہیں ہدایت دی کہ وہ ڈاکٹر عبدالقدیر سے ملیں اور ان کے مشوروں پر عمل درآمد کرائیں۔ڈاکٹر قدیر منیر خان سے ملے اور انہیں صحیح طریقے پر نیوکلیئر ٹیکنالوجی کے حصول کے جدید ترین نظام سے آگاہ کر کے کراچی واپس چلے گئے۔جانے سے پہلے انہوں نے مسٹر بھٹو سے ایک ملاقات اور کی اور بتایا کہ انہوں نے سارا کام منیر احمد خان کو سمجھا دیا ہے۔

ڈاکٹر قدیر کچھ عرصہ بعد ہالینڈ اپنی ملازمت پر واپس چلے گئے لیکن اب ان کے سامنے گویا ایک باقاعدہ مشن تھا۔وہ کئی زبانوں کے ماہر ہونے کے سبب ڈچ' انگلش اور جرمن سائنسدانوں کی مرتبہ رپورٹوں کے کوآرڈینیٹر بھی تھے۔ اس لئے سینٹری فیوج سسٹم کی تنصیبات کے ایک ایک پہلو سے آگاہ تھے۔جانے سے پہلے انہوں نے بھٹو صاحب سے ملاقات میں ری پراسیسنگ پلانٹ کی خریداری میں مضمر نقصانات سے انہیں پوری طرح آگاہ کر دیا تھا اور بتلایا کہ 300 ملین ڈالر کا یہ سفید ہاتھی کم از کم بھی اپنی مکمل تنصیبات کے لئے بیس سال کا عرصہ لے گا۔

درحقیقت ری پراسیسنگ پلانٹ کی خریداری سے پہلے پاکستان کے پاس مطلوبہ مقاصد حاصل کرنے کے لئے تین بنیادی پلانٹ ضروری تھے۔

اول: پیداواری ری ایکٹر' جو پلوٹینم تیار کر سکے۔

دوم: ایندھن تیار کرنے والا پلانٹ۔

سوم: بھاری پانی کا پروڈکشن پلانٹ۔

تب کہیں جا کر ری پراسیسنگ پلانٹ کا نمبر آتا تھا۔جو ایٹم بم کی تیاری کے حصول میں مددگار ثابت ہو سکتا۔پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ یہ تمام پلانٹ ایٹمی توانائی کے بین الاقوامی ادارے کے تحفظات سے بالاتر ہوتے جس کا ایک فی صد امکان بھی نہ تھا کیونکہ ہر چیز کے لئے ہم مغربی ممالک کے محتاج تھے' پاکستان کے پاس KANUPP کے علاوہ کوئی پاور ری ایکٹر نہ تھا نہ ری پروسیس کے لئے ایندھن کے ذخائر تھے۔

مسٹر بھٹو فرانس کے ساتھ معاہدے کو اس نوعیت تک لے جا چکے تھے کہ اب واپسی بہت مشکل تھی۔نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن کی سی کیفیت تھی اگر وہ معاہدہ منسوخ کرنا چاہتے تو بھاری اخراجات کا نقصان برداشت کرنے کے علاوہ معاہدہ سے پھرنے کے سلسلے میں بھاری تاوان بھی ادا کرنا پڑتا تھا۔جسے برداشت کرنے سے پاکستان کی اقتصادی حالت قاصر تھی۔دنیا بھر میں تیل کی قیمتیں ہوشربا حد تک بڑھی تھیں۔ملکی مجموعی قومی پیداوار کا گراف گر رہا تھا۔آئے دن سیلاب اور زلزلوں کا سامنا تھا۔فصلیں اچھی نہیں جا رہی تھیں۔غرضیکہ اقتصادی اعتبار سے پاکستان گوناگوں مشکلات کا شکار تھا اور ایسے عالم میں وزیراعظم کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ وہ تین سو ملین ڈالر کے اس سفید ہاتھی کو خرید سکیں یا اس کی خریدار کے اس معاہدے سے منکر ہو سکیں جس کے لئے انہوں نے تین سال تک مذاکرات کئے تھے اور پاکستان سے فرانس جانے والی مختلف مذاکراتی ٹیموں کے دوروں پر لاکھوں ڈالر خرچ آئے تھے۔انہوں نے ایک انتہائی کٹھن اور دشوار فیصلہ کیا جو انہیں جیسا مضبوط ترین اعصاب کا مالک شخص کر سکتا تھا۔

لیکن اس فیصلے کے چند اور اسباب بھی تھے جن میں اہم ترین بات یہ تھی کہ دسمبر 1975 میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان پھر پاکستان واپس آئے۔کراچی ائرپورٹ پر جب وہ اترے تو ان کے پاس صرف تین بڑے صندوق تھے جن میں ان کی یادداشتوں پر مبنی نوٹسوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔وزیراعظم بھٹو نے انہیں اسلام آباد آنے کی دعوت دی۔

وہ اسلام آباد پہنچے تو وزیر اعظم بھٹو شہنشاہ ایران کے ساتھ لاڑکانہ چلے گئے۔ لیکن جانے سے پہلے ہدایات دے گئے کہ منیر احمد خان ڈاکٹر قدیر کو وہ تمام کام دکھائیں جو ایک سال کے دوران ان کی ہدایات کے تحت ہوا ہے اور کام کی رفتار سے بھی آگاہ کریں۔

ڈاکٹر قدیر کام کی نوعیت دیکھ کر بے حد مایوس ہوئے کیونکہ گاڑی وہیں کھڑی تھی جہاں وہ اسے چھوڑ کر گئے تھے۔ ڈاکٹر قدیر کے مجوزہ پروجیکٹ کے لئے کمیشن میں ایک ایم۔ ایس۔ سی الیکٹریکل انجینئر (سلطان بشیر الدین محمود) انچارج بنایا گیا تھا جو یورینیم کی افزودگی کے منصوبے کو سمجھنے کی صلاحیت سے بھی محروم تھا۔

وزیر اعظم بھٹو جب اسلام آباد واپس آئے تو انہوں نے ڈاکٹر قدیر خان کو طلب کیا اور رپورٹ مانگی۔ بھلا ڈاکٹر خان کیا رپورٹ پیش کرتے؟ انہوں نے دل برداشتہ ہو کر واپس ہالینڈ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا کیونکہ وہ بیوروکریسی کے جال کے سامنے خود کو بے بس پاتے تھے۔ انہوں نے محسوس کر لیا کہ نیوکلیئر ٹیکنالوجی کے سلسلے میں مسٹر بھٹو کے مشیر اور بیوروکریسی کے کل پرزے انہیں مسلسل غلط اطلاعات دے کر قومی سرمایہ ضائع کرتے رہے ہیں۔

مسٹر بھٹو نے ڈاکٹر قدیر کی ساری بات بہت توجہ سے سنی اور انہیں چند دن پاکستان ہی میں رہ کر انتظار کرنے کو کہا۔

یہ موقع تھا جب مسٹر بھٹو نے اس سارے معاملے پر مجھے اعتماد میں لیا اور صورت حال کے تمام پہلو میرے سامنے رکھ کر مجھ سے رائے طلب کی۔ لامحالہ میں یہ باتیں جان کر بیک وقت غم و غصہ کا شکار ہوا کہ کس طرح ہماری بیوروکریسی جوہر قابل کو ضائع کرتی ہے اور اگر کوئی محب الوطن شخص اپنی صلاحیتوں سے وطن کو مستفید کرنا چاہتا ہے تو کس کس طرح اس کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کی جاتی ہیں۔

میں نے وزیر اعظم کو یہی مشورہ دیا کہ وہ ہر قیمت پر ڈاکٹر قدیر کو روکیں اور مناسب ہوگا کہ ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے ایک مکمل طور پر آزاد ادارہ قائم کر دیا جائے جس کے وہ خود سربراہ ہوں اور اس ادارے میں انہیں جو ہنرمند فراہم کئے جائیں وہ سول محکموں یا بیوروکریسی کی بجائے فوج سے لئے جائیں۔

وزیر اعظم کو یہ بات غالباً پسند آئی اور انہوں نے میری رائے سے اتفاق کرتے ہوئے اگلے روز ڈاکٹر قدیر کو ملاقات کے لئے طلب کر لیا اور انہیں بتایا کہ وہ کس طرح ان کی سربراہی میں ایک مکمل طرز پر خود مختار ادارہ قائم کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ جس پر کسی قسم کا کوئی "چیک" نہیں ہوگا اور اس ادارے کے لئے اپنے مددگاروں کا انتخاب ڈاکٹر صاحب چاہیں تو خود پاک فوج سے کر سکتے ہیں اور اگر چاہیں تو اس سلسلے میں وزیر اعظم کی صوابدید پر اعتماد کر لیں۔

ڈاکٹر قدیر نے وزیر اعظم کو جواب دیا کہ وہ اپنی بیگم سے مشورہ کر کے بتائیں گے۔

مسٹر بھٹو نے انہیں مشفقانہ انداز میں حکم دیا کہ ایک گھنٹہ تک اپنی بیگم سے مشورہ کر کے انہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیں۔

ٹھیک ایک گھنٹہ بعد ڈاکٹر قدیر نے فون پر وزیر اعظم کو اطلاع دی کہ وہ ہالینڈ واپس نہیں جا رہے بلکہ پاکستان ہی میں رہ کر یورینیم کی افزودگی کا پلانٹ لگائیں گے۔ میں نے دیکھا کہ وزیر اعظم کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا تھا۔

انہوں نے میز پر اپنے مخصوص انداز میں مکہ مارتے ہوئے کہا ....

"I WILL SEE THE HINDU BASTARDS NOW"

اس وقت مسٹر بھٹو کی مسرت کا عالم دیدنی تھا۔

وزیر اعظم بھٹو کے فیصلے اکثر بہت پہلودار ہوتے تھے اور بسا اوقات ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے انہوں نے اپنے تمام رفیقوں کے مشورے نظر انداز کر کے کوئی اور ہی فیصلہ کیا ہو لیکن بعد ازاں جب ان کے فیصلے کے نتائج سامنے آتے تھے تو اکثر ہم لوگ حیران رہ جاتے تھے۔ انہوں نے میرے اور اپنے درمیان طے پانے والے پروگرام کے قطعی برعکس اچانک ہی ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی تقرری اٹامک انرجی کمیشن کے ایڈوائزر کے طور پر کر دی اور حکم دیا کہ وہ کمیشن کی رہنمائی کریں اور پلانٹ لگائیں۔ چند ہفتے ڈاکٹر قدیر نے اس ادارے میں گزارے اور جب دیکھا کہ وہاں ہر چیز پی۔ ڈبلیو۔ ڈی P.W.D کی طرز پر چل رہی ہے اور ان کے لئے وہ کام کرنا مشکل ہے جس کے لئے انہیں تعینات کیا گیا ہے تو انہوں نے ملٹری سیکریٹری برائے وزیر اعظم کو اپنے جذبات سے آگاہ کر دیا کہ یہاں رہ کر وہ کوئی کام نہیں کر سکتے۔ یہ ساری باتیں جنرل امتیاز کی وساطت سے وزیر اعظم کے علم میں آ گئیں۔ انہوں نے امتیاز کو حکم دیا کہ اپنے طور پر بریگیڈیئر (اب لیفٹیننٹ جنرل) زاہد علی اکبر خان سے تمام الزامات کی تصدیق کریں۔ ڈاکٹر خان کے مطالبہ پر مسٹر بھٹو نے انہیں کور آف انجینئرز کی جو ٹیم دی تھی زاہد علی اکبر اس کے سلسلے میں سول ورکس کے ذمہ دار تھے۔

امتیاز نے زاہد علی اکبر سے بات کی تو پتہ چلا کہ معاملات میں سخت گڑبڑ ہے کوئی کام نہیں ہو رہا بلکہ وزیر اعظم کے ساتھ فراڈ کیا جا رہا ہے اور ڈاکٹر قدیر خان وطن چھوڑ کر جانے کا سوچ رہے ہیں۔ مسٹر بھٹو نے یہ سب کچھ سنا تو انہیں شدید غصہ آیا' انہوں نے ڈاکر قدیر کو طلب کیا اور تمام حالات دریافت کئے۔ انہوں نے سب کچھ صاف صاف مسٹر بھٹو کو بتا دیا کہ لوگ کس طرح نیوکلیئر ٹیکنالوجی کے حصول کے سلسلے میں ان کے اضطراب کو ایکسپلائٹ کر رہے ہیں اور انہیں غلط اطلاعات فراہم کی جا رہی ہیں۔

وزیر اعظم نے ڈاکٹر قدیر کو تسلی دے کر رخصت کر دیا اور اسی شام مجھے پی۔ ایم۔ ہاؤس میں طلب کر لیا۔ انہوں نے مختصراً ساری صورت حال مجھے بتائی اور بولے:

"مولانا' میں اس سنہری موقع کو ہاتھ سے جاتے نہیں دیکھ سکتا' یہ آدمی بہت قیمتی ہے (ان کا اشارہ ڈاکٹر قدیر کی طرف تھا) اس کا کوئی معقول حل نکالیں"۔ ....

میں نے انہیں مشورہ دیا کہ آپ اس معاملے میں سیکرٹری جنرل فنانس' اے۔ جی۔ این قاضی' سیکرٹری وزارت خارجہ آغا شاہی' عزیز احمد اور غلام اسحٰق خان کو اعتماد میں لیں اور ان حضرات کے ساتھ ڈاکٹر قدیر کی بھی ملاقات کرا دیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

مسٹر بھٹو .... سخت ناراض تھے کیونکہ ان کی دانست میں .... انہیں قوم کے سامنے شرمسار کرایا گیا تھا۔ لاہور کی ایک میٹنگ میں جس میں آغا شاہی اور ڈاکٹر امیر محمد خان بھی شامل تھے۔ مسٹر بھٹو نے .... بڑے سخت الفاظ استعمال کئے (منیر احمد خان کے بارے میں)۔ میں یہاں وہ الفاظ درج کرنے سے قاصر ہوں۔ ان کے طیش کو دیکھتے ہوئے جنرل امتیاز نے تجویز پیش کی کہ .... ڈاکٹر امیر محمد کو ایٹمی توانائی کمیشن کا چیئرمین لگا دیا جائے۔ لیکن چونکہ ڈاکٹر امیر محمد ایٹمی سائنس دان نہ تھے اس لئے فیصلہ ہوا کہ اس ادارے کی سربراہی کسی اچھے ایڈمنسٹریٹر کو دے دی جائے جس کے لئے بھٹو صاحب نے جنرل رحیم الدین خان (موجودہ چیئرمین جوائنٹ چیف آف سٹاف کمیٹی) اور جنرل سعید قادر (موجودہ سینیٹر) کے نام تجویز کئے۔ مختلف تجاویز سامنے آتی رہیں۔ میرا مشورہ یہ تھا کہ کہوٹہ پروجیکٹ کو بالکل خفیہ طور پر علیحدہ کر دیا جائے۔ یہ مشورہ بعد ازاں اے۔ جی۔ این قاضی غلام اسحاق خان اور آغا شاہی نے بھی دیا۔

جولائی 1976ء میں ملٹری سیکرٹری جنرل امتیاز نے بھٹو صاحب کو جب وزارت خارجہ سے فون کر کے انہیں میٹنگ کے فیصلوں سے آگاہ کیا جس میں یہ تمام حضرات شریک تھے تو میں موجود تھا۔ بھٹو صاحب نے فوراً تمام تجاویز کی منظوری دے دی اور ڈاکٹر قدیر کی یہ شرط بھی مان لی کہ کہوٹہ ریسرچ لیبارٹریز میں ان کو کام کرنے کی مکمل آزادی حاصل ہوگی۔ غلام اسحاق خان اور اے۔ جی این قاضی نے بغیر کسی رکاوٹ کے مطلوبہ فنڈز کی بروقت فراہمی کا یقین دلایا۔ چنانچہ جولائی 1976ء میں کہوٹہ ریسرچ لیبارٹریز کا قیام عمل میں آیا اور ڈاکٹر خان نے یقین دلایا کہ صرف سات سال بعد وہ پاکستان کو ایٹمی توانائی کے میدان میں عالمی طاقتوں کے مقابل لا کھڑا کریں گے۔ بھٹو صاحب کو ان پر پورا بھروسہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے ہم سب کے مشورے پر ایٹمی توانائی کمیشن کے ادارے کو نمائشی گھوڑے کے طور پر کام کرنے دیا لیکن جوہری توانائی کے میدان میں اصل کام ڈاکٹر قدیر کے حوالے کر دیا گیا۔ جن کی مدد کے لئے اسپیشل ورکس آرگنائزیشن کے نام سے لفٹیننٹ جنرل زاہد علی اکبر خان اور میجر جنرل انیس علی سید کی سربراہی میں ایک ادارہ قائم کر دیا گیا۔ جو ڈاکٹر قدیر کو درکار سہولتوں اور اشیاء کی فراہمی کا ذمہ دار تھا۔ اس سلسلے میں غلام اسحاق خان کا کردار بھی نہایت اہم ہے جنہوں نے کبھی فنڈز کا مسئلہ کھڑا نہ ہونے دیا۔

8 اگست 1976ء کو جب کسنجر پاکستان پہنچے تو ان کے سامنے لے دے کے صرف فرانس سے ری پراسیسنگ پلانٹ کی خریداری کا معاہدہ تھا جسے کارٹر صرف اور صرف بھٹو کی مخاصمت میں ایک عالمی مسئلہ اور بھٹو کو امن عالم کے لئے خطرہ ثابت کر رہے تھے۔ حالانکہ یہ بات ان پر بھی ظاہر تھی کہ ری پراسیسنگ پلانٹ پاکستان کے کسی مطلب کا نہیں ہے۔ خصوصاً ملٹری آپشن کے اعتبار سے بالکل بے مقصد ہے۔ جب کسنجر نے وزیر اعظم بھٹو کو اس سلسلے میں "ہولناک انجام کی عبرتناک مثال" تک بنا دینے کی دھمکی دے تو مسٹر بھٹو نے وہ کٹھن اور مشکل فیصلہ کیا جس کے بارے میں میں نے قبل ازیں ذکر کیا ہے۔

وزیر اعظم کی خود اعتمادی اپنے عروج پر تھی اور انہوں ری پراسیسنگ پلانٹ کی خریداری کے معاہدے سے بچنے کے لئے ایک طویل ڈرامے کا پلاٹ سوچ لیا جس کے مرکزی کردار کارٹر اور کسنجر تھے۔ ان دنوں بھی بعض واقفان حال نے فرانس سے ری پراسیسنگ پلانٹ کی خریداری کے معاہدے کی مخالفت کی تھی اور اس کا ملٹری آپشن نہ ہونے کے سبب اس معاہدے کو ختم کرنے کی ضرورت پر زور دیا تھا۔ ایسے حضرات میں ہفت روزہ "اخبار جہاں" کے کالم نگار حبیب الرحمٰن اور "پاکستان اکنامسٹ" کے بعض کالم نگار سرفہرست تھے۔ خود مسٹر بھٹو کی بھی یہی منشا اور مرضی تھی کہ کہوٹہ ریسرچ لیبارٹریز کے کام کو ساری دنیا سے چھپا کر اس کی توجہ ری پراسیسنگ پلانٹ کی خریداری پر مرکوز کرا دی جائے اور اس نمائشی گھوڑے کے مسئلے پر اتنی شدت سے سٹینڈ لیا جائے کہ امریکہ خود ہی فرانس پر دباؤ ڈال کر اس معاہدے کی تنسیخ کرا دے اور یوں جو تاوان پاکستان کو دینا پڑے' وہ الٹا پاکستان کو فرانس دے۔ آج کل بعض

عالمی اداروں اور فرانس کے ساتھ پاکستان کے ساتھ معاہدے سے پھرنے کے سبب اس تاوان کی ادائیگی کا معاملہ بھی زیر بحث ہے جس سے بچنے کے لئے فرانسیسی حکومت بھی اس منسوخ شدہ معاہدے کے بارے میں تمام باتیں بھلا کر پاکستان کو ری پراسیسنگ پلانٹ کی فراہمی کی پیشکش کر رہی ہے۔

16 مارچ 1976ء کو اس پلانٹ کی فراہمی کے معاہدے پر حکومت پاکستان کو بہ امر مجبوری دستخط کرنا پڑے تھے۔ 11 جون 1977ء کو پیپلز پارٹی کی حکومت کا جو آخری بجٹ قومی اسمبلی کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس میں پلانٹ کی خریداری کے لئے صرف چالیس کروڑ روپے کی رقم مختص ظاہر کی گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ اونٹ کے منہ میں زیرے والی بات تھی۔

بھٹو صاحب اس معاہدے کے جال میں پھنسنے کے بعد اب اس سے نکلنے کی ترکیبیں سوچ رہے تھے چنانچہ انہوں نے اس پلانٹ کے سلسلے میں عالمی سطح پر ہونے والی غوغا آرائی میں مزید اضافہ کرنے اور امریکہ کو ''فلیر اپ'' کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ امریکہ نے بھی پاکستان کو ڈرانے دھمکانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی کہ اس نے 2 جون کو وہ معاہدہ منسوخ کر دیا جس کے تحت پاکستان کو 110 لڑاکا طیاروں کی فراہمی ہونا تھی۔ نیویارک ٹائمز نے 19 جون 1977ء کو یہ خبر شائع کر دی تھی کہ فرانس نے پاکستان کو ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ کی فراہمی کا معاہدہ منسوخ کر دیا ہے۔ جبکہ معاہدہ کی عملی منسوخی کا اعلان جون 1978ء میں اس وقت کیا گیا جب مسٹر بھٹو اقتدار سے معزول کئے جا چکے تھے۔ مسٹر بھٹو نے ہائی کورٹ میں اپنے بیان حلفی میں وزیر خارجہ عزیز احمد اور سائرس وانس کی رہبری میں جس ملاقات کا تذکرہ کیا ہے وہ 31 مئی 1977ء کو ہوئی تھی اور اسی رات عزیز احمد کے کمرے کے تالے توڑے گئے تھے اور انہوں نے کارٹر کو فون کر کے اس امر پر سخت برہمی کا اظہار کیا تھا حتیٰ کہ پاکستان کو ری پراسیسنگ پلانٹ کی فراہمی کے عہد پر قائم رہنے تک کا کہہ دیا تھا۔ اس کے بعد مسٹر بھٹو کی ذات پوری شدت سے کارٹر کا ہدف بن گئی تھی۔ لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ بھٹو انہیں اپنے مقاصد کے لئے کس بری طرح استعمال کر رہے ہیں۔ کارٹر کو احمق بنانے کے چکر میں مسٹر بھٹو ہر حد سے گزر گئے اور دوسری طرف کارٹر نے بھی اپنے ''دہقانی مزاج'' کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہر قیمت پر بھٹو حکومت کے خاتمہ کا فیصلہ کر لیا۔ جس کا مزید ثبوت 27 اپریل 1977ء کو گارمیں شائع ہونے والے والٹر شوارز کے ایک مضمون سے ملتا ہے جس میں اس نے لکھا ہے کہ پاکستان کی حزب اختلاف کو غیر ملکی امداد ملنے کا معاملہ خلاف قرائن نہیں۔ مضمون نگار نے تحریک استقلال اور مسلم لیگ کو سرمایہ داروں کی جماعتیں قرار دیا اور امریکہ کی مداخلت کے ثبوت کے طور پر لکھا کہ امریکہ کی جانب سے حزب اختلاف کی حمایت کی اس وقت تصدیق ہو گئی تھی جب امریکہ نے پاکستان کے ہاتھ آنسو گیس کے گولے فروخت کرنے سے انکار کر دیا۔ واشنگٹن پوسٹ نے بھی کم و بیش ایسا ہی مضمون شائع کیا تھا۔ بایں ہمہ 2 مئی کی اشاعت میں تہران جرنل نے بی۔ بی۔ سی پر شدید تنقید کی کہ وہ پاکستان کے بارے میں فتنہ انگیز خبریں نشر کر رہا ہے اور پاکستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت بیجا کا مرتکب ہو رہا ہے۔ تہران جرنل نے واضح طور پر الزام عائد کیا تھا کہ بی۔ بی۔ سی یہ سب کچھ امریکہ کے اشارے پر کر رہا ہے۔

جس وقت مسٹر بھٹو یہ چومکھی جنگ لڑ رہے تھے کہ ایک طرف کارٹر کو چھیڑ چھاڑ کر اس کے ذریعے فرانس پر دباؤ کو تیز سے تیز کر رہے تھے۔ دوسری طرف کہوٹہ پلانٹ کو پوری دنیا سے پوشیدہ رکھنے کے لئے کوشاں تھے۔ تیسری طرف اندرون ملک اپوزیشن کے ایجی ٹیشن سے نبرد آزما تھے اور چوتھی طرف جرنیلوں کو قابو میں رکھنے کے لئے ان سے آئے دن میٹنگیں کر رہے تھے۔ اسی دوران وہ پوری دنیا میں سنٹرل ورکس آرگنائزیشن کے ذریعے ان ضروری آلات اور پرزہ جات کی خریداری کا جال بچھا رہے تھے جو کہوٹہ ریسرچ لیبارٹریز کے لئے درکار تھے۔ یہ سب کچھ معمولی بات نہ تھی۔ ایک تنہا انسان بیک وقت اتنے محاذ کھولے ہوئے تھا کہ اس کا تصور کرنا بھی محال تھا۔

ایٹم بم کا حصول مسٹر بھٹو کا جنون تھا' لیکن ایٹم بم بنانے کے بارے میں بیانات دینا جتنا سہل ہے اس کی تیاری اتنا ہی دشوار عمل ہے۔ امریکہ نے 1945ء میں ہیروشیما اور ناگاساکی پر جن ایٹم بموں کے ذریعے قیامت برسائی تھی۔ وہ قدرتی یورینیم کو جلا کر پلوٹونیم کو پراسیسنگ پلانٹ کے ذریعے حاصل کر کے تیار کئے گئے تھے۔ بھارت نے 1974ء میں جو ایٹمی دھماکہ کیا' اس میں بھی یہی طریق کار اختیار کیا گیا تھا اور ظاہر ہے کہ اب یہ طریق کار متروک شمار ہوتا تھا۔ سائنسی ترقی 1945ء کے مقابلے میں اب کافی آگے نکل چکی تھی۔ امریکہ دوسری جنگ عظیم کے فوراً بعد سے ورجینیا یونیورسٹی میں یورینیم کی افزودگی کے ذریعے جوہری بم کی تیاری کا پروگرام شروع کر چکا تھا جس کے دو معروف طریقے ہیں۔ ایک گیس ڈیفوژن اور دوسرا سینٹری فیوج۔ اس دوسرے طریقے کی ایجاد کا کام امریکہ نے درمیان میں کئی مرتبہ روکا لیکن کمیونسٹ بلاک پر اپنی برتری قائم رکھنے کی کوشش میں پھر اس منصوبے پر کام شروع کر دیا جاتا رہا۔ برطانیہ' جرمنی اور ہالینڈ نے مشترکہ طور پر 1954ء میں اس منصوبے پر کام شروع کیا اور المیلو کے مقام پر ایک خفیہ پلانٹ اربوں ڈالر اور ہزاروں سائنس دانوں کی مدد سے شروع کیا۔ امریکہ کو اس منصوبے کی خبر ملی تو اس نے اپنے تینوں حلیف ممالک پر بھی اس سلسلے میں دباؤ ڈالنا شروع کیا اور 10 مارچ 1961ء تک ڈالتا رہا کہ یہ تینوں ممالک یورینکو نامی اپنے اس منصوبے کو ترک کر دیں لیکن یہ ممالک اپنے کام میں لگے رہے۔ خود امریکہ کو سینٹری فیوج کے ذریعے یورینیم کی افزودگی میں کامیابی 1979ء میں حاصل ہوئی جب وہ پورٹس ماؤتھ کے مقام پر واقع پلانٹ میں اس کی مکمل تنصیبات پر قادر ہو گیا۔

یہاں میں یہ واضح کرتا چلوں کہ یورینیم کی افزودگی میں کامیابی حاصل کرنے کا مطلب ڈائریکٹ جوہری بم تیار کر لینا ہے جس کے لئے نہ تو بھاری پانی کی ضرورت ہے' نہ کوئی ری ایکٹر لگانے یا ری پراسیسنگ پلانٹ خریدنے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ مسٹر بھٹو کو جب کوڑیوں کے مول خود پاکستانی سائنس دانوں اور انجینئروں کی کاوشوں سے یہ سب کچھ مل رہا تھا تو انہیں کیا ضرورت تھی کہ وہ ری پراسیسنگ پلانٹ کا سفید ہاتھی خرید کر پاکستان کی معیشت کو تباہ کرتے۔ چنانچہ وہ اس پلانٹ کو پاکستان کی اقتصادیات کے لئے سم قاتل تصور کرتے تھے۔ کابینہ میں ڈاکٹر قدیر یا کہوٹہ پلانٹ کا مسئلہ کبھی زیر بحث نہیں آیا تھا۔ یہ سب کچھ صرف چند افراد کے درمیان کا معاملہ تھا لیکن اب یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ امریکہ کو کسی طرح درحقیقت اس منصوبے کی بھی خبر مل گئی ہو اور مسٹر بھٹو امریکہ کی توجہات کو صرف ری پراسیسنگ پلانٹ تک محدود رکھنے میں کامیاب نہ رہ سکے ہوں' تاہم اس کے امکانات کم ہی ہیں' لیکن خود مسٹر بھٹو کو اپنے مشیروں اور کابینہ کے کچھ ارکان پر امریکی تعلقات کا شبہ تھا۔ امریکہ مسٹر بھٹو کے اقتدار کے درپے جو ہوا تو اس کے اسباب محدود نہیں تھے' تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ 10 جون کو قومی اسمبلی میں وزیر اعظم نے تقریر کے دوران ری پراسیسنگ پلانٹ کی خریداری کے سلسلے میں جس شد و مد سے اپنے عزائم کا اظہار کیا تھا اس کے بعد بات امریکہ کے لئے ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر قدیر کا نام تو سینٹری فیوج سسٹم کی کہوٹہ اور سہالہ کے مقام پر تنصیب کے معاملے میں بہت بعد میں سامنے آیا۔ وہ بھی 1982ء کے لگ بھگ جب پاکستان اس معاملے میں کامیابی حاصل کر چکا تھا اور مجھے یقین نہیں کہ امریکہ کو اس معاملے کی کوئی خبر 1976ء میں مل چکی ہو گی۔ تاہم امکانات موجود ہیں۔

ڈاکٹر قدیر اور کہوٹہ ریسرچ لیبارٹریز کے بارے میں خود مسٹر بھٹو کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ہائی کورٹ اور بعد ازاں سپریم کورٹ میں اپنے حق میں ہر قسم کے دلائل دینے کے دوران وہ صرف ری پراسیسنگ پلانٹ کو امریکہ سے وجہ مخاصمت بتا رہے تھے اور کہوٹہ ریسرچ لیبارٹریز کے ڈاکٹر قدیر کا نام ان کی زبان پر نہیں آیا تھا۔ لیکن یہاں یہ امر شک پیدا کرتا ہے کہ امریکہ محض ری پراسیسنگ پلانٹ کے مسئلے پر ان کے پیچھے نہیں پڑ سکتا تھا جب کہ امریکیوں پر یہ واضح تھا کہ پلانٹ پاکستان کے لئے ملٹری آپشن نہیں رکھتا۔ مسٹر بھٹو کے خلاف امریکہ کا پوری قوت سے محاذ کھول دینا اس شک میں مبتلا کرتا ہے کہ کہیں امریکہ کو کہوٹہ پلانٹ کے سلسلے میں تو کوئی خبر نہیں مل گئی تھی۔ بہر حال اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا' خصوصاً اب جب کہ پاکستان مسٹر بھٹو کے خواب کی تعبیر حاصل کر چکا ہے اور ان کے خلاف تمام ممکنہ سازشیں کرنے کے باوجود امریکہ پاکستان کو اس کی راہ سے نہیں ہٹا سکا' اس کا معلوم کرنا ایسا ضروری بھی نہیں رہا۔

وزیر اعظم بھٹو 18 جون کو ہفتہ کے روز سعودی عرب روانہ ہوئے۔ جہاں شاہ خالد سے ہنگامی ملاقات کے بعد انہیں اسی روز لیبیا روانہ ہونا تھا۔ ان کے ہمراہ عزیز احمد' آغا شاہی' افضل سعید' مسعود نبی نور' اے۔ اے۔ فاروق' مہدی مسعود اور چند دیگر حکام تھے۔ وفد میں شریک لوگوں کے نام بھی امریکہ کو یہ باور کرانے کے لئے کافی تھے کہ مسٹر بھٹو درحقیقت پلانٹ کی خریداری کے لئے سرمایہ حاصل کرنے ہی جا رہے ہیں ورنہ ایک انتہائی کشیدہ اندرونی صورت حالات میں اور اپوزیشن کے ساتھ مذاکرات کے انتہائی نازک موڑ پر ان کا ملک سے باہر جانا انتہائی ناقابل فہم نظر آتا تھا۔ ان کی ملک سے عدم موجودگی کے دوران ہی مذاکرات میں تعطل آیا جس پر سوموار 20 جون کو اسلام آباد میں مولانا مفتی محمود نے شدید تنقید کی اور یہ کہا کہ مسٹر بھٹو کو قومی اتحاد سے مشورہ کئے بغیر ملک سے باہر نہیں جانا چاہئے تھا انہوں نے کہا کہ مجھ سے بھٹو نے صرف لاڑکانہ تک جانے کی بات کی تھی اور اب وہ ابوظہبی میں بیٹھے ہیں۔

مولانا مفتی محمود کو کیا پتہ تھا کہ مسٹر بھٹو انتہائی تھکے ہوئے ہونے کے باوجود لاڑکانہ تھکن اتارنے کے لئے جانے کی بجائے اچانک بیرون ملک کیوں دوڑے تھے اور انہوں نے کیوں اسی روز یعنی 20 جون کو ابوظہبی ٹی۔ وی۔ کو انٹرویو دیتے ہوئے یہ کہا تھا کہ پاکستان ہر قیمت پر ری پراسیسنگ پلانٹ حاصل کر کے رہے گا اور کیوں مسٹر بھٹو نے تیسری اسلامی سربراہی کانفرنس بلانے کی تجویز پیش کی تھی۔ ان کے اس انٹرویو کا ایک اہم ترین حصہ جس پر امریکہ مزید چیں بہ چیں ہو سکتا تھا وہ یہ تھا جس میں انہوں نے اسلامی ممالک کے درمیان مشترکہ دفاع کے سمجھوتے کی ضرورت پر زور دیا تھا۔ امریکہ اور خصوصاً کارٹر کے ساتھ جتنی بڑی پنجہ آزمائی مسٹر بھٹو کر رہے تھے مفتی محمود مرحوم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ان تمام باتوں سے جمی کارٹر کا یہ یقین پختہ ہو چکا تھا کہ بھٹو متذکرہ بالا

اسلامی ممالک کے تعاون سے ری پراسیسنگ پلانٹ حاصل کرلیں گے بلکہ ان ممالک سے فرانس پر دباؤ بھی دلوائیں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ پلانٹ کے دیگر لوازمات بھی اسی طرح حاصل کرلیں۔ 22 جون کو وزیراعظم اچانک ہی اپنے وفد کے ہمراہ تہران سے کابل جا پہنچے اور وہاں بھی انہوں نے یہی بیان دیا کہ فرانس معاہدے کے سلسلے میں اپنے فیصلے پر قائم ہے۔ ملک سے باہر مسٹر بھٹو کے ان اعلانات نے امریکہ کو بے حد برافروختہ کیا اور یہی مسٹر بھٹو کا مقصد بھی تھا کیونکہ اس وقت ان کے سامنے اس کے سوا کوئی دوسرا مسئلہ نہ رہ گیا تھا کہ وہ ہر قیمت پر کہوٹہ ریسرچ لیبارٹریز کی تنصیبات اور وہاں شروع ہونے والے "اصل کام" کو دنیا بھر سے پوشیدہ رکھ کر فرانس کے ساتھ ری پراسیسنگ پلانٹ کی خریداری کے معاہدے سے جان چھڑائیں۔ اگرچہ ان کا یہ منصوبہ ان کی موت کے بعد پایہ تکمیل تک پہنچا اور آج اپنے دیرینہ خواب کی تعبیر دیکھنے کے لئے وہ ہم میں موجود نہیں لیکن ایٹمی ترقی کے باب میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ خصوصاً جس طرح انہوں نے اپنی ایک غلطی کا ازالہ کرنے کے لئے ایک ایسا پلاٹ تیار کیا جس سے عالمی طاقتیں تک چکرا گئیں، وہ ایک ایسا کارنامہ ہے جسے صرف مسٹر بھٹو ہی انجام دے سکتے ہیں"۔

مولانا کوثر نیازی نے بڑے واضح انداز میں ایٹم سازی کے حصول میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی کاوشوں اور منیر احمد خان کی سازشوں کو بھی بے نقاب کیا تھا اور اس حقیقت کو سامنے لائے تھے کہ بھٹو استحکام پاکستان اور اس کی سلامتی میں کس قدر مخلص تھے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس عہد میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان جیسا ہیرا شخص منیر احمد خان کی سازشوں کی وجہ سے ملک چھوڑ کر چلا جاتا تو کیا پاکستان سلامت رہ سکتا تھا...... اور آج پاکستان کو دنیا میں جو وقار حاصل ہوا ہے کیا وہ اس کو مل سکتا تھا؟...... کیا صدر مملکت جنرل پرویز مشرف آگرے میں سینہ نکال کر واجپائی سے کشمیر کے کور ایشو پر اس طرح دوٹوک بات کر سکتے تھے؟۔ اس سوال کا جواب ملک کی ابتر سیاسی حالت، مہنگائی، افسر شاہی کی لوٹ کھسوٹ اور منافق سیاستدان کے طرز عمل کے پس منظر میں تلاش کرنے کی کوشش کریں تو دل کو شدید دھچکا لگے گا۔

بھٹو' ضیاء اور منیر احمد

بزرگ صحافی عبدالقادر حسن اپنے کالموں میں منیر احمد خان کی ڈاکٹر عبدالقدیر خان سے دشمنی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب بھٹو اور ضیاء الحق پر منیر احمد خان کی حقیقت کھلی تو وہ ڈاکٹر خان سے کہا کرتے تھے کہ وہ منیر احمد خان کو اپنے منصوبوں اور عزائم کی خبر نہ ہونے دیا کریں اور اس سے ہوشیار رہیں۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ اپنے عہد کے دو بڑے حکمران منیر احمد خان کی حقیقت جاننے کے باوجود انہیں برخواست کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔

منیر احمد خان
آئی ایس آئی کی نظر میں

یہ بڑی عجیب بات اور المیہ ہے کہ منیر احمد خان متنازعہ اور مشکوک شخصیت ہونے کے باوجود پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن کے سیاہ وسفید کے مالک بنے رہے۔ حالانکہ بھٹو پر ان کی علمی صلاحیت اور عزائم بہت جلد کھل گئے تھے۔

بھٹو نے ملتان میں ہونے والی سائنسدانوں کی کانفرنس میں ڈاکٹر عثمانی کو ہٹا کر منیر احمد خان کو ایٹمی توانائی کمیشن کا چیئرمین بنایا اور سائنسدانوں سے سوال کیا تھا کہ وہ پاکستان کو کب تک ایٹمی صلاحیتوں سے مالامال کر سکتے ہیں۔

کسی سائنسدان نے کہا سات سال کسی نے آٹھ سال کا وعدہ اور کچھ نے کہا صرف تین سال میں......لہذا بھٹو نے منیر احمد خان کو ٹارگٹ دیا کہ وہ ایٹمی توانائی کمیشن کے چیئرمین کی حیثیت میں ایسا فوری منصوبہ بنائیں کہ پاکستان یورینیم کی افزودگی میں خودکفیل ہو جائے۔ لیکن منیر احمد خان 20 سال تک پاکستان اٹامک انرجی کمیشن کے چیئرمین رہے اور انہوں نے ایٹمی منصوبوں کی بیل منڈھے نہ چڑھنے دی۔

منیر احمد خان کے بارے میں جب یہ معلوم ہوا کہ وہ امریکہ کا بہت لاڈلا ہے اور اس کا کردار مشکوک ہے تو اس وقت کے آئی ایس آئی کے سربراہ جنرل نقوی نے اس پر پڑتال شروع کر دی۔ انہوں نے پہلے تو اپنے طور پر کھوج لگانے کی کوشش کی لیکن پھر انہوں نے منیر احمد خان کی مکمل انکوائری کرنے کی ذمہ داری بریگیڈیئر سید احمد ارشاد ترمذی کے سپرد کی جو اس وقت آئی ایس آئی میں تعینات تھے۔ بریگیڈیئر ترمذی آئی ایس آئی میں ڈائریکٹر اور بعد میں چیف آف سٹاف رہے۔ جنرل نقوی نے انہیں بلا کر کہا ''ترمذی معلوم کرو کہ منیر احمد خان کیا شے ہے اور یہ کنفرم کرو کہ کیا وہ امریکہ کا خفیہ دوست ہے۔ اس کی حرکتیں اور پالیسیاں پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن کو پروان نہیں چڑھنے دے رہیں۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ منیر احمد نادان شخص ہے یا انتہا درجے کا عیار......کیا یہ شخص عقل کا کورا ہے یا پھر جان بوجھ کر ایسی حرکتیں رہا ہے؟''

بھٹو دور میں بھی آئی ایس آئی نے منیر احمد خان کے خلاف اس وقت کارروائی کی کوشش کی تھی جب معلوم ہوا کہ وہ قادیانی ہے لیکن منیر احمد خان نے اثر ورسوخ استعمال کر کے انکوائری رکوا دی تھی۔ (اس کی تفصیل اسی کتاب کے اگلے صفحات میں موجود ہے)

بریگیڈیئر ترمذی نے منیر احمد خان کے خلاف انکوائری کی۔ انہوں نے اپنی کتاب میں بڑے واضح اور واشگاف الفاظ میں اس انکوائری میں منیر احمد خان کے خفیہ کردار کا انکشاف کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''تحقیقات سے ہمارے علم میں یہ بات آئی کہ پچاس کی دہائی میں امریکہ نے ''ایٹم برائے امن'' کے عنوان سے ایک پروگرام کا آغاز کیا تھا۔ جس کا مقصد دنیا بھر کے سائنس دانوں کو یہ ترغیب دینا تھا کہ وہ ایٹمی توانائی کو پرامن مقاصد کے لئے کیسے استعمال کر سکتے ہیں۔ حکومت پاکستان نے منیر احمد خان کو اس کورس کے لئے نارتھ کیرولینا سٹیٹ کالج' امریکہ میں سرکاری طور پر بھیجا مگر تربیت مکمل کرنے کے بعد منیر احمد خان نے وطن واپسی کا ارادہ ترک کر دیا۔ انہوں نے ایک غیر ملکی خاتون سے شادی کر لی اور وہیں ملازمت بھی کر لی۔ یوں انہوں نے حاصل کردہ علم اور تجربہ پاکستان کے لئے استعمال کرنے کی بجائے زیادہ تنخواہ اور خوشحال زندگی کو ترجیح دی۔ اگر ان کی جگہ کوئی اور پاکستانی ہوتا تو یقینی طور پر اپنے ذاتی مفاد کو بالائے طاق رکھتے ہوئے قومی خدمت اور پاکستان کے مفاد کو افضل جانتا اور کورس کے بعد واپس آ کر اپنے ملک وقوم کی خدمت کرتا۔

1972ء میں ذوالفقار علی بھٹو نے ایٹمی پروگرام کے آغاز کا فیصلہ کیا تو انہیں ایک تربیت یافتہ اور تجربہ کار سائنس دان کی تلاش تھی۔ ''کسی'' نے بھٹو سے منیر احمد خان کا تعارف کرایا اور بھٹو نے انہیں پاکستان اٹامک انرجی کمیشن کا چیئرمین بنا دیا تاکہ پاکستان کا یہ شعبہ دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے۔

منیر احمد خان کا پہلا نشانہ ہمارا کراچی کا ایٹمی پاور پلانٹ اور ڈاکٹر عثمانی تھے۔ 1966ء میں کینیڈا کے دیئے ہوئے ایٹمی بجلی گھر' کانوپ' پر کام شروع کیا گیا تھا۔ عمارت وغیرہ کی تعمیر کا کام 1969ء میں مکمل ہوا اور آزمائشی طور پر بجلی کی پیداوار اور فراہمی 1971ء میں شروع ہوئی مگر منیر احمد خان نے ڈاکٹر عثمانی کو جنہوں نے دن رات کی محنت شاقہ سے کام مکمل کروایا تھا' نکال باہر کیا اور اس پراجیکٹ کا تمام تر کریڈٹ خود لیتے ہوئے 1972ء میں چیئرمین کی حیثیت سے اس کا افتتاح کیا۔

تحقیقات کے دوران ہمیں بعض سائنس دانوں نے بتایا کہ منیر احمد خان نے انہیں کبھی کوئی ایٹمی توانائی یا ایٹمی پاور پلانٹ پالیسی تیار کرنے کی نہ تو اجازت دی اور نہ ہی خود ایسی کوئی پالیسی بنائی۔ 1965ء میں پاکستان کے پاس 5 میگاواٹ کا صرف ایک ریسرچ ری ایکٹر تھا مگر 1989ء تک اس میں کوئی اضافہ یا ترقی نہ ہوئی اور صرف 1969ء میں چین سے 28 میگاواٹ کا ''ٹوائے ری ایکٹر'' خریدا گیا۔

''کانوپ'' کے سائنس دانوں نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ جب 1974ء میں کینیڈا نے ایٹمی ایندھن' بھاری پانی اور سپیئرز وغیرہ کی سپلائی پر پابندی کا اعلان کیا تو پاکستانی سائنس دان' انجینئرز اور ٹیکنیشنز نے اس پلانٹ کو پوری حفاظت کے ساتھ اور بھرپور طریقے سے چلانا شروع کر دیا۔ انہوں نے اپنے طور پر ایندھن کی تیاری اور دیگر مطلوبہ فاضل پرزہ جات بنانے کی صلاحیت بھی پیدا کر لی اور ہم کینیڈا کے دست نگر نہ رہے۔

یہ پلانٹ 95 میگاواٹ بجلی مہیا کر رہا تھا جو ہمارے سائنس دانوں اور ماہرین کی فنی مہارت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ ہمارے سائنس دان اس پلانٹ کا ایک ڈپلیکیٹ تیار کرنے کے لئے بے چین تھے مگر منیر احمد خان نے انہیں اس بات کی اجازت نہ دی۔ حتیٰ کہ ایک بار ٹیکنیکل ایڈوائزری کمیٹی نے جس کے سربراہ خود وزیراعظم ہوتے ہیں پلانٹ کا ڈپلیکیٹ تیار کرنے کی منظوری دے دی مگر منیر احمد خان نے اس فیصلے کو سبوتاژ کر دیا۔

1974ء میں ''پاک نور'' کے نام سے 40 میگاواٹ کے ایک کینیڈین طرز کے' این آر ایکس ری ایکٹر کی کاپی کی تجویز پیش کی گئی مگر منیر احمد خان نے اسے بھی منزل تک نہ پہنچنے دیا۔ 1976ء میں چشمہ کے مقام پر 600 میگاواٹ کے ایک پاور پلانٹ کی منظوری دی گئی مگر یہ بھی چیئرمین صاحب کی ''شاندار'' پالیسیوں اور منصوبہ بندی کی نظر ہو گیا۔

2 جنوری 1974ء کو ذوالفقار علی بھٹو نے ملتان میں اعلان کیا کہ پاکستان دو برس تک ایٹمی طاقت بن جائے گا۔ ان کے منہ میں یہ الفاظ کس نے ڈالے یہ جاننا مشکل نہیں ہے۔ اس کے بعد پلاٹونیم کے حصول کی لاحاصل کوششوں اور ناکامیوں کا دور شروع ہوا۔ یہ بات قابل غور ہے کہ پلاٹونیم 240 اور 242 دنیا بھر کی ایٹمی منڈی میں ایٹمی ایندھن کے لئے انتہائی نقصان دہ سمجھا جاتا ہے کیونکہ یہ مختلف مربوط ردعمل پیدا کرتا ہے۔ لہذا پلاٹونیم کی اس قسم کے حصول کی کوئی بھی منصوبہ بندی کسی طرح بھی مفید اور بامقصد نہیں قرار پا سکتی اور اسے محض وقت' انرجی اور سرمائے کا ضیاع ہی کہا جا سکتا ہے۔ مگر موصوف نے ایک ایٹمی ری پروسیسنگ خریدنے کا مشورہ بھی دیا۔ جبکہ بہت سے سائنس دانوں کی ماہرانہ رائے میں پلانٹ کو قابل عمل بنانے کے لئے استعمال شدہ یورینیم کی بھاری مقدار کی ضرورت ہوتی ہے۔ جبکہ کانوپ سے جو استعمال شدہ یورینیم حاصل ہوتا ہے اس کی افادیت صفر ہے جسے محض محفوظ کر لیا جاتا ہے۔

یہ سارا منظرنامہ دراصل پاکستان کے جلد ایٹمی طاقت بن جانے کی راہ میں رکاوٹ اور پاکستان اور اس کے عوام کے خلاف بہت بڑی سازش تھی۔

ہم نے اس ضمن میں جتنے سائنس دانوں سے بات کی وہ سب کے سب اس بات پر متفق تھے کہ منیر احمد خان نے جان بوجھ کر غلط پالیسیاں بنائیں اور اپنے ساتھیوں اور ماتحتوں کے کام کو نہ تو کبھی سراہا اور نہ ہی اسے قومی مفاد کے لئے استعمال کرنے کی اجازت دی۔ یہ منیر احمد خان کا معاندانہ رویہ ہی تھا جس کی وجہ سے بہت سے قابل لائق اور باصلاحیت نوجوان سائنس دان پاکستان چھوڑنے اور بیرون ملک ملازمتیں تلاش کرنے پر مجبور ہو گئے۔ منیر احمد خان کی ''آقا پرستی'' کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہو سکتی ہے؟

مزید تحقیقات سے یہ انکشاف بھی ہوا کہ منیر احمد خان کے امریکیوں کے ساتھ خاصے روابط ہیں اور وہ اور اس کے اہل خانہ اکثر امریکی سفارتکاروں کی نجی محفلوں میں دیکھے جاتے ہیں' یہاں تک کہ ایک بار جب منیر احمد خان اور ان کی اہلیہ دو ماہ کی چھٹیاں گزارنے یورپ گئے تو اپنی دو نوجوان بیٹیوں کو اپنے ہمسائے میں رہنے والے ایک امریکی سفارتکار کے پاس چھوڑ گئے جو غیر شادی شدہ تھا۔ یہ دونوں نوجوان لڑکیاں پورے دو ماہ اس امریکی سفارتکار کے ساتھ رہیں اور اس عرصے میں کوئی پاکستانی فیملی نہ تو انہیں ملنے آئی اور نہ ہی یہ کسی سے ملنے گئیں۔

ایک مرتبہ منیر احمد خان کی سربراہی میں پاکستانی سائنس دانوں کی ایک ٹیم نے ایک یورپی ملک کا دورہ کیا اور وہاں تکنیکی تعاون کے حوالے سے بہت سی کارآمد اور مفید میٹنگز کیں۔ واپسی پر ٹیم کے ارکان نے رپورٹ دی کہ وطن واپسی کے دوران تمام ممبروں کے سامان سے ان میٹنگوں کے نوٹس اور دیگر دستاویزات چوری کر لی گئی ہیں۔

چنانچہ مجھے اس اہم واقعہ کی تحقیقات کا فرض سونپا گیا۔ میں نے اپنی تفتیش کا آغاز منیر احمد خان سے کیا۔ میں پہلے سے طے شدہ وقت کے مطابق جب منیر احمد خان کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ ایک ٹرانسسٹر ریڈیو پر گھبراہٹ کے عالم میں اپنی انگلیاں گھما رہے تھے۔ جیسے کوئی خاص اسٹیشن تلاش کر رہے ہوں۔ میرے کرسی پر بیٹھنے تک وہ

اسی کوشش میں مصروف رہے اور پھر اسے بند کئے بغیر مجھ سے ہاتھ ملانے کے لئے اٹھے۔ ریڈیو سے عجیب وغریب آوازیں برآمد ہو رہی تھیں۔ ان کی یہ حرکت اس بات کی غماز تھی کہ انہیں کسی نے مشورہ دیا ہوگا کہ اس طرح ان کے اور میرے درمیان ہونے والی گفتگو کو میں خفیہ طور پر ریکارڈ نہ کرسکوں گا۔ میں نے انہیں بتایا کہ یہ ایک کھلی انکوائری ہے انہیں اپنے بیان پر دستخط کرنا ہوں گے اور میرے پاس ایسا کوئی آلہ بھی نہیں ہے کہ گفتگو ریکارڈ ہو سکے لہذا بہتر ہے کہ وہ ریڈیو بند کردیں مگر انہوں نے میری بات نہ مانی اور ریڈیو چلتا رہا۔ وہ انتہائی گھبراہٹ کے عالم میں تھے اور اسی عالم میں انہوں نے یہ بیان دیا۔

میں نے جنرل نقوی کو بتا دیا ہے کہ میں کسی بیان پر دستخط نہیں کروں گا۔ ادارے کے سربراہ کی حیثیت سے میں آپ کو صرف وہی بتاؤں گا جو میرے ماتحتوں نے مجھے بتایا ہے اور ساتھ مجھے اس بات کا یقین بھی دلایا گیا ہے کہ آپ میرے کسی ماتحت کو تفتیش کے لئے اپنے ساتھ نہیں لے جائیں گے۔ آپ نے جو کچھ بھی پوچھنا ہے یہیں پوچھیں گے۔

کاغذات مجھ سے گم نہیں ہوئے دراصل میں نے تمام کاغذات اپنی ٹیم کے دو ممبران کے سپرد کردیئے تھے' جنہوں نے مختلف مقامات پر انہیں گم کردیا۔ میں تو واپسی پر ان کے ساتھ بھی نہ آیا۔ ہم سب لوگ الگ الگ وطن واپس آئے تھے۔ کانفرنس کے بعد میں کسی اور ملک میں چلا گیا تھا"۔ منیر احمد خان گھبراہٹ میں بولتے جارہے تھے۔

"جب ہم اس ملک میں پہنچے جہاں ہماری میٹنگ تھی تو ہم نے وہاں اپنے ناظم الامور سے کہا کہ ہمارے پاس کچھ حساس دستاویزات ہیں جنہیں ہم اپنے سفارتخانے کے لاکر میں رکھنا چاہتے ہیں تاکہ وہ محفوظ رہیں مگر ناظم الامور نے مجھ سے کہا کہ یہ ایک معمولی سا مشن ہے اور یوں بھی یہاں کا معاشرہ اچھا نہیں' سفارتخانے کا عملہ اکثر رات کو یہاں لڑکیاں لے آتا ہے لہذا ایسی حساس دستاویزات کا یہاں رکھنا خطرے سے خالی نہیں۔ بہتر ہے آپ اپنی ذاتی حفاظت میں رکھیں چنانچہ ہم یہ دستاویزات اپنے پاس رکھنے پر مجبور تھے۔

اپنے قیام کی پہلی ہی رات جب ہم ہوٹل کے ڈائننگ روم سے کھانا کھا کر اپنے کمروں میں واپس آئے تو ہمیں پتہ چلا کہ ہمارے کاغذات غائب ہیں۔ تاہم کانفرنس کا پہلا اجلاس ہم نے جیسے تیسے نبھایا کیونکہ ہم سب اپنے اپنے موضوع پر مہارت رکھتے تھے مگر میٹنگ کے دوران ہم نے اپنے میزبانوں سے چند نوٹس کا تبادلہ کرکے ضروری ریکارڈ نئے سرے سے مرتب کرلئے۔ واپس وطن آنے سے قبل حفاظتی اقدام کے طور پر میں نے یہ کاغذات وفد کے دونوں ارکان میں تقسیم کردیئے تاکہ اگر دوبارہ انہیں حاصل کرنے کی کوشش کی جائے تو ہم سارے ریکارڈ ہی سے ہاتھ نہ دھو بیٹھیں۔ میں وہاں سے کسی اور ملک کے لئے روانہ ہو گیا اور ان دونوں ارکان کو علیحدہ علیحدہ پروازوں پر وطن روانہ کردیا گیا۔

واپسی پر مجھے بتایا گیا کہ مسٹر ایکس وائی زیڈ کے کاغذات پرواز کے دوران اس کے بریف کیس سے چرا لئے گئے۔ اس نے مجھے بتایا کہ چونکہ سفر طویل تھا پرواز کے دوران اسے نیند آ گئی اور اسے علم نہیں کہ کس وقت اور کیسے اس بریف کیس کو کھول کر یہ کاغذات اڑا لئے گئے۔

دوسرے رکن مسٹر اے بی سی نے بتایا کہ اسے ہیتھرو ائرپورٹ پر اپنی پرواز تبدیل کرنا تھی۔ ٹرانزٹ کے دوران لاونج میں لگے ٹیلی فون بوتھ سے لندن میں وہ کسی دوست کے ساتھ بات کررہا تھا اور اس نے اپنا بریف کیس پاس ہی رکھا ہوا تھا مگر جونہی اس نے ٹیلی فون بند کیا اسے احساس ہوا کہ اس کا بریف کیس وہاں نہیں ہے۔ اس نے چور کو پکڑنے اور بریف کیس تلاش کرنے کی پوری کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ خوش قسمتی سے اس کا ٹکٹ' پاسپورٹ اور پیسے اس کی کوٹ کی جیب میں تھے۔ وگرنہ اسے وطن پہنچنے میں سخت دشواری کا سامنا کرنا پڑتا اور آپ تو جانتے ہیں۔ مجھے اپنے ماتحتوں پر یقین ہے اور کاغذات ایسے ہی گم ہوئے ہیں"

وفد کے دوسرے دونوں ارکان نے بھی مجھے یہی کہانی لفظ بہ لفظ سنا دی جس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اسے باہمی تبادلہ خیال کے بعد تیار کیا گیا ہے۔ بہرحال میں نے اپنی رپورٹ میں اسے کوتاہی چھپانے اور غیر ذمہ دارانہ رویے کی معراج قرار دیا۔ جو مجھے بتایا گیا سب جھوٹ کے پلندے کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ میری دوسری رائے یہ تھی کہ ہوسکتا ہے ان اہم قومی دستاویزات کو چند سکوں کے عوض فروخت کردیا گیا ہو۔

میں نے یہ مشورہ بھی دیا کہ اگر حکام واقعی حقائق جاننے میں دلچسپی رکھتے ہیں تو منیر احمد خان اور اس کی ٹیم کو ہمارے حوالے کردیا جائے تاکہ ہم اپنے طریقہ کار سے حقائق معلوم کرسکیں مگر شاید کسی مصلحت کی بنا پر اس تجویز کے بارے میں مکمل خاموشی اختیار کی گئی۔ صدر مملکت جنرل ضیاء الحق نے منیر خان کو کیا کہا اور کہا نہ کہا ہمیں کچھ معلوم نہیں کیونکہ ہم خوامخواہ ان قومی امور میں جن کا تعلق براہ راست ہمارے ساتھ نہ ہو دخل اندازی نہیں کرتے ......

بہرحال مجھے آج بھی اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ پاکستان اٹامک انرجی کمیشن کے چیئرمین کو اس کے ضمیر نے کبھی ملامت کیوں نہیں کی۔ کسی بھی دوسرے ملک میں اس جرم کی کم سے کم اور نرم ترین سزا یہ ہوتی کہ اسے فائرنگ سکواڈ کے سامنے کھڑا کردیا جاتا۔

جب ڈاکٹر قدیر خان پاکستان آئے تو منیر احمد خان نے بھرپور کوشش کی کہ وہ اس کی ماتحتی میں کام کریں۔ اس نے اپنے طور پر ہر طرح کی منصوبہ بندی کی کہ ڈاکٹر قدیر کا پراجیکٹ پی اے ای سی کا ایک سب سیکشن بن کر رہ جائے۔ اس سلسلے میں اس نے جنرل ضیاء سے بھی متعدد بار ملاقاتیں کیں مگر ڈاکٹر قدیر کے بارے میں جنرل ضیاء کے ذہن میں کچھ اور ہی تھا لہذا ایسا اہتمام کروایا گیا کہ منیر احمد خان کو اس بات کا علم نہ ہو سکے کہ ڈاکٹر قدیر خان کیا کر رہے ہیں۔

ایک موقع ایسا بھی آیا کہ جنرل نقوی کو ایسے بہت سے شواہد ل گئے جن کی بناء پر منیر احمد خان کی اٹامک انرجی کمیشن کے چیئرمین کے عہدے سے چھٹی کرائی جاسکتی تھی بہت سے سینئر سائنس دانوں کے انٹرویوز کا سلسلہ شروع ہوا جس میں پاکستان میں اس وقت کے ٹریگر ٹیکنالوجی کے واحد ماہر ڈاکٹر سبطین بخاری بھی شامل تھے (جو بعد ازاں ڈیسٹو (Desto) کے چیئرمین کے عہدے سے ریٹائر ہوئے) جنرل نقوی کے مطابق جنرل ضیاء نے ان شواہد کی مکمل تحقیق کے بعد کئی اعلیٰ سطحی اجلاس منعقد کئے اور ایک اجلاس میں منیر احمد خان کو ریٹائر کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا' اور اس کی جگہ ایک صاحب کو نامزد بھی کردیا گیا۔ اس اجلاس کے خاتمے پر جب جنرل ضیاء کمرے سے باہر چلے گئے تو چند قدموں پر جنرل کے ایم عارف نے ان کو روک لیا اور چند منٹ تک ان سے باتیں کرتے رہے۔ گفتگو ختم کرکے جنرل عارف میٹنگ روم میں واپس آئے اور ایک ایسا اعلان کیا جو میٹنگ کے شرکاء کے لئے انتہائی حیرت کا باعث تھا۔ انہوں نے فرمایا "منیر احمد خان کی ریٹائرمنٹ کا فیصلہ واپس لے لیا گیا ہے' وہ پی اے ای سی کے سربراہ رہیں گے۔"

بہرحال جہاں تک پاکستان کے ایٹمی طاقت بننے کی خواہش اور اس میدان میں ہماری پیش رفت کا سوال ہے تو اس سلسلے میں منیر احمد خان کا "دی نیشن" اخبار کے 18 ستمبر 1987ء کے شمارے میں ایک مضمون شائع ہوا جس سے چند اقتباسات درج ذیل ہیں۔

"ایٹمی پھیلاؤ بنیادی طور پر ایک سیاسی مسئلہ ہے۔ ہتھیاروں کا حصول' خاص طور سے ایٹمی ہتھیاروں کا حصول ملک کی سلامتی اور قومی ضرورت سے منسلک ہوتا ہے۔ لیکن ایک ترقی پذیر ملک کے لئے ایٹمی اسلحہ کا حصول اس کی سلامتی اور تحفظ کا ضامن نہیں' بلکہ یہ تو خطرناک ثابت ہوسکتا ہے کیونکہ دوسرا ملک آپ کے خلاف ایٹمی اسلحہ استعمال کرسکتا ہے اس لئے آپ موثر طور پر اپنا دفاع نہیں کرسکتے' اس کے علاوہ اگر کوئی ترقی پذیر ملک ایٹمی طاقت بننے کی کوشش کرے تو اس کے اقتصادی وسائل اس کے متحمل نہیں ہوسکتے اور یہ قوم پر ایک ناقابل برداشت بوجھ ڈال دیتا ہے' خاص طور سے جب ملک کی زیادہ آبادی زندگی کی بنیادی سہولتوں سے بھی محروم ہو۔ ترقی پذیر ممالک کی ایٹمی طاقت بننے کی خواہش صرف سیاسی ہے یا ایٹمی قوتوں کی پالیسی کا ردعمل جیسا کہ این پی ٹی معاہدے میں کہا گیا ہے۔ تاہم پاکستان کو کسی طور ایٹمی قوت نہیں بننا چاہیے۔"

منیر احمد خان امریکہ کو عزیز تھے اور نہیں چاہتا تھا کہ کسی دوسرے ملک کو اس بات کی بھنک پڑے۔ کہوٹہ کی جاسوسی کرنے والے سفارت کاروں سے ایک بار امریکہ نے دریافت کیا تھا کہ ان کے منیر احمد خان سے تعلقات کیسے تھے۔ اسی حوالے سے بریگیڈیئر ترمذی نے لکھا ہے کہ ہمیں معلوم ہوا کہ امریکی فرانسیسی سفارت خانہ کے فرسٹ سیکریٹری فورلوٹ سے جاننا چاہتے تھے کہ ان کے منیر احمد خان سے کیسے روابط ہیں؟ اور فورلٹ نے اس کا جواب نہ دیا امریکی شاید اس بات سے ڈر رہے تھے کہ کہیں فرانسیسیوں نے منیر احمد خان کو اپنے ساتھ نہیں ملا لیا اور وہ ان کے ہاتھ سے نکل جائے۔ میرے نزدیک اس اہم معاملہ کی تفصیلی تفتیش کی جانی چاہیے۔ صرف اسی طریقے سے ہمیں یہ پتہ چل سکتا ہے کہ آیا منیر احمد خان کا موقف درست تھا' وہ محب وطن تھے یا نااہل' غیر ذمہ دار یا دشمن کے ایجنٹ؟ کیا پاکستان اٹامک انرجی کمیشن نے ان کی سربراہی میں ترقی کی یا تنزلی کا شکار رہا؟ کوئی ہے جواب اس سارے معاملے کی چھان بین کرے تاہم میں نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کی بنیاد اس تفتیش اور بات چیت سے سامنے آنے والے وہ حقائق ہیں جن میں سے چند میں نے یہاں بیان کردیئے ہیں۔

آغا شاہی کے انکشافات

پاکستان کے سابق وزیر خارجہ آغا شاہی منیر احمد خان کے ڈاکٹر عبدالقدیر خان سے بغض وعناد اور پاکستان کی ایٹمی صلاحیتوں کو سبوتاژ کرنے کی کوششوں کے رازدار ہیں۔ غلام اسحاق خان کی طرح انہیں بھی پاکستان کے ایٹمی پراجیکٹ کی باریکیوں اور مسائل سے آگاہی تھی۔ انہوں نے یکم جولائی 2001ء کو روزنامہ جنگ کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے انکشاف کیا کہ منیر احمد خان کی ڈاکٹر خان سے دشمنی ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ انہوں نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی ریٹائرمنٹ و دیگر محرکات کے حوالے سے کہا کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا کہنا ہے کہ سی ٹی بی ٹی پر دستخط کرنے سے پاکستان کی ایٹمی صلاحیت پر فرق نہیں پڑے گا مجھے قدیر خان کے اس نقطہ نظر سے اتفاق نہیں ہے اگر ڈاکٹر قدیر

خان کی حالیہ تبدیلی کے حوالے سے دیکھا جائے تو انہوں نے حکومت کے راستے میں کبھی کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی لیکن ڈاکٹر قدیر خان کے خلاف پروپیگنڈہ بہت ہوتا رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ڈاکٹر قدیر خان کسی کا کہنا نہیں مانتا۔ 1989ء میں جنرل اسلم بیگ اور بے نظیر نے مل کر یہ کہا تھا کہ اب یورینیم کی مزید افزودگی کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ پاکستان کے پاس دو یا تین بموں کے لئے میٹریل موجود تھا بعد میں پتہ چلا کہ ڈاکٹر قدیر خان نے ان کی ہدایت نہیں مانی اور یورینیم کی نوے فیصد افزودگی کرنے کے کام کو جاری رکھا۔

آغا شاہی مزید کہتے ہیں کہ ڈاکٹر قدیر خان سے حسد بہت کیا جاتا تھا۔ اٹامک انرجی کمیشن والے ان سے جلتے تھے۔ اٹامک انرجی کمیشن کے چیئرمین منیر احمد خان ہمیشہ ان کے خلاف رہتے تھے۔ حالانکہ خود ان کا اس میں کوئی حصہ نہیں تھا۔ مجھے اس پروگرام کے حالات کا علم ہے کیونکہ ذوالفقار علی بھٹو کے زمانے میں اس کام کی نگرانی کے لئے میرے غلام اسحاق خان اور اے جی این قاضی پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی گئی تھی میں نے چار سال اس پروگرام کی مانیٹرنگ کی۔ شروع میں مجھے یقین نہیں تھا کہ پاکستان کا ایٹمی پروگرام کامیاب نہیں ہوگا لیکن ڈاکٹر قدیر خان کی عملی کوششوں اور جذبے کو دیکھ کر مجھے اپنی سوچ تبدیل کرنی پڑی کیونکہ ڈاکٹر قدیر خان نے اس پروگرام کو کامیاب بنا ڈالا تھا۔

منیر احمد خان اور ڈاکٹر قدیر کا شروع میں جھگڑا تھا۔ منیر احمد خان ڈاکٹر خان کو نکالنا چاہتے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر ڈاکٹر خان کو منیر احمد خان کے رحم و کرم پر رکھا گیا تو وہ چل نہ سکیں گے۔ لہذا میں نے بھٹو کو تجویز دی کہ ڈاکٹر قدیر خان کا پراجیکٹ الگ کر دیا جائے۔ بھٹو نے مان لیا اور اس طرح ڈاکٹر قدیر خان کو کامیابی مل گئی اور ایٹم بم بنانے کا سب سے زیادہ کریڈٹ بھی ان کو جاتا ہے۔ سیاستدانوں اور حکمرانوں میں سب سے زیادہ تعاون اور ٹھوس کردار جس شخص نے ادا کیا وہ بھٹو تھے۔ بھٹو کے اور میرے کئی اختلافات تھے کئی دفعہ میری سنیارٹی کو متاثر کیا گیا لیکن اس کے باوجود میں یہ کہوں گا بھٹو نے جو ایٹمی پروگرام دیا دوسرا کوئی شخص بھی یہ کام نہیں کر سکا۔ مجھے بھٹو کی بہت سی باتوں سے اختلاف ہے۔ لیکن نیوکلیئر پروگرام کو جس جرأت اور بہادری سے بھٹو نے چلایا اس کی داد دیئے بغیر چارہ نہیں ہے۔

اس کا اندازہ آپ یوں لگائیں کہ امریکہ نے ایٹمی پراجیکٹ کے حوالے سے جب پاکستان پر دباؤ ڈالا تو یہ بھٹو ہی تھے جنہوں نے امریکہ کو آنکھیں دکھائیں۔ لاہور میں کسنجر کے اعزاز میں ضیافت میں بھٹو نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ یہ پاکستان کا دل لاہور ہے جہاں پاکستان اپنے آپ کو ری پراسس (یعنی نئے سرے سے زندہ) کرتا ہے بعد میں کسنجر نے اپنی تقریر میں کہا کہ جناب وزیراعظم کچھ چیزوں کو ری پراسس کرنے کی ضرورت ہے اور کچھ چیزوں کے لئے بہتر ہوگا کہ انہیں ہاتھ نہ لگایا جائے۔ بعد میں کسنجر نے یہ بھی کہا کہ اگر امریکہ میں ڈیموکریٹک پارٹی کی حکومت آ گئی تو وہ آپ کو عبرتناک مثال بنا دیں گے پھر کسنجر نے یہ بھی کہا کہ ایٹمی پروگرام ختم کر دیا جائے تو امریکہ پاکستان کو اے 10 جہاز دے دے گا۔ اس پر بھٹو نے ایک میٹنگ بلائی۔ جس میں ایئر مارشل ذوالفقار علی خان اور میں بھی موجود تھا۔ بھٹو نے یہ ساری بات میٹنگ میں رکھی تو ایئر مارشل ذوالفقار علی خان نے کہا کہ اگر تو ایٹمی پروگرام کی قیمت پر اے 10 طیارے دیئے جا رہے ہیں تو میں اس سے دستبردار ہونا چاہتا ہوں۔

میں نے اس موقع پر بھٹو سے پوچھا کہ ایٹمی پروگرام کے حوالے سے امریکہ پاکستان پر بہت دباؤ ڈال رہا ہے ہم کس حد تک یہ دباؤ برداشت کریں گے۔

بھٹو نے کہا کہ ہم اس وقت تک یہ دباؤ برداشت کریں گے جب تک امریکہ ہمارے گھٹنے نہیں ٹیک دیتا تو میں اس حوالے سے بھٹو کی جرأت پر آفرین کہتا ہوں۔ اسی طرح جب افغانستان کا مسئلہ دنیا کے سامنے آیا تو امریکی ہمیں کہنے لگے آپ دنیا بھر میں ری پراسیسنگ پلانٹ کا شور مچاتے تھے لیکن دراصل آپ یورینیم کی افزودگی پر کام کر رہے تھے۔ دراصل میں نے اور بھٹو نے یہ طے کیا تھا کہ ری پراسیسنگ پلانٹ پر زور دیتے رہیں۔ حالانکہ اگر وہ ہمیں مل بھی جاتا تو اس کی اتنی انسپکشن ہوتی تھی کہ وہاں کچھ نہیں ہو سکتا تھا اس لئے ہم جان بوجھ کر ری پراسیسنگ پلانٹ کا شور مچاتے رہے لیکن اندر ہی اندر یورینیم کی افزودگی پر کام کرتے رہے۔ بہرحال 1977ء میں امریکہ جان گیا تھا کہ ہم یورینیم ہی افزودہ کر رہے ہیں۔ بھٹو کے بعد ضیاء الحق پر بھی دباؤ ڈالا گیا۔

امریکی سفیر نے ایک بار مجھے کہا کہ کہوٹہ بند کرو۔ میں نے امریکی سفیر سے کہا کہ بھٹو نے ایٹمی پروگرام کو ایک عوامی مسئلہ بنا ڈالا ہے اگر ضیاء الحق نے اس میں کوئی تبدیلی کی تو عوام میں شور مچ جائے گا کہ ضیاء الحق امریکہ سے ملا ہوا ہے اور اسی مقصد کے لئے اسے اقتدار میں لایا گیا ہے۔ میں نے امریکی سفیر کو کہا کہ ضیاء کی فوجی حکومت 3 یا 6 ماہ کے لئے آئی ہے یہ ملک کے اہم ترین اور بنیادی فیصلے کیسے کر سکتی ہے اور جب اگلی سیاسی حکومت آئے گی آپ اس سے یہ بات کریں اس طرح سے ہم نے یہ معاملہ ٹال دیا۔

منیر احمد خان قادیانی تھے؟

جنوری 1976ء میں ڈاکٹر خان مستقل طور پر پاکستان آ گئے تو انہیں پاکستان ایٹمی توانائی کمشن میں بطور مشیر تعینات کیا گیا۔ وہ انتہائی پرجوش اور متحرک سائنسدان تھے مگر ایٹمی توانائی کمشن کے چیئرمین منیر احمد خان کو ان سے ایک خاص پرخاش ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر خان نے ان کے رویہ سے تنگ آ کر واپس ہالینڈ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا اس زمانے میں یہ خبر نکلی کہ منیر احمد خان اور سلطان بشیر الدین محمود قادیانی ہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو نے 1974ء میں دو اہم کام کئے تھے۔ ایک تو ستمبر 1974ء کو قومی اسمبلی میں قادیانیوں کو اقلیت قرار دلایا تھا اور دوسرا کام ایٹم سازی کے لئے ڈاکٹر خان کا انتخاب کیا تھا۔ منیر احمد خان اور سلطان بشیر الدین محمود کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ چونکہ قادیانی ہیں اس لے پاکستان کو ایٹمی توانائی کے میدان میں ترقی کرتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتے۔ بھٹو نے اس بات کا سخت نوٹس لیا۔ مگر منیر احمد خان نے اپنے خلاف انکوائری کا عمل نہ ہونے دیا۔ اس دور میں آئی ایس آئی کے سربراہ جنرل جیلانی تھے۔ انہوں نے سلطان بشیر الدین محمود کا کیس آئی ایس آئی کے حوالے کر دیا۔ بھٹو قادیانیوں پر اعتبار نہیں کرتے تھے اور انہیں جس اعلیٰ افسر کے بارے میں بھی معلوم ہوتا اسے اہم ذمہ داری سے ہٹا دیتے تھے لہذا سلطان بشیر الدین محمود کو کہوٹہ پراجیکٹ سے الگ کر کے اپریل 1976ء میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو پراجیکٹ ڈائریکٹر بنا دیا گیا۔

سلطان بشیر الدین کے خلاف دو اڑھائی ماہ انکوائری رہی اور یہ ثابت ہوا کہ وہ قادیانی نہیں ہیں جبکہ منیر احمد خان کی حیثیت مشکوک ہی رہی۔ وہ اپنے بھائی اور بیوروکریسی میں اثر و رسوخ کی وجہ سے محفوظ رہے۔ 1998 میں ان کی وفات کے موقع پر اس وقت تنازعہ نے دوبارہ جنم لیا تھا جب ان کے جنازہ اور تدفین کا مسئلہ پیش آیا۔

منیر احمد خان بیوروکریسی کے آدمی تھے بقول ڈاکٹر خان جب وہ سینٹری فیوج سسٹم لے کر پاکستان آئے تو منیر احمد خان برملا کہتے تھے کہ یہ ناکام سسٹم ہے۔ سینٹری فیوج کے بارے میں منیر احمد خان کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ تمام عمر وہ خود کو ڈاکٹر کہلواتا رہا۔ حالانکہ وہ ڈاکٹر نہیں تھا۔ سلطان بشیر الدین محمود بھی خود کو ڈاکٹر کہلاتا رہا ہے۔ حالانکہ وہ صرف ایم ایس سی الیکٹریکل انجینئر ہے۔ یہ دونوں شخص فراڈ تھے۔ یہ ان جیسے لوگ ہی تھے جنہوں نے پاکستان کو ایٹمی توانائی کے میدان میں ترقی نہیں کرنے دی اور اپنی حکومتوں کو گمراہ کرتے رہے ہیں۔ ان لوگوں نے سائنسدانوں کو متنفر کیا اور نوجوان انجینئرز کو ملک چھوڑ کر جانے کے لئے مجبور کیا ہے۔ منیر احمد خان کی مخصوص لابی کل بھی متحرک تھی اور آج بھی متحرک ہے اور نہیں چاہتی کہ محب وطن انجینئرز اور سائنسدان یہاں ٹک کر کام کر سکیں۔ کیونکہ باکمال اور باصلاحیت سائنسدانوں کی موجودگی میں ان کی نوکریاں خطرے میں پڑ جاتی ہیں۔

قسط نمبر 20

عکسِ قدیر

ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے انتہائی قریبی ساتھی ڈاکٹر نذیر احمد (ستارہ امتیاز) ڈائریکٹر جنرل سائنٹیفک اینڈ ٹیکنیکل کوآپریشن ڈویژن کے۔آر۔ایل کی وہ باتیں جو ڈاکٹر خان کی شخصیت کو بے نقاب کرتی ہیں

قربتوں کے فسانے

ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے ترکش اور گدڑی میں ایسے بے شمار تیر اور لعل ہیں جن سے انہوں نے کے آر ایل کی تکمیل اور اس کے مقاصد کے لیے اسی طرح کام لیا جس طرح وہ خود کام کرنے کے عادی ہیں۔ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی شخصیت اور انکے کام کے طریقہ کار کو جاننے کے لئے مجھے ایک ایسے انسان کی تلاش تھی جو سایہ بن کر ان کے ساتھ رہتا ہو۔اس کتاب کے پہلے ایڈیشن پر جولائی 2001ء میں جب ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے مجھے شرف ملاقات بخشا اور لاہور میں کے آر ایل کے آفس میں بلایا تو وہاں دیگر ایٹمی سائنسدانوں سے بھی ملاقات ہوئی۔مگر ان میں ایک شخص ایسا تھا جس کے نقوش دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ اس شخص کو یقیناً ڈاکٹر خان کی رفاقت میسر ہے' کیونکہ اس کے چہرے پر ڈاکٹر خان کا عکس نظر آ رہا تھا۔معلوم ہوا کہ یہ وہی ڈاکٹر نذیر احمد ہیں جن کے بارے میں مشہور ہے کہ ڈاکٹر خان انہیں بے حد قریب رکھتے ہیں اور اکثر اندرون و بیرون ملک ڈاکٹر خان کے ہمراہی ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خان صاحب سے میری اس ملاقات میں بھی ڈاکٹر نذیر احمد ہمارے ساتھ تھے۔بعد میں جب ڈاکٹر عبدالقدیر خان صاحب نے مجھے اسلام آباد بلویا تو اسکے بعد ڈاکٹر نذیر احمد صاحب سے میری ملاقاتوں کا سلسلہ نکل آیا۔اسلام آباد کی کشادہ اور ٹھنڈی سڑکوں پر ڈاکٹر نذیر احمد کے ساتھ سفر کرنے کا لطف بھی اٹھایا اور اس دوران ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر ان کے ساتھ گفتگو بھی ہوتی رہی۔

ڈاکٹر نذیر احمد کے اجلے چہرے پر صداقت اور ایمانی قوت ثبت ہے۔کشادہ پیشانی اور آنکھیں علم و تحقیق کے نور سے روشن اور متجسس ہیں۔وہ ایسے گوہر نایاب ہیں جس کی قدر ڈاکٹر خان جیسا جوہری ہی کر سکتا تھا۔ڈاکٹر نذیر احمد کی بے پناہ خوبیوں کے ڈاکٹر خان بھی گرویدہ ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر نذیر احمد ڈاکٹر خان کے لبوں کی جنبش اور آنکھ کے اشارے سے ان کا حرف مدعا جان لیتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو اللہ پاک نے اپنے مقرب بندوں کی صف میں شامل کیا ہوا ہے ان کے چہرے کی تابانی اور روحانی تابندگی و جلالت کا یہ کمال ہے کہ ان کے حلقۂ سحر میں رہنے والے ان کے زیر اثر آ جاتے ہیں اور وہ بھی ان کے رنگ میں رنگے جاتے ہیں۔یعنی سچے پکے مسلمان اور پاکستانی بن کر اپنے فرائض ادا کرتے ہیں۔کسی قسم کا خوف ان پر غالب نہیں آتا۔ڈاکٹر نذیر احمد کو یہ شرف حاصل ہے کہ ان کے قول و فعل سے ڈاکٹر خان کا عکس جھلکتا ہے۔کئی پہروں کی اس گفتگو میں ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے ڈاکٹر خان کی شخصیت کے وہ راز افشا کئے ہیں جس سے دنیا آگاہ نہیں۔

ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے 1969ء میں یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی' لاہور سے میٹالرجی میں امتیازی حیثیت سے بی ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔1979ء میں یونیورسٹی آف برمنگھم' برطانیہ سے فزیکل میٹالرجی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد وہ امریکہ چلے گئے جہاں انہوں نے 4 سال تک ملازمت کی۔اس دوران پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے حوالے سے مغربی ممالک میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا بہت چرچا تھا۔لوگ ان کے بارے میں بہت باتیں کرتے تھے۔ڈاکٹر نذیر احمد کو ڈاکٹر خان کی پر اسرار شخصیت نے بے حد مرعوب کیا ان کی خواہش تھی کہ کاش تقدیر ان پر مہربان ہو اور وہ ڈاکٹر خان کے ساتھ ایٹمی محاذ پر کام کر سکیں۔اس وقت تو یہ بات ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ ایک دن انہیں ڈاکٹر عبدالقدیر خان صاحب کی قد آور شخصیت کے ساتھ کام کرنے کا موقع بھی ملے گا۔1983ء میں انہیں امریکہ میں ملازمت کے دوران KRL میں پرنسپل انجینئر کی آفر ہوئی۔وطن واپسی پر 26 ستمبر 1983ء کو انہوں نے کے آر ایل میں اپنی پیشہ وارانہ زندگی کا آغاز کیا۔ان 18 میں سے 13 سال تک وہ ڈاکٹر خان کے انتہائی قریب رہے۔ڈاکٹر نذیر احمد نے ڈاکٹر خان کے ساتھ اپنی 13 سالہ رفاقت کی یادیں تازہ کرتے ہوئے بتایا۔

حدیث نبوی ﷺ ہے کہ کسی شخص کو جاننے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے ہمراہ سفر کیا جائے کیونکہ سفر کی علتوں آزمائشوں اور دوران سفر حاصل ہونے والی چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے اس کی شخصیت کے تمام پہلو کھل کر سامنے آ جاتے ہیں۔میں نے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ اندرون و بیرون ملک بے شمار سفر کئے ہیں اور اس دوران ان کی شخصیت کے بے شمار پہلوؤں سے آگاہی حاصل کی ہے۔ان کے تمام رفقائے کار اور دوست احباب یقیناً مجھ سے اتفاق کریں گے کہ ڈاکٹر صاحب ایسے گوہر نایاب ہیں جن سے ہر لمحے ہم سب نے کچھ نہ کچھ سیکھا ہے۔شہرت یافتہ عالمی مبصرین کے خیال میں ڈاکٹر صاحب تضاد رکھنے والی خصوصیات کی مالک شخصیت ہیں جو ایک طرف تو وطن عزیز کے ایٹمی پروگرام کے بانی تصور کئے جاتے ہیں تو دوسری طرف درد دل رکھنے والی ایک ایسی انسان دوست شخصیت ہیں جو انسان کو ہی نہیں بلکہ پرندوں اور جانوروں کو تکلیف میں مبتلا دیکھ کر پریشان ہو جاتے ہیں' جو ایک طرف تو ملک کے دفاع میں استعمال ہونے والے سامان حرب کے خالق ہیں تو دوسری طرف ادب سے لگاؤ رکھتے ہیں۔وہ ایسے حب الوطن ہیں کہ جس نے اپنی زندگی کی اس طرح منصوبہ بندی کی ہے کہ آنے والا ہر لمحہ وطن عزیز کی خدمت کرتے ہوئے گزارا جائے۔وہ مضبوط اعصاب اور قوت ارادی رکھنے والے ایسے رہنما ہیں کہ جو ماہرانہ مشوروں سے اپنے ماتحتوں میں اعتماد کی وہ روح پھونک دیتے ہیں جو انہیں مشکل گھڑی میں جرأت عطا کرتی ہے۔وہ ایسے پیروکار ہیں کہ جو اپنے رہنماؤں کی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھتے ہیں۔ڈاکٹر صاحب کی جو خصوصیت انہیں دوسری شخصیات سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ اس بات کی نصیحت نہیں کرتے جس پر وہ خود عمل نہیں کرتے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی بات میں تاثیر ہوتی ہے۔

ویسے تو میں نے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ اندرون و بیرون ملک بے شمار سفر کیے ہیں لیکن سب سے پہلا سفر اس وقت کیا جب ہم ایک سیمینار میں شرکت کرنے کے لیے لاہور گئے تھے۔اس سیمینار کا انعقاد پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف میٹلرجیکل انجینئرز (PIME) نے کیا تھا۔جس کے صدر پروفیسر شجاع نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان صاحب کو سیمینار میں شرکت کی دعوت دی تھی۔میں ان دنوں میٹلرجی ڈویژن کہوٹہ میں پرنسپل انجینئر تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے مجھے اپنے آفس میں بلایا اور کہا "ڈاکٹر نذیر مجھے ایک سیمینار میں شرکت کیلئے پروفیسر سلیم شجاع نے لاہور بلایا ہے میں وہاں جانا چاہتا ہوں۔کیا آپ میرے ساتھ چل سکتے ہیں؟"

میں نے فوراً حامی بھرتے ہوئے کہا "میں آپ کے ساتھ ضرور چلوں گا"۔

یہ اگست 1988ء کی بات ہے جب ڈاکٹر صاحب پہلی مرتبہ UET لاہور گئے تھے۔اس سفر میں میرے علاوہ کرنل قاضی' بریگیڈیئر سجاول اور ڈاکٹر مظہر بھی ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ موجود تھے۔ہم لاہور پہنچے تو یونیورسٹی کو خوبصورتی سے سجایا گیا تھا' ڈاکٹر خان کو خوش آمدید کہنے کے لیے جگہ جگہ رنگا رنگ بینر لگے ہوئے تھے۔ایسا لگتا تھا کہ جیسے ڈاکٹر خان کا نام سن کر پورا لاہور وہاں پہنچ گیا ہے۔ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔سیمینار کا آغاز ہوا اور سلیم شجاع صاحب نے خطبہ استقبالیہ دیا۔اس کے بعد کچھ لوگوں کی تقاریر ہوئیں۔میرا بھی ایک لیکچر تھا۔آخر میں مہمان خصوصی ڈاکٹر صاحب کی تقریر ہوئی اور چائے کے بعد ڈاکٹر خان نے منتظمین اور شرکاء کے اصرار پر ان کے ہمراہ تصاویر بنوائیں۔سیمینار کے دوران ڈاکٹر سلیم شجاع نے ڈاکٹر صاحب سے کہا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب میری یہ خواہش ہے کہ میٹلرجی کے اس سیمینار کو جو ملکی سطح تک محدود ہے بین الاقوامی سطح پر کرایا جائے جس کے لیے ہمیں آپ کا تعاون درکار ہے"۔

ڈاکٹر صاحب نے ان کی بات کو تسلیم کرتے ہوئے کہا "ڈاکٹر نذیر میرے ساتھی ہیں اور میرے ساتھ کہوٹہ میں میٹلرجی میں ہوتے ہیں۔میں ان کو ہدایات جاری کر دوں گا کہ وہ آپ لوگوں کے ساتھ مل کر اگلے سال ستمبر 1989ء میں ایک بین الاقوامی سطح پر سیمینار منعقد کرانے کے انتظام کریں"۔

نہ جانے ڈاکٹر خان کو مجھ میں کیا خوبی نظر آئی کہ انہوں نے بھرے اجتماع میں مجھے اس اعزاز سے سرفراز کیا۔اسے میں اپنی خوش نصیبی ہی کہوں گا۔اسلام آباد واپسی پر ڈاکٹر صاحب نے مجھے اپنے دفتر بلایا اور وطن عزیز میں میٹالرجی پر پہلے بین الاقوامی سیمینار کے منعقد کرنے کے سلسلے میں نہایت ہی اہم اور ضروری ہدایات دیں اور کہا کہ آج ہی سے اس پر کام شروع کر دو۔یہ سفر میرے لیے اس لیے بھی یادگار تھا کہ اس سفر کے بعد ڈاکٹر صاحب کے ساتھ میرے مستقل تعلق کی ابتداء ہوئی۔

سیمینار کی تیاری کے لئے مجھے بار بار ڈاکٹر صاحب کے آفس جا کر ان سے راہنمائی لینا پڑتی تھی۔اس دوران مجھے ڈاکٹر خان کی شخصیت' ان کی پسند ناپسند اور خاص طور پر ان کے دفتری طریقہ کار کو سمجھنے کا موقع ملا جس سے میں بہت متاثر ہوا۔جب بھی میں کوئی فائل لے کر یا کسی کام کے سلسلے میں ان کے دفتر جاتا تو وہ فوراً ہاں یا نہ کی صورت میں فیصلہ کر دیتے۔

اللہ کے فضل و کرم سے ہم PIME کے ساتھ مل کر ستمبر 1989 میں پہلا بین الاقوامی سیمینار منعقد کرانے میں کامیاب ہو گئے۔میں سیمینار کا سیکریٹری تھا۔چونکہ KRL کے زیر اہتمام یہ پہلا بین الاقوامی سیمینار منعقد ہو رہا تھا اس لیے چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی خاص توجہ دی گئی۔بے شمار انتظامی کمیٹیاں تشکیل دی گئی تھیں تاکہ ایک فول پروف نیٹ ورک بنایا جا سکے۔اللہ کا شکر ہے ہم تمام لوگوں کی محنت سے سیمینار کامیاب ہوا۔خاص طور پر ڈاکٹر خان نے مجھ پر جو پہلی ذمہ داری سونپی تھی اسے میں نے بقول ڈاکٹر خان صاحب کے بڑی کامیابی سے نبھایا۔

سیمینار میں میری کارکردگی دیکھتے ہوئے ڈاکٹر خان نے مجھے ایک اور Assignment دی اور کہا "نذیر! اگر اس کام کے سلسلے میں آپ کو کہوٹہ میں وقت نہیں ملتا تو آپ پنڈی آفس آجائیں۔ میں آپ کو آفس دے دوں گا"۔
پنڈی آفس میں میرا قیام ایک یا دو ہفتوں کا تھا۔ جب کچھ وقت گزر گیا تو ڈاکٹر صاحب نے کہا "آپ میٹلرجی میں ریسرچ کو چھوڑ کر پنڈی آفس آجائیں میرے پاس اکیڈمک نوعیت کے بے شمار ٹیکنیکل کام ہوتے ہیں' میں چاہتا ہوں کہ ہیڈ آفس میں کوئی ٹیکنیکل اور تجربہ کار شخص ہو جو میری مدد کر سکے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ یہ کام بڑے اچھے طریقے سے کر سکیں گے"۔
اس طرح میں 1990ء کے آغاز میں مستقل طور پر پنڈی آفس منتقل ہو گیا۔
کچھ عرصہ بعد مجھے ڈپٹی ڈائریکٹر ہیڈ کوارٹر بنا دیا گیا۔ مجھے روزانہ مختلف کاموں کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب سے راہنمائی لینی اور فائلیں دکھانی اور ہدایات لینی ہوتی تھیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں ڈاکٹر صاحب کے مزاج کو سمجھتا گیا اور ڈاکٹر صاحب کے ساتھ میری کوآرڈینیشن ایسی بن گئی کہ وہ کسی بھی کام کے لیے صرف مجھے اشارتاً بتا دیتے تھے اور میں سمجھ جاتا تھا کہ اسے کس طرح کرنا ہے۔
ان دنوں ڈاکٹر صاحب جی آئی کے انسٹی ٹیوٹ کی پلاننگ کر رہے تھے اور ابھی اس کی تعمیر شروع ہونا تھی۔ اس ضمن میں لیبارٹریز بنوانا تھیں' فیکلٹی کو ہائیر کرنا تھا اور سلیبس وغیرہ تیار کرنا تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے فل ٹائم اس کام پر لگا دیا۔ ان کاموں کے سلسلے میں مجھے ڈاکٹر صاحب کے مزید قریب آنے کا موقع ملا۔ چونکہ ان تمام پراجیکٹ کی معلومات میرے پاس تھی اس لیے بعد ازاں جب کبھی ڈاکٹر صاحب مختلف قسم کے تعلیمی اور سائنسی منصوبوں کے سلسلے میں سفر پر جاتے تو مجھے بھی اپنے ہمراہ لے جاتے۔
1988ء کے بعد ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ میرا دوسرا سفر کوئٹہ کی جانب تھا۔ جہاں کمانڈنٹ سٹاف کالج کوئٹہ نے ڈاکٹر صاحب کو لیکچر کے لئے بلایا تھا۔ یہ نومبر 1990ء کی بات ہے۔ اس سفر کے بعد تو ڈاکٹر صاحب وطن عزیز میں جہاں کہیں بھی تشریف لے جاتے' چاہے وہ لیکچر ہوتا یا کوئی افتتاحی تقریب' آڈیٹوریم کا افتتاح ہوتا یا کوئی اور تقریب ہوتی غرضیکہ وہ جہاں کہیں بھی جاتے میں ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ اس دوران میں نے ان کے ہمراہ ملتان' بہاولپور' لاہور' پشاور' کاکول اور ڈیرہ اسماعیل خان کا بھی سفر کیا۔ ان سفروں کی بدولت ڈاکٹر صاحب کی عظمت کے مجھ پر بھید منکشف ہوتے رہے اور مجھے یقین کرنا پڑا کہ ڈاکٹر صاحب اس صدی کی عظیم شخصیت اور مکمل انسان ہیں۔ دوران سفر مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ ڈاکٹر صاحب سب کیساتھ شفقت سے پیش آتے ہیں اور اپنے ساتھ کام کرنے والے جونیئر افسروں اور سٹاف کا بہت خیال رکھتے ہیں۔
مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جن دنوں جی آئی کے انسٹی ٹیوٹ زیر تعمیر تھا تو ہمیں اکثر ٹوپی جانا ہوتا تھا راستے میں تربیلا روڈ پر ڈاکٹر صاحب اکثر چائے کے لیے رک جاتے تھے۔ میں سوچتا کہ ڈاکٹر صاحب اکثر چائے کے لئے یہاں کیوں رک جاتے ہیں؟ جہاں ہم چائے کے لیے رکتے وہ جگہ اسلام آباد سے سوا گھنٹہ کے فاصلہ پر تھی۔
ایک بار میں نے ڈاکٹر صاحب سے بار بار سٹاپ کرنے کا سبب دریافت کیا تو بولے:
"نذیر! میں اپنے لئے نہیں رکتا۔ مجھے اس غریب ڈرائیور کا خیال ہے تم جانتے ہو کہ ڈرائیونگ بڑا توجہ طلب کام ہے جس کی وجہ سے ڈرائیور پر بڑا ذہنی تناؤ ہوتا ہے اس لیے ڈرائیور کو ہر گھنٹے ڈیڑھ بعد ضرور بریک ملنی چاہیے"۔
ڈاکٹر صاحب کا یہ اصول ہے کہ وہ جب کبھی تین چار گھنٹے کی ڈرائیو پر ہوتے ہیں تو وہ ہر ڈیڑھ گھنٹے بعد راستے میں ضرور کسی جگہ قیام کرتے ہیں تاکہ ڈرائیور اس دوران چائے سگریٹ اور باتھ روم وغیرہ سے فارغ ہو کر تازہ دم ہو جائے اور پھر زیادہ توجہ اور سکون سے گاڑی ڈرائیو کر سکیں۔
ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کراچی جانے کا کئی دفعہ موقع ملا۔ اکثر میں اور انجینئر محمد فاروق بھی ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ ہوتے تھے۔ انجینئر فاروق آج کل کے آر ایل میں فارن پروکیورمنٹ میں ڈائریکٹر جنرل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب فرسٹ کلاس میں سفر کرتے تھے جبکہ ہم لوگ اکانومی میں ہوتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ عادت تھی کہ وہ اکثر ہماری خیریت معلوم کرنے کے لیے فرسٹ کلاس سے اٹھ کر اکانومی میں تشریف لاتے اور مجھے اور فاروق سے کہتے:
"بور تو نہیں ہو رہے' چائے وغیرہ پی ہے یا نہیں"۔
دراصل وہ ہمیں یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے تھے کہ میں آپ کا کولیگ ہوں۔ بیشک میں فرسٹ کلاس میں سفر کر رہا ہوں لیکن آپ کے ساتھ ہی سفر کر رہا ہوں۔ کراچی کے دو گھنٹے کے سفر کے دوران وہ کم از کم ایک دفعہ ضرور ہمارا حال معلوم کرنے آتے۔ غرضیکہ ہر سفر میں جہاں بھی میں ان کے ساتھ گیا ہوں میں نے ان کو اپنے جونیئر افسروں اور ڈرائیور وغیرہ کی ضروریات کا خیال کرتے ہوئے ہی پایا ہے۔
ڈاکٹر صاحب بہت رحم دل اور شفیق انسان ہیں۔ کوئی آدمی اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ پاکستان کے ایٹمی پروگرام اور ایٹم بم کا خالق اتنا رحم دل ہو سکتا ہے۔ خاص طور پر وہ جانوروں اور پرندوں سے بہت زیادہ لگاؤ رکھتے ہیں۔ ان کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ ان بے زبان جانوروں اور پرندوں کو کم از کم ان سے کوئی گزند نہ پہنچے۔ ان کے اپنے گھر میں بھی ایک خوبصورت چڑیا گھر موجود ہے جس کی وہ خود دیکھ بھال کرتے ہیں۔ روزانہ صبح سویرے مارگلہ کی پہاڑیوں سے بندروں کے غول ڈاکٹر صاحب کے گھر کے سامنے جمع ہو جاتے ہیں جنہیں ڈاکٹر صاحب بلاناغہ چاہے گرمی ہو یا سردی بارش ہو یا طوفان پھل فروٹ اور مونگ پھلی وغیرہ کھلاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب انسان تو کیا جانوروں اور پرندوں کو بھی تکلیف میں دیکھ کر پریشان ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ ایک دفعہ ڈاکٹر صاحب نے پانی کے تالاب میں ایک بھڑ کو تیرتے ہوئے دیکھا جو تالاب کے پانی سے باہر نکلنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ ڈاکٹر خان نے بھڑ کو مشکل میں دیکھا تو ان سے رہا نہیں گیا۔ انہوں نے فوراً ایک لکڑی کی چھڑی اٹھائی اور غریب بھڑ کو پانی سے نکال کر اسے خشکی میں رکھ دیا تاکہ دھوپ میں اس کے گیلے پر سوکھ جائیں۔ اس موقع پر موجود ہمارے ایک دوست نے یہ سوچتے ہوئے اس کے اوپر اپنا بھاری پاؤں رکھ کر کچل دیا کہ کہیں یہ ڈاکٹر صاحب کو نقصان نہ پہنچائے۔ آپ سوچ نہیں سکتے کہ اس کے بعد کیا ہوا کیونکہ یہ ان چند مواقعوں میں سے ایک تھا کہ جب میں نے انہیں اپنے کسی ساتھی پر سخت ناراضگی اور خفگی کا اظہار کرتے دیکھا۔
نومبر 1990ء میں ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ مجھے بہاولپور جانے کا اتفاق ہوا۔ اس سفر میں بریگیڈیئر سجاول اور کرنل قاضی بھی ساتھ تھے۔ بہاولپور میں ہمیں کنال ریسٹ ہاؤس ٹھہرایا گیا وہاں کے اسسٹنٹ کمشنر نے ڈاکٹر صاحب کی بڑی خدمت کی۔ انہوں نے اس بات کا بھی اہتمام کیا ہوا تھا کہ جو کھانا ڈاکٹر صاحب کو دیا جائے اسے پہلے چیک کیا جائے تاکہ کہیں کسی نے زہر تو نہیں ملا دیا۔ اس کام کے لئے لوگوں کی ڈیوٹیاں لگائی گئی تھیں۔ ایک دن گیسٹ ہاؤس میں ڈپٹی کمشنر صاحب تشریف لائے اور ڈاکٹر صاحب کو اگلی صبح ناشتے کی دعوت دی' جسے ڈاکٹر صاحب نے قبول کر لیا۔ ڈپٹی کمشنر صاحب جو شکار کے بہت شوقین تھے یہ بات نہیں جانتے تھے کہ ڈاکٹر خان پرندوں اور جانوروں کے شکار کے سخت خلاف ہیں۔ انہوں نے ناشتے کی میز پر خوب شکار کے واقعات سنائے۔ انہوں نے بتایا کہ کس طرح شکار کیے ہوئے پرندوں کا گوشت ڈیپ فریزر میں محفوظ کر لیا جاتا ہے اور جب کوئی وی وی آئی پی شخصیت یہاں تشریف لاتی ہے تو وہ اسے پیش کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب یہ باتیں سن کر آبدیدہ ہو گئے۔ جب ناشتہ کی میز پر شکار کیے ہوئے بھنے ہوئے تیتر رکھے گئے تو ڈاکٹر صاحب نے دیکھتے ہی کہا
"نہیں یار میں تو بریڈ ٹوسٹ اور چائے لے لوں گا کیونکہ شکار کئے ہوئے پرندوں کا گوشت مجھ سے نہیں کھایا جاتا"۔ ڈپٹی کمشنر ڈاکٹر صاحب کا جواب سن حیران بھی ہوئے اور متاثر بھی۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ ایسا شخص جو اس کرہ ارض کے سب سے زیادہ مہلک ہتھیار یعنی ایٹم بم کا خالق ہے اتنا نرم اور رحم دل کیسے ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب پرندوں اور جانوروں کے شکار کو سخت ناپسند کرتے ہیں اس لیے جب کبھی بھی کوئی شخص ان کے سامنے شکار کی بات کرتا ہے تو ڈاکٹر صاحب کو یہ بات سخت ناگوار گزرتی ہے۔ اس طرح کے بے شمار واقعات ایسے ہیں جن سے ہمیں ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کا پتہ چلتا ہے کہ وہ کتنے نرم دل اور شفیق انسان ہیں۔
ڈاکٹر صاحب بلا کے ذہین ہیں۔ ان کی یادداشت اتنی تیز ہے کہ جس سے ایک دفعہ ملاقات کر لیتے ہیں اسے کبھی نہیں بھولتے بلکہ اسے بہت عزت بھی دیتے ہیں۔ اکثر اوقات جب وہ بھرے مجمع میں کسی کو پہچان لیتے ہیں تو وہ حیران ہوئے بغیر نہیں رہتا۔
بہاولپور سے ہمیں ملتان پہنچنا تھا جہاں ڈاکٹر صاحب نے بہاؤالدین یونیورسٹی کی ایک تقریب میں اور رات کو ملتان کے میئر صلاح الدین ڈوگر صاحب کے استقبالیے میں شرکت کرنا تھی۔ ہم جب ملتان پہنچے تو دیکھا تمام راستے ڈاکٹر صاحب کو خوش آمدید کہنے کے لیے بے شمار بینر لگے ہوئے ہیں۔ دونوں تقاریب بہت دلچسپ رہیں۔ خاص طور پر میئر صاحب نے ایک بہت بڑا مجمع اکٹھا کیا ہوا تھا بلکہ یوں کہیے انہوں نے پورا ملتان اکٹھا کیا ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو بھی تقریر کرنا تھی۔ تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کی نظر اگلی قطار میں بیٹھے ہوئے کسٹم کے حسین شیرازی صاحب پر پڑی جو ایک زمانہ میں اسلام آباد ایئر پورٹ پر تعینات تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے فوراً کہا کہ شیرازی صاحب جو میرے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں جب یہ اسلام آباد میں تھے تو انہوں نے ہماری بہت زیادہ مدد کی تھی کہوٹہ پراجیکٹ کا جو بھی سامان آتا اسے فوراً ہمارے حوالے کر دیا کرتے تھے۔ شیرازی صاحب بہت اچھے آدمی ہیں" اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے شیرازی صاحب کی بہت تعریف کی۔
تقریب کے اختتام پر جب میں شیرازی صاحب سے ملا تو وہ کہنے لگے کہ ڈاکٹر صاحب بہت عظیم انسان ہیں۔ آج سے پانچ یا چھ سال قبل میں جب اسلام آباد ایئر پورٹ پر تعینات تھا تو حکومت کی جانب سے اس ضمن میں ہمیں خاص ہدایات جاری کی گئی تھیں جس پر ہمیں ہر صورت میں عملدرآمد کرنا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں نے آپ کے اوپر کوئی احسان نہیں کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اتنے عظیم انسان ہیں کہ انہوں نے کہوٹہ پراجیکٹ میں میرا

Contribution آج تک یاد رکھا ہوا ہے۔ یہ واقعی ڈاکٹر صاحب کی فوٹو گرافک میموری تھی کہ جس آدمی سے بھی ایک دفعہ ملاقات کی اس آدمی کو کبھی نہیں بھولے۔

ڈاکٹر صاحب دوسروں کی مدد کر کے بہت خوش ہوتے ہیں اگر یہ کہا جائے کہ وہ عہد حاضر کے حاتم طائی ہیں تو غلط نہیں ہوگا۔ ایسا شاید ہی کوئی اتفاق ہوا ہو کہ کوئی ضرورت مند ڈاکٹر صاحب کے پاس آیا ہو اور اپنی ضرورت پوری کیے بغیر واپس گیا ہو۔ ڈاکٹر صاحب کو روزانہ موصول ہونے والی ڈاک میں زیادہ تر خطوط ایسے افراد کے ہوتے ہیں جو کسی نہ کسی طور ڈاکٹر صاحب کی مدد یا مالی اعانت کے طلبگار رہوتے ہیں۔ خاص طور پر تعلیمی شعبے میں تو وہ ہر قسم کی مدد کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ایسا ہی ایک واقعہ مجھے یاد ہے کہ ایڈمرل سروہی صاحب جب نیوی سے ریٹائرڈ ہوئے تو انہوں نے بہاولپور میں ہائی ٹیکنالوجی کا ایک انسٹیٹیوٹ قائم کرنے کا پروگرام بنایا۔ اس ضمن میں وہ ڈاکٹر صاحب کی مدد کے خواہاں تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے انہیں یقین دلایا تھا کہ اس نیک کام میں وہ ضرور ان کی مدد کریں گے اور جب چاہیں گے اور جہاں چاہیں گے وہ ان کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہیں۔

یہ دسمبر 1992ء کی بات ہے کہ ایک دن ایڈمرل سروہی صاحب کا ٹیلی فون آیا "ڈاکٹر صاحب میں انسٹی ٹیوٹ کے سلسلے میں وزیر اعلیٰ پنجاب غلام حیدر وائیں کو ملنے لاہور جا رہا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی میرے ساتھ چلیں"۔

ڈاکٹر صاحب نے بنا کسی تامل کے فوراً حامی بھر لی۔ چنانچہ جب ہم وزیر اعلیٰ پنجاب کے دفتر پہنچے تو سیکیورٹی پر موجود دیگر افراد نے ڈاکٹر صاحب کا خوش دلی سے استقبال کیا۔ ہر آدمی ڈاکٹر صاحب سے ملنے کا خواہشمند تھا اور ان سے بات کرنے کے لئے بے تاب تھا۔ ہمیں ایک کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد شلوار قمیض میں ملبوس وزیر اعلیٰ پنجاب غلام حیدر وائیں تشریف لائے۔ اس وقت ان کے ہمراہ کئی دوسرے افراد بھی تھے۔ جن میں چیف پلاننگ اینڈ ڈویلپمنٹ اینڈ فنانس کے سیکریٹری ڈاکٹر محمد عارف بھی تھے۔ ایک دوسرے کی خیریت دریافت کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے کہا

"وائیں صاحب ہم آپ کے پاس ایک اہم کام کے سلسلے میں آئے ہیں امید ہے کہ آپ ہمیں مایوس نہیں کریں گے"۔ ڈاکٹر صاحب نے بات کو مزید بڑھاتے ہوئے کہا "ایڈمرل سروہی صاحب بہاولپور میں ہائی ٹیکنالوجی کا انسٹی ٹیوٹ قائم کرنا چاہتے ہیں آپ ان کی مدد کریں"۔

وائیں صاحب نے فوراً جواب دیا "ڈاکٹر صاحب جو آپ کہیں گے میں دینے کو تیار ہوں"۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا "انسٹی ٹیوٹ کے لیے ہمیں تقریباً دو ہزار ایکڑ زمین اور ایک کروڑ روپے چاہئیں تا کہ تعمیراتی کام کا آغاز کیا جا سکے"۔ وائیں صاحب نے فرمایا "ڈاکٹر صاحب آپ نے کہہ دیا ہے تو سمجھیں کہ یہ کام بھی ہو گیا ہے"۔

ایڈمرل سروہی صاحب نے بہاولپور میں انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانس ٹیکنالوجی قائم کرنے کے اغراض و مقاصد بیان کیے اور درخواست کی کہ اس مقصد کے لیے انہیں زرعی زمین نہیں چاہیئے۔

وائیں صاحب نے ایڈمرل سروہی صاحب کی بات کو سمجھتے ہوئے بہاولپور شہر کی حدود سے باہر دو ہزار ایکڑ زمین الاٹ کرنے کے اسی وقت آرڈر جاری کیے اور ڈاکٹر صاحب کے کہنے پر ایک کروڑ روپے امداد کی بھی منظوری دے دی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں بہت تیزی سے ہوئیں فنڈ بھی فوری مل گیا اور جگہ بھی مل گئی۔

ڈاکٹر صاحب ایک ایسے پکے مذہبی اور دین دار شخص ہیں جو موت سے نہیں ڈرتے۔ وہ اس بات پر پختہ یقین رکھتے ہیں کہ موت کا ایک دن معین ہے جو کبھی ٹل نہیں سکتا۔ اس ضمن میں مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آ رہا ہے۔

نومبر 1995ء میں پشاور ایئر ہیڈ کوارٹر کے بیس کمانڈر AVM مشتاق لغاری صاحب نے ڈاکٹر صاحب کو لیکچر دینے کے لئے پشاور بلایا تھا (مشتاق لغاری ریٹائرمنٹ کے بعد یو اے ای کے سفیر بھی رہے ہیں)۔ پشاور جانے سے تین چار دن پہلے پشاور ایئر فورس والوں کا فون آیا۔ وہ یہ پوچھنا چاہ رہے تھے کہ ڈاکٹر صاحب پشاور کیسے آئیں گے تو ڈاکٹر صاحب کے سٹاف افسر نے کہا کہ سڑک کے راستے آئیں گے۔ انہوں نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب بائی روڈ نہ آئیں بلکہ ہم ان کے لئے جہاز بھیجیں گے۔ چنانچہ مقررہ تاریخ کو چکلالہ ایئر بیس پر سنگل انجن سیسنا جہاز ہمارا منتظر تھا۔ سیسنا ایک چھوٹا جہاز ہوتا ہے اس میں ایک پائلٹ اور ایک معاون پائلٹ اور 2 لوگوں کے بیٹھنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ ہم دونوں پشاور خیریت سے پہنچ گئے۔ لیکچر ختم ہونے کے بعد انہوں نے چائے وغیرہ کا انتظام کر رکھا تھا۔ چائے کے دوران لغاری صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا

"آپ پشاور کیسے تشریف لائے ہیں"

ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا "ایئر فورس والوں نے ہمارا بہت خیال رکھا ہے۔ انہوں نے چکلالہ ایئر بیس پر سیسنا جہاز ہمارے لئے بھیجا تھا۔ میں اور ڈاکٹر نذیر اس میں بیٹھ کر آئے ہیں"۔

یہ سن کر لغاری صاحب نے اپنے سٹاف پر سخت برہمی کا اظہار کیا۔ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو بتایا:

"ڈاکٹر صاحب آپ وی وی آئی پی شخصیت ہیں آپ کو لینے کے لیے سیسنا جہاز نہیں بھیجنا چاہیے تھے کیونکہ یہ ایس او پی کے خلاف ہے۔ سیسنا جہاز میں سنگل انجن ہوتا ہے۔ اس لیے یہ جہاز وی آئی پی شخصیات کے لیے نہیں استعمال کیا جاتا۔ آپ خیر خیریت سے تشریف لا چکے ہیں اس لیے اب ہم دوبارہ وہ غلطی نہیں دوہرائیں گے"۔

اس موقع پر ڈاکٹر صاحب نے مسکرا کر کہا "نہیں لغاری صاحب ایسی کوئی بات نہیں۔ موت تو برحق ہے اس کا وقت معین ہے جو کبھی ٹل نہیں سکتا"۔

لغاری صاحب نے جواب دیا

"جناب آپ کو تو کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو میری وردی اتر جائے گی اور میری نوکری ختم ہو جائے گی کیوں کہ آپ میرے علاقہ میں ہیں، میں اب آپ کو اجازت نہیں دے سکتا کہ آپ سنگل انجن جہاز میں واپس جائیں"۔

یہ کوئی تین ساڑھے تین بجے کا وقت تھا۔ لغاری صاحب کے سٹاف نے ٹیلی فون وغیرہ کرنے شروع کر دیئے تا کہ متبادل جہاز کا اہتمام کیا جا سکے۔ آدھ گھنٹے یا پندرہ منٹ کے بعد بذریعہ فون ایئر فورس کے دستیاب جہازوں کے بارے میں معلومات آنا شروع ہو گئیں۔ لغاری صاحب کا سٹاف ایک طرف تو ٹیلی فون کر رہا تھا اور دوسری طرف ڈاکٹر صاحب کو تسلی دے رہا تھا کہ آرام کریں، انشا اللہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے گا ہم جہاز کا بندوبست کر کے آپ کو واپس اسلام آباد بھجوا دیں گے۔

تقریباً ایک گھنٹہ گزرنے تک جہاز نہیں آیا، دو گھنٹے گزر گئے جہاز نہیں آیا تو ڈاکٹر صاحب نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا

"لغاری صاحب اب میں مزید انتظار نہیں کر سکتا مجھے پتہ ہے کہ میں وقت سے پہلے نہیں مر سکتا چاہے آپ چار انجن والا جہاز لے آئیں یا دو انجن والا۔ اب مجھے اسی ایک انجن والے جہاز پر جانا ہے"۔

ڈاکٹر صاحب کا اللہ تعالیٰ پر یقین کامل دیکھ کر وہ لوگ بہت متاثر ہوئے۔ ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو کہتا کہ نہیں یار اس جہاز کا ایک ہی انجن ہے اگر وہ فیل ہو گیا تو جہاز تباہ ہو جائے گا۔ یہ وہ باتیں ہیں جن سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ میرا مشاہدہ ہے کہ جوں جوں آپ کسی شخصیت کے قریب ہوتے جاتے ہیں اس کے عیب کھلتے جاتے ہیں لیکن یہ معاملہ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ نہیں ہے میں جوں جوں ڈاکٹر صاحب کے قریب ہوتا گیا ان کی شخصیت کے بے شمار پہلو کھل کر میرے سامنے آئے اور وہ مجھے پہلے سے بھی زیادہ معتبر نظر آئے۔

ڈاکٹر صاحب کی کامیابی کا ایک اہم راز وقت کی قدر دانی میں مضمر ہے کہ وہ وقت کے بہت پابند ہیں۔ ان کا ایک ٹائم ٹیبل ہے جس پر وہ سختی سے عمل کرتے ہیں۔ ان کی شخصیت کو دیکھ کر اس قول کو صدق دل سے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ بڑا آدمی وہ ہوتا ہے جو وقت کی قدر کرتا ہے اور ہمیشہ وقت سے آگے چلتا ہے۔ ان کی تمام تر کامیابیاں اس حقیقت کا منہ بولتا ثبوت ہیں کہ انہوں نے کبھی وقت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ انہوں نے بر وقت صحیح فیصلے کیے جس کے نتائج آپ کے سامنے ہیں کہ آج پاکستان دفاعی اعتبار سے خود کفیل ہے اور دنیا کی ساتویں ایٹمی قوت تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے کہ غوری کے کامیاب تجربے اور ایٹمی دھماکوں کے بعد 1999ء میں کراچی والوں نے ڈاکٹر صاحب کے اعزاز میں ایک بہت بڑی تقریب کا اہتمام کیا جس میں ڈاکٹر صاحب کو ان کی لازوال خدمات کے نتیجے میں گولڈ میڈل سے نوازا جانا تھا۔ تقریب کے مہمان خصوصی سندھ کے گورنر جناب لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) معین الدین حیدر تھے۔

یہ تقریب میریٹ میں منعقد ہونا تھی۔ 8 بجے کا ٹائم دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ میں اور ہمارے کچھ ساتھی اس تقریب میں شرکت کرنے کے لیے کراچی پہنچ چکے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو جو وقت دیا گیا تھا اس کے مطابق ہم ہوٹل پہنچ گئے۔ ہوٹل پہنچنے پر معلوم ہوا کہ مہمان خصوصی جناب معین الدین حیدر صاحب ابھی تک نہیں پہنچ سکے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اور ہم سب ہال میں بیٹھ گئے۔ گورنر لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) معین الدین حیدر صاحب تقریباً ساڑھے آٹھ بجے ہوٹل پہنچے تو ان کے آنے کی اطلاع ملنے پر ڈاکٹر صاحب انکا استقبال کرنے کے لیے ہوٹل کے دروازے پر پہنچے، انہیں خوش آمدید کہا۔

ڈاکٹر صاحب کو دیکھتے ہی معین الدین حیدر صاحب قدر حیرانی سے بولے "ڈاکٹر صاحب آپ یہاں پر موجود ہیں"۔

ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا "میں تو ٹھیک آٹھ بجے یہاں پہنچ گیا تھا"۔

معین الدین حیدر صاحب جو دیر سے آنے پر کچھ شرمندہ دکھائی دے رہے تھے بولے "دراصل میرا یہ پروگرام تھا کہ میں آپ کا استقبال کروں۔ آپ قوم کے ہیرو ہیں اور ویسے بھی آپ یہاں مہمان ہیں اور میرے شہر تشریف لائے ہیں اس لیے میرا یہ فرض بنتا تھا کہ میں آپ کا استقبال کروں"۔ گورنر صاحب اپنے سٹاف پر کافی برہم دکھائی

دیتے تھے۔ کیونکہ وہ ڈاکٹر صاحب کا استقبال کرنے کے لیے ان سے پہلے ہوٹل پہنچنا چاہتے تھے اور اس ضمن میں وہ اپنے سٹاف کو یہ ہدایات جاری کر چکے تھے کہ جیسے ہی ڈاکٹر صاحب ہوٹل کے لیے روانہ ہوں تو انہیں فوراً اطلاع کر دی جائے۔ گورنر صاحب نے بتایا کہ وہ پونے آٹھ بجے سے تیار تھے اور اپنے سٹاف کے فون کا انتظار کر رہے تھے لیکن انہیں ہر بار پوچھنے پر یہی اطلاع دی گئی کہ ابھی ڈاکٹر صاحب گھر سے نہیں چلے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا ''کوئی بات نہیں' میں تو بڑا پنکچوئل آدمی ہوں مجھے جو وقت دیا جاتا ہے میں اس پر پہنچ جاتا ہوں اور مجھے کوئی پرواہ نہیں ہوتی کہ کون کس وقت آ رہا ہے''۔ ڈاکٹر صاحب نے انہیں بتایا۔

''بعض اوقات اپنی اس عادت کی وجہ سے مجھے بڑی عجیب صورتحال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میں نے تو کئی مرتبہ ایسی تقاریب میں بھی شرکت کی ہے کہ جہاں آرگنائزر سے پہلے ہال میں' میں خود پہنچ گیا''۔

ڈاکٹر صاحب کو ایئرپورٹ جانا ہو یا کسی فنکشن پر' وقت پر ان کی ہمیشہ کڑی نظر ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی اس عادت کے پیش نظر منتظمین بھی ڈاکٹر صاحب کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ تقریب میں آدھا گھنٹہ لیٹ آیا کریں تاکہ ان کے آنے تک پورا مجمع اپنی سیٹوں پر بیٹھ جائے۔ مگر ڈاکٹر صاحب ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ کارڈ پر جو وقت دیا ہوا ہے اسی پر جائیں گے چاہے لوگ آئیں یا نہ آئیں۔ وہ اکثر یہ کہا کرتے ہیں کہ یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم وقت پر پہنچ کر عوام کو وقت کی اہمیت کا احساس دلائیں۔

ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ بیرونی ممالک جانے کے بھی بہت سے مواقع میسر آئے۔ ان دوروں کے دوران میں نے یہ محسوس کیا کہ جس طرح وطن عزیز میں ڈاکٹر صاحب کو عزت و توقیر ملتی ہے اسی طرح ملک سے باہر بھی خاص طور پر اسلامی برادر ممالک کے عوام بھی ڈاکٹر صاحب کو بہت چاہتے ہیں اور ان کے بہت عقیدت مند ہیں۔ ان دوروں کے دوران میں ڈاکٹر صاحب سے لوگوں کی والہانہ محبت کے کئی ایسے جذباتی مناظر کا بھی عینی شاہد ہوں کہ جنہیں الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کے لیے لوگوں کی آنکھوں میں ایک خاص چمک دیکھی ہے ان کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے عقیدت کے جگمگ کرتے روشن موتی دیکھے ہیں۔ عقیدت سے ان کے ہاتھوں کو چومتے دیکھا ہے انہیں دعائیں دیتے ہوئے دیکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر خان کے علاوہ اگر یہ چاہت اور خلوص کسی اور شخص کے لیے ہوتا تو وہ یقیناً خود کو دیوتا سمجھنے لگتا لیکن ڈاکٹر صاحب میں ایسی بات نہیں وہ درویش انسان ہیں۔ لوگ ان سے جتنی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں ان میں انکساری اور عاجزی بڑھتی جاتی ہے۔

عکسِ قدیر ڈاکٹر نذیر احمد

میں نے پہلی بار جون 1994ء میں ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ کسی بیرون ملک کا سفر کیا تھا۔ یہ ستمبر 1993ء کی بات ہے جب جی آئی کے انسٹی ٹیوٹ کا افتتاح ہو چکا تو سوپرسٹ (Sopresst) کے صدر غلام اسحاق خان نے جو پاکستان کے صدر بھی رہ چکے ہیں ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ انسٹی ٹیوٹ تو آپ نے بنا دیا ہے لیکن اس کو چلانا بھی آپ ہی نے ہے جس کے لئے یقیناً آپ کو طالب علم چاہیے ہوں گے اور پیسے بھی' آپ سے میری گذارش ہے کہ آپ مڈل ایسٹ کے ممالک میں جی آئی کے انسٹی ٹیوٹ کو متعارف کروائیں۔ کیونکہ مڈل ایسٹ میں رہنے والے ہمارے پاکستانی بھائی زیادہ تر اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے یورپی ممالک' انگلستان اور امریکہ وغیرہ بھیجتے ہیں۔ آپ انہیں بتائیں کہ اب ان کے اپنے ملک میں ایک بین الاقوامی معیار کا تعلیمی ادارہ قائم ہو چکا ہے۔ اگر اس تعلیمی ادارے میں وہ اپنے بچوں کو تعلیم کے لیے بھیجیں گے تو انہیں بے شمار فائدے ہونگے' ایک تو ان کی بچت ہوگی دوسرا وہ اپنے کلچر میں رہیں گے' یورپی کلچر سے بچے رہیں گے اور تعلیم بھی سستی اور اعلیٰ معیار کی ہوگی۔ اسی طرح وہ پاکستان میں مقیم اپنے عزیز و اقارب کو بھی مل سکیں گے۔ اس زمانے میں امریکہ اور یورپ میں ٹیوشن فیس پندرہ سولہ ہزار ڈالر سالانہ سے کم نہ تھی۔ اس کے مقابلے میں جی آئی کے انسٹی ٹیوٹ میں ہم ان سے صرف تین سے چار ہزار ڈالر سالانہ ٹیوشن فیس لیں گے۔ چنانچہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے غلام اسحاق خان صاحب کے کہنے پر مڈل ایسٹ کے ٹور کا پروگرام بنایا۔ خوش قسمتی سے میں بھی اس ٹور میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ تھا۔

ہم نے مشرق وسطیٰ کے اہم ممالک کا جن میں بحرین' اومان' دوبئی اور ابوظہبی شامل تھے' دورہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب جہاں جہاں بھی گئے ان کا شایان شان استقبال کیا گیا۔ مجھے پہلی بار اس حقیقت کا ادراک ہوا کہ ان ممالک میں لوگ ڈاکٹر صاحب کے لیے کتنی عقیدت رکھتے ہیں اور ان سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ جب ہم بحرین پہنچے تو پاکستان کلب کے عہدیداروں نے ہمارا بڑا شاندار استقبال کیا۔ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ بے شمار ملاقاتیں کیں۔ پاکستان کمیونٹی' پاکستان کلب کے عہدیداروں اور اراکین نے ڈاکٹر صاحب سے یک زبان ہو کر یہ بات کہی کہ اگر آپ غلام اسحاق خان انسٹی ٹیوٹ کے ساتھ منسلک ہیں تو ہم آنکھیں بند کر کے اپنے بچوں کو اس انسٹی ٹیوٹ میں پڑھائیں گے اور جو ہو سکا انسٹی ٹیوٹ کے لیے مالی امداد بھی کریں گے۔ ہمیں آپ پر پورا یقین اور بھروسہ ہے کیونکہ آپ جو کرتے ہیں وہ صحیح کرتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ انسٹی ٹیوٹ یقیناً اعلیٰ درجے کا ہوگا اس لئے ہم اپنے بچوں کو وہاں بھیجنے کے لیے تیار ہیں۔

اگرچہ ڈاکٹر صاحب کا یہ دورہ نجی نوعیت تھا اس کے باوجود بحرین میں ہمارے سفیر جناب افضال اکبر خان نے ہماری بہت پذیرائی کی اور ہر طرح سے خیال رکھا۔ انہوں نے بحرین کے امیر شیخ عیسیٰ بن سلمان الخلیفہ سے ڈاکٹر خان کی ملاقات کا بھی اہتمام کیا۔ امیر سے ملاقات کا وقت ساڑھے آٹھ بجے تھا۔ ہمیں یہ بتایا گیا کہ ہم نے وقت کی پابندی کا خاص خیال رکھنا ہے اور ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے امیر کے محل پر پہنچنا ہے کیونکہ امیر صاحب خود سیڑھیوں کے پاس آ کر مہمان کا استقبال کرتے ہیں۔

چنانچہ میں ڈاکٹر صاحب اور افضال اکبر خان ایک ہی گاڑی میں محل کی جانب روانہ ہوئے۔ جب ہم محل کے قریب پہنچے تو افضال اکبر خان نے کہا کہ چونکہ ہم تین چار منٹ پہلے آگئے ہیں اس لیے ہمیں گیٹ کے باہر ہی انتظار کرنا چاہیے۔ ٹھیک تین چار منٹ کے بعد ہم گیٹ کراس کر کے محل کے احاطہ میں داخل ہوئے تو امیر صاحب محل کے پاس ڈاکٹر صاحب کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ جیسے ہی ڈاکٹر صاحب گاڑی سے باہر نکلے انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو گلے سے لگایا اور معانقہ کیا۔ اس کے بعد ہم محل کے اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کا بڑے اچھے الفاظ میں خیر مقدم کیا اور ان کی بڑی تعریف کی اور کہا "آپ امت مسلمہ کا قیمتی سرمایہ ہیں' میں آپ کا بڑا معتقد ہوں' بحرین کے عوام آپ کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ اور آپ کو قدر کی نظر سے دیکھتے ہیں"۔ جب انہیں اس بابت پتہ چلا کہ ہم نے بین الاقوامی معیار کا تعلیمی ادارہ غلام اسحاق خان انسٹی ٹیوٹ قائم کیا ہے جسے متعارف کرانے کے لیے بحرین آئے ہیں تو وہ بہت خوش ہوئے اور کہا "بلاشبہ آپ قوم کی بڑی خدمت کر رہے ہیں اور ہم اس ضمن میں ہر طرح سے آپ کی مدد کرنے کو تیار ہیں"۔

بحرین کے بعد ہماری اگلی منزل مسقط تھی ایئرپورٹ پر سفارت خانے کے لوگوں نے ہمارا استقبال کیا۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ ڈاکٹر صاحب کا مشرق وسطیٰ کا یہ ٹور غیر سرکاری تھا۔ لیکن اس کے باوجود بحرین کے امیر نے ہمیں ملاقات کا مناسب وقت دیا۔ اسی طرح جب ہم مسقط پہنچے تو ہمیں یہ بتایا گیا کہ مسقط کے نائب وزیر اعظم ڈاکٹر زواوی کے ساتھ ڈاکٹر خان کی ملاقات کا وقت طے ہو چکا ہے۔ یہ بات اس حقیقت کی وضاحت کرتی ہے کہ مسلم برادر ممالک کی معزز شخصیات مثلاً امیر اور وزراء ڈاکٹر صاحب کو ان کے نجی دوروں پر بھی وی وی آئی پی پروٹوکول دیتے ہیں ان سے ملنا چاہتے ہیں' ان سے باتیں کرنا چاہتے ہیں اور ان سے اپنی عقیدت کا اظہار کرنا چاہتے ہیں۔ خاص طور پر ان کے عوام تو ڈاکٹر صاحب کی راہوں میں آنکھیں بچھاتے ہیں۔

مسقط میں پاکستان کے سفیر جناب سلطان حیات خان نے ڈاکٹر صاحب کو ڈاکٹر زواوی سے ملاقات کے بارے بتاتے ہوئے کہا "چونکہ آپ نائب وزیر اعظم سے پہلی مرتبہ ملاقات کر رہے ہیں تو بہتر یہ ہے کہ اس موقع پر آپ کوئی سوٹ وغیرہ پہن لیں"۔

ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا "میں تو سفاری سوٹ ہی میں جاؤں گا"۔ اس موقع پر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "میں نے زندگی میں ایک چیز سیکھی ہے کہ تمام معاملات میں ہمیشہ اپنی سہولت کو مقدم رکھا جائے۔ چونکہ اس وقت گرمی کا ٹمپریچر 46,45 ڈگری ہے اس لیے مناسب یہی ہے کہ سوٹ کی بجائے سفاری سوٹ پہنا جائے"۔

چنانچہ ڈاکٹر صاحب اور ہم نے سفاری سوٹ زیب تن کئے جبکہ ایمبیسڈر صاحب سوٹ میں ملبوس تھے۔ وقت مقررہ پر ہم محل پہنچے۔ تین چار دروازوں سے گزر کر ہم مہمان خانے میں پہنچے تو وہاں اے سی لگا ہوا تھا۔ ایمبیسڈر صاحب اور ہم سب وہاں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد نائب وزیر اعظم تشریف لائے جو ہمارے میزبان تھے۔ خیریت دریافت کرنے کے بعد انہوں نے ہمارے ساتھ باتیں کرنا شروع کر دیں۔ گفتگو کے دوران انہوں نے انکشاف کیا کہ وہ کراچی میں کافی عرصہ رہے ہیں اور وہیں انہوں نے تعلیم بھی حاصل کی۔ انہوں نے ڈو میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کیا تھا۔ انہوں نے بتایا "میں پاکستان سے بہت محبت کرتا ہوں اور پاکستانیوں کو بہت پسند کرتا ہوں' میرے پاکستان میں بہت جاننے والے ہیں"۔

زواوی صاحب نے ڈاکٹر صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "باہر موسم بہت اچھا ہے چائے ہم لان میں پئیں گے"۔ زواوی صاحب کے اس اعلان کے ساتھ ہی میری نظر ایمبیسڈر صاحب کے رنگ بدلتے ہوئے چہرے پر پڑی جو زواوی صاحب سے اس بات کی توقع نہیں کر رہے تھے کہ وہ ہمیں چائے لان میں پیش کریں گے۔

جب ہم لان میں پہنچے تو وہاں سخت گرمی تھی۔ پنکھے بند تھے کیونکہ پنکھوں کی ہوا سے کھانے کی چیزوں کے ٹھنڈے ہونے کا احتمال تھا۔ موسم کی مناسبت سے زواوی صاحب باریک عربی لباس میں ملبوس تھے۔ ہم سب تو لطف اندوز ہو رہے تھے لیکن ایمبیسڈر صاحب پسینے پسینے ہوئے جا رہے تھے وہ شاید دل ہی دل میں دعا بھی کر رہے تھے کہ کسی طرح یہ ملاقات جلد اختتام کو پہنچے۔ جب چائے وغیرہ سے فارغ ہوئے تو پنکھے چلا دیئے گئے۔ جب زواوی صاحب کو انسٹی ٹیوٹ کے قیام کے بارے میں پتہ چلا تو انہوں نے بھی خوشی کا اظہار کیا اور ڈاکٹر صاحب کو اپنی جانب سے ہر قسم کے تعاون کا یقین دلایا۔

ملاقات کے بعد جب ہم محل سے باہر نکلے تو ایمبیسڈر سلطان حیات خان صاحب نے نہ صرف سوٹ پہننے کی غلطی کو تسلیم کیا بلکہ پسینہ صاف کرتے ہوئے فرمایا "ڈاکٹر صاحب! آپ کا سوٹ نہ پہننے کا فیصلہ بڑا مناسب تھا"۔

اس موقع پر ڈاکٹر صاحب نے اپنی پہلی بات کو دہراتے ہوئے کہا "آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ میں ہمیشہ اپنی سہولت کو دوسری تمام چیزوں پر فوقیت دیتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے جو لباس اچھا لگتا ہے وہی پہنتا ہوں جو کام مجھے کرنا اچھا لگتا ہے وہی کام کرتا ہوں۔ خاص طور پر میں ان چیزوں میں دوسروں کی آراء کو کبھی اہمیت نہیں دیتا اور ہمیشہ وہی کیا جو مجھے پسند ہوتا ہے"۔

مسقط سے ہم ابوظہبی کے لیے روانہ ہوئے۔ ابوظہبی میں پاکستانیوں کی تعداد بہت زیادہ ہیں۔ پاکستان کے سفارت خانے کے افراد نے ہمارا استقبال کیا۔ ہمیں یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ سفارت خانے نے سوشل کونسلروں کے تعاون سے زبردست انتظامات کیے ہوئے تھے اور ہمارے لیے ایک ایسا موثر شیڈول بنایا تھا کہ ہم کم سے کم وقت میں کئی مخیر حضرات اور فلاحی تنظیموں سے ملاقاتیں کر سکیں اور بے شمار تقاریب میں شرکت کی۔ ایسی ہی ایک تقریب میں پاکستانیوں کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی تھی جس میں پاکستانی ثقافت کا رنگ بھی بہت نمایاں تھا۔ ہال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ جب ڈاکٹر صاحب ہال میں تشریف لائے تو لوگوں نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا اور کافی دیر تک تالیاں بجاتے رہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی تقریر میں کہا:

"مجھے معلوم ہے کہ آپ لوگ یہاں محنت مزدوری کرتے ہیں اور آپ لوگوں کے پاس زیادہ پیسہ نہیں لیکن آپ لوگوں سے پچاس' پچاس سو' سو درہم لے کر ہم نے اس انسٹی ٹیوٹ کو چلانا ہے۔ میں آپ لوگوں کے پاس دو چیزوں کے لئے آیا ہوں۔ اول یہ کہ ہمیں آپ لوگوں سے چندہ لینا اور دوسرا صاحب استطاعت لوگوں سے درخواست کرنا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو پڑھانے کے لیے امریکہ' انگلستان اور یورپی ممالک بھیجنے کی بجائے جی آئی کے انسٹی ٹیوٹ بھیجیں۔ ایک تو وہ اپنی ثقافت میں رہیں گے اور دوسرا انسٹی ٹیوٹ کی پڑھائی بھی اعلیٰ معیار کی ہے۔ اساتذہ کی زیادہ تعداد نے بیرونی ممالک سے پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کی ہیں' فیس بھی کم ہے باہر آپ کا خرچہ بہت زیادہ آتا ہے وہاں پر خرچہ بھی کم آئے گا۔ ڈاکٹر صاحب کی تقریر نے لوگوں میں بڑا جوش خروش پیدا

کیا۔ تقریب کے اختتام پر ڈاکٹر صاحب کو لوگوں نے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ ہال میں موجود ہر شخص کی یہ خواہش تھی کہ وہ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ تصویر کھنچوائے' ان سے آٹوگراف لے۔ ہر شخص ڈاکٹر صاحب کے قریب آنا چاہتا تھا۔ یقین مانیے ہمارے لئے اس ہجوم سے ڈاکٹر صاحب کو نکالنا مشکل ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب رات تقریباً ایک بجے لوگوں سے معذرت کر کے ہوٹل کے لیے روانہ ہو سکے۔

1993ء میں ازبکستان کے وزیر برائے سائنس اینڈ ٹیکنالوجی جناب پروفیسر حبیب اللہ یوف نے پاکستان کا سرکاری دورہ کیا۔ اپنے دورے کے دوران انہوں نے ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کرنے کی خواہش کا اظہار کیا وہ ڈاکٹر صاحب سے ملنے کے لیے گیسٹ ہاؤس تشریف لائے۔ اس وقت میں بھی وہاں موجود تھا۔ حبیب اللہ یوف صاحب نے ملاقات کے دوران ڈاکٹر صاحب کو بتایا کہ آپ نہ صرف پاکستان کے بلکہ ہمارے بھی ہیرو ہیں۔ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو ازبکستان آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ ان کی دعوت پر ہم ستمبر 1994ء میں ازبکستان گئے۔ پروفیسر حبیب اللہ یوف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کے وزیر تھے اس کے علاوہ وہ انسٹی ٹیوٹ آف ہیٹ فزکس کے ڈائریکٹر بھی تھے۔ اس موقع پر انسٹی ٹیوٹ کے ڈپٹی ڈائریکٹر عبداللہ سعیدوف بھی موجود تھے۔ انہوں نے خود ہمیں سارا انسٹی ٹیوٹ دکھایا۔ انسٹی ٹیوٹ کی حالت دیکھ کر ہمیں بڑا دکھ ہوا۔ ٹیوب لائٹس فیوز ہو چکی تھیں جنہیں خریدنے کے لیے ان کے پاس پیسے نہیں تھے۔ بہت سارا ایکوپمنٹ بھی خراب ہو چکا تھا جن کی مرمت کے لئے بھاری رقم درکار تھی۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب سطی ایشیائی ریاستیں روس سے نئی نئی آزاد ہوئی تھیں عام آدمی کی زندگی پر معاشی بدحالی اور مربوط انفراسٹرکچر کی عدم موجودگی کے اثرات پوری طرح نمایاں تھے۔ نئے نئے قانون بن رہے تھے۔ بجٹ میں پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے کئی سرکاری ادارے بند کئے جا رہے تھے۔ ملک کی معاشی ابتری کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا تھا کہ ایک پروفیسر کی ماہوار تنخواہ پچاس یا ساٹھ ڈالر تھی اور اس پر ستم یہ کہ انہیں پچھلے دو تین مہینے سے تنخواہ نہیں ملی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کو ان کی حالت زار پر بہت ترس آ رہا تھا۔

انسٹی ٹیوٹ دیکھنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے پروفیسر حبیب اللہ یوف سے کہا کہ ہم ان کے ساتھ ایم او یو (MOU) پر دستخط کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے دو چار گھنٹے اکٹھے بیٹھ کر ایم او یو تیار کیا۔ جب تیار کردہ ایم او یو کی فوٹو کاپی کروانے کا مرحلہ آیا تو معلوم ہوا کہ اتنے بڑے انسٹی ٹیوٹ میں فوٹو کاپی مشین نہیں ہے۔

اس موقع پر ڈاکٹر صاحب نے ان سے پوچھا "آپ یہاں فوٹو کاپی کیسے کرتے ہیں؟" اس پر معلوم ہوا کہ وہ پرانے طریقے سے ایمونیا پرنٹ کے ذریعے کاپی کرتے ہیں۔ یہ حالت دیکھ کر ڈاکٹر صاحب مجھ سے کہنے لگے: "نذیر میٹنگ ختم ہونے کے بعد انسٹی ٹیوٹ کے ڈپٹی ڈائریکٹر پروفیسر ڈاکٹر عبداللہ سعیدوف کو اپنے ہمراہ لے کر بازار چلتے ہیں جہاں سے ایک عدد فوٹو کاپی مشین خرید کر ادارے کو گفٹ کرتے ہیں"۔

چنانچہ میٹنگ ختم ہونے کے بعد میں نے پروفیسر ڈاکٹر عبداللہ سعیدوف سے گزارش کی کہ وہ ہمارے ساتھ بازار چلیں "ہم آپ کے لئے ایک عدد فوٹو سٹیٹ مشین خریدنا چاہتے ہیں"۔ یہ سن کر وہ حیران رہ گئے اور ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ انہوں نے خوش ہو کر ڈاکٹر صاحب کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور کہا "یقین مانئے کہ ہمیں فوٹو کاپی مشین کی بے حد ضرورت تھی"۔

چنانچہ جب ہم زیروکس (Xerox) کی ایجنسی پہنچے تو ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ ہوا یوں کہ ایجنسی کے سیلز مین کو جب یہ معلوم ہوا کہ ہم پاکستانی ہیں تو اس نے ہم سے اردو میں گفتگو شروع کر دی۔ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ دو تین سال تک بھارت کے شہر بمبئی میں رہا ہے اور اس نے اردو بھی وہیں سیکھی۔ مشین کی قیمت تقریباً 5000 ہزار ڈالر تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے قیمت ادا کرنے کے لئے جب اسے کریڈٹ کارڈ دیا تو وہ کہنے لگا کہ ہمارے یہاں کریڈٹ کارڈ کا سسٹم رائج نہیں۔ ڈاکٹر صاحب بہت حیران ہوئے اور کہنے لگے کہ کریڈٹ کارڈ تو ساری دنیا میں استعمال ہوتا ہے تو اس نے جواب دیا کہ شاید اگلے 6 مہینے یا سال میں یہ یہاں بھی رائج ہو جائے۔

پھر ڈاکٹر صاحب نے اسے ٹریولرز چیک دیئے تو اس نے اسے بھی لینے سے انکار کر دیا اور کہنے لگا کہ یہ بھی ہمارے یہاں استعمال نہیں ہوتے' ہمیں تو صرف کیش چاہیے۔

ہمارے لئے مشکل یہ تھی کہ ہم سفر کے دوران زیادہ کیش نہیں رکھتے تھے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کہنے لگے "نذیر مشین تو ہم نے ضرور خریدنی ہے۔" چنانچہ ہم سب نے اپنا اپنا کیش نکالا اور اس طرح بمشکل پانچ ہزار ڈالر پورے کئے۔ مشین خریدنے کے بعد پروفیسر عبداللہ سعیدوف کہنے لگے کہ اگر ڈاکٹر صاحب ہمیں دو چار پیکٹ کاغذ کے بھی لے دیں تو ہم بے حد مشکور ہوں گے۔ مشین اور کاغذ کے لینے کے بعد اس نے ڈاکٹر خان کا بہت شکریہ ادا کیا۔

ابھی ہم بازار میں ہی تھے کہ پروفیسر صاحب نے وقت دیکھنے کے لئے پہلے میری طرف اور پھر ڈاکٹر صاحب کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر صاحب نے محسوس کیا کہ پروفیسر کے ہاتھ میں گھڑی نہیں ہے تو فوراً کہنے لگے نذیر! پروفیسر کو گھڑی لے کر دینی ہے۔ چنانچہ پروفیسر صاحب کو ایک دوکان سے گھڑی بھی لے کر دی۔ گھڑی لے کر وہ بہت خوش ہوا اور ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کرنے لگا۔

گھڑی پہننے کے بعد پروفیسر کی حالت یہ ہو گئی تھی کہ وہ وقت دیکھنے کے لئے بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ مارکیٹ میں چیزیں دیکھتے ہوئے ہم آگے کی جانب بڑھنا شروع ہوئے تو راستے میں گھڑیوں کی ایک بڑی دکان دیکھی۔ ڈاکٹر صاحب یہ کہتے ہوئے دکان میں داخل ہوئے کہ میں پروفیسر کو پہلی والی سے بہتر گھڑی لے کر دینا چاہتا ہوں۔ چنانچہ پروفیسر صاحب کو پہلے سے اچھی اور بہتر گھڑی خرید کر دی گئی۔ جسے لے کر بہت حیران ہوا اور کہنے لگا کہ ابھی تو آپ نے ایک گھڑی لے کر دی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا "جو گھڑی پہلے لے کر دی تھی اس کا ڈائیل ذرا چھوٹا ہے وہ گھڑی تم اپنی بیوی' بیٹی یا بیٹے کو دے دینا اور یہ نئی گھڑی تم اپنے لئے رکھ لینا"۔ اس نے نئی گھڑی لے کر ایک دفعہ پھر ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کیا۔

ڈاکٹر صاحب کی یہ عادت ہے کہ وہ جس کسی ادارے میں جاتے ہیں تو ہر چیز کا بغور جائزہ لیتے ہیں۔ اس دوران اگر وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ادارے کو فلاں چیز کی ضرورت ہے یا کوئی خامی محسوس کرتے ہیں تو وہ اسے پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جیسا کہ ازبکستان کے انسٹی ٹیوٹ کو فوٹو کاپی اور ڈپٹی ڈائریکٹر پروفیسر عبداللہ سعیدوف کو گھڑیاں خرید کر دی۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ خوبی ہے کہ انہیں جہاں اور جب بھی موقع ملتا ہے وہ لوگوں کی مدد کرنے میں ایک لمحے کا توقف نہیں کرتے۔ اندرون ملک ہوں یا بیرون ملک خاص طور پر تحقیقی و تعلیمی اداروں کا معائنہ کرتے وقت ان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ ادارے کو گفٹ کی صورت میں یا مالی امداد کی شکل میں کچھ نہ کچھ دے کر جائیں۔

جون 1995ء میں ڈاکٹر صاحب کو قازقستان نیشنل اکیڈمی آف سائنسز کے صدر کی جانب سے دعوت نامہ موصول ہوا۔ ہوا یوں کہ پروفیسر زگادیف نے جو قازقستان نیشنل اکیڈمی آف سائنسز کے صدر تھے ڈاکٹر صاحب سے درخواست کی کہ ہم آپ کو فارن فیلو منتخب کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ فارن فیلو کے لئے الیکشن ہوتا ہے جس کے لئے مناسب یہی ہو گا کہ الیکشن کے دوران آپ وہاں موجود ہوں لیکن اگر آپ اپنی مصروفیت کی بنا پر الیکشن کے دوران وہاں موجود نہیں بھی ہوئے تب بھی ہمیں امید ہے کہ آپ منتخب ہو جائیں گے۔ انتخاب کے بعد اگلے دن منتخب ہونے والوں کی انڈکشن کے سلسلے میں ایک معزز تقریب کا اہتمام کیا جاتا ہے جس میں قازقستان کے صدر' وزراء اور دیگر اہم شخصیات شرکت کرتی ہیں۔ چنانچہ پروفیسر زگادیف کے بہت اصرار پر ڈاکٹر صاحب نے قازقستان آنے کی دعوت قبول کر لی۔

اس سفر میں ہمارے ساتھ انجینئر محمد فاروق' بریگیڈیئر سجاول' ڈاکٹر ہاشمی اور بریگیڈیئر الیاس بھی شامل تھے۔ ائرپورٹ پر اکیڈمی کے صدر نے ہمارا استقبال کیا۔ قازقستان نیشنل اکیڈمی آف سائنسز نے ہمارا بہت خیال رکھا۔ ہمارے ٹھہرنے کا بندوبست گیسٹ ہاؤس میں کیا گیا تھا۔ جہاز سے اترتے ہی مترجم لڑکیاں ہمارے ساتھ کر دی گئیں اور ہم جتنے دن بھی قازقستان میں رہے مترجم لڑکیاں ہمارے ساتھ ساتھ رہیں۔ یہ لڑکیاں بہت روانی سے خوبصورت انگریزی بولتی تھیں۔ اس کے علاوہ دو گاڑیاں' دو ڈرائیور اور بہت سارے لوگ ہمارے ساتھ ڈیوٹی پر مامور کئے گئے تھے۔ اس کے باوجود کہ الیکشن کے دوران ڈاکٹر صاحب موجود نہیں تھے۔ وہ بھاری اکثریت سے الیکشن جیت گئے۔ اگلے دن اکیڈمی نے اپنے خوبصورت ہال میں ایک پروقار تقریب کا انعقاد کیا۔ تقریب میں وزراء اور بے شمار معزز شخصیات نے شرکت کی۔ قازقستان کے صدر محترم کو بھی مدعو کیا گیا تھا جو اپنی مصروفیات کی وجہ سے تقریب میں شرکت نہیں کر سکے تھے۔ تقریب میں سب سے پہلے سپاسنامہ پڑھا گیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب کو دیدہ زیب گاؤن اور کیپ پہنائی گئی اور فیلوشپ کی سند عطا کی گئی۔

بیرون ملک سفر پر روانہ ہونے سے قبل ہمیشہ ڈاکٹر خان بریگیڈیر سجاول یا مجھے بہت سارے گفٹ خریدنے کے لئے کہتے ہیں تاکہ بیرون ملک لوگوں کو تحفے تحائف دیے جا سکیں۔ جب ڈاکٹر صاحب نے یہ گفٹ بمعہ سو ڈالر ہر مترجم لڑکی کو دیئے تو تمام لڑکیاں بہت خوش ہوئیں اور انہوں نے ڈاکٹر صاحب کا بہت شکریہ ادا کیا۔ ان میں سے ایک لڑکی تو اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی۔ اس نے ڈاکٹر صاحب سے گلے مل کر ان کا بہت شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ڈاکٹر صاحب آپ بہت عظیم انسان ہیں کہ آپ نے ہمیں یہ خطیر رقم دی جس کی ہمیں شدید ضرورت تھی۔ یقین جانئے کہ یہ ہماری تین مہینے کی تنخواہ ہے جو ہمیں آج تک نہیں ملی۔ ڈاکٹر صاحب نے انہیں بتایا کہ انہیں معلوم ہے کہ یہاں پروفیسر حضرات کو بھی دو دو تین تین مہینے سے تنخواہ نہیں ملی اور ان کی ماہانہ تنخواہ ساٹھ ستر ڈالر سے زیادہ نہیں۔

لیکن جو چیز ڈاکٹر صاحب نے محسوس کی وہ یہ تھی کہ ان میں سے کسی نے بھی اپنی حکومت' ڈیپارٹمنٹ یا اپنی اکیڈمی کے خلاف کوئی شکایت نہیں کی۔ ان لوگوں نے ہماری بہت خدمت کی اور ہر کام انہوں نے خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ ہم ان لوگوں کے ساتھ تین چار دن رہے لیکن ان میں سے کسی نے بھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ ان کو تنخواہ نہیں

ملی یا ان کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس موقع پر کہا اس موقع پر کہ جو عظیم قومیں ہوتی ہیں وہ کبھی کسی غیر کے سامنے اپنے اندرونی مسائل کو نہ ڈسکس کرتی ہیں اور نہ ہی اپنے ملک کو برا بھلا کہتی ہیں۔ اس کے برعکس اگر یہی مسئلہ پاکستان میں درپیش ہوتا تو لوگ ہمارا ناک میں دم کر دیتے۔ لوگ احتجاج کرتے' مظاہرے کرتے' جلوس نکالتے اور تنخواہ نہ ملنے کا سخت واویلا کرتے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں پاکستان نے بہت کچھ دیا ہے جس کا ہم کبھی بھی شکر ادا نہیں کرتے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان پروفیسر حضرات اور لڑکیوں کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ ان کا حوصلہ دیکھیں کہ وہ ان حالات میں بھی صدق دل سے کام کر رہے ہیں۔ بعد ازاں ہمیں معلوم ہوا کہ ہر پروفیسر شام کو کوئی نہ کوئی کام کرتا ہے۔ کوئی اخبار بیچتا ہے کوئی بار میں ویٹر کا کام کرتا ہے تو کوئی سگریٹ بیچتا ہے لیکن کوئی بھیک نہیں مانگتا اور نہ ہی کوئی گلہ شکوہ کرتا ہے۔

مئی 1996ء میں مجھے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ پہلی مرتبہ عمرہ کرنے کا اتفاق ہوا۔ ہوا یوں کہ اسلامی ترقیاتی بنک کے صدر ڈاکٹر محمد احمد علی نے ڈاکٹر صاحب کو اسلامی ترقیاتی بنک جدہ میں لیکچر دینے کے لئے دعوت نامہ بھیجا۔ لیکچر کا موضوع تھا

"Prospects of promoting science and technology in the Islamic Development Bank (IDB) Member's countries ."

ڈاکٹر صاحب نے 19 مئی 1996ء کو لیکچر دیا۔ لیکچر میں کافی لوگوں نے شرکت کی۔ ڈاکٹر صاحب نے لیکچر دیتے ہوئے کہا کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے مسلم امہ کو تیل و معدنیات کی دولت سے مالا مال کیا ہے۔ انہوں نے لیکچر میں شرکت کرنے والے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا آپ لوگ انڈسٹری کیوں نہیں لگاتے آپ لوگوں کے پاس پیسہ ہے ہمارے پاس روپیہ نہیں ہے۔ ہمارے پاس مین پاور ہے آپ کے پاس مین پاور نہیں ہے۔ آپ کے پاس وسائل ہیں ہمارے پاس وسائل نہیں ہیں۔ یہ لیکچر اسلامی ترقیاتی بینک کی بلڈنگ میں تیرہویں یا چودھویں فلور پر ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اگر کھڑکی سے باہر نیچے جھانکیں گے تو سڑکوں پر دوڑتی ہوئی جتنی بھی گاڑیاں نظر آئیں گے وہ تمام گاڑیاں یورپ' امریکہ اور جاپان کی بنی ہوئی ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی گاڑی کسی مسلم ملک کی بنی ہوئی نہیں ہے۔ ہم گاڑیاں کیوں نہیں بناتے۔ ہم گاڑیاں بنا سکتے ہیں۔ آپ مرسڈیز والوں سے' ٹویوٹا والوں سے کہیں کہ ہم آپ سے گاڑیاں اس وقت خریدیں گے جب آپ ہمیں ان کی ٹیکنالوجی بھی دیں گے۔ اس طرح آپ اپنے ملک میں خود گاڑیاں تیار کر سکیں گے اور انہیں اپنا نام بھی دے سکیں گے۔ اس ضمن میں آپ کو مرسڈیز اور ٹویوٹا بنانے والی کمپنیوں کے ساتھ معاہدہ کرنا پڑے گا۔ ہمیں اس بات کا خاص خیال کرنا ہوگا جو گاڑی آپ تیار کریں اس گاڑی کو مراکش سے انڈونیشیا تک چلنا چاہیے۔ اسی طرح آپ جو ٹرک تیار کریں گے وہ بھی مراکش سے انڈونیشیا تک چلیں گے۔ اسلامی دنیا بہت بڑی ہے اور اگر پوری مسلم دنیا میں آپ کی بنی ہوئی چیزیں بکیں تو اس سے نہ صرف دو تین قسم کی گاڑیاں' دو تین قسم کے ٹرک' جیپیں' جہاز اور ان کے سپیئر پارٹس وغیرہ تیار کریں۔ اس سلسلے میں اسلامی ترقیاتی بینک بہت مدد کر سکتا ہے۔ اسلامی ترقیاتی بینک لوگوں کو متاثر کر سکتا ہے کہ اگر کوئی مسلم ملک آٹو انڈسٹری لگائے گا تو وہ اس کو قرضہ دے گا۔ اسی طرح اسلامی ترقیاتی بینک اسلامی ممالک کو یہ کہہ سکتا ہے کہ اگر آپ سعودی عرب میں تیار ہونے والی گاڑی خریدیں گے تو IDB گاڑیاں خریدنے کے لئے قرضہ دے سکتا ہے۔ مثال کے طور پر مصر میں جو ٹرک بنتا ہے اگر آپ خریدیں گے تو آپ کو قرضہ ملے گا جہاز جو انڈونیشیا میں بنتا ہے اگر آپ وہ خریدیں تو IDB آپ کو قرضہ دے گا۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اسلامی ترقیاتی بینک بہت اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ اسی طرح اگر آپ کسی الیکٹرانکس کی دوکان پر چلے جائیں تو الیکٹرانکس کی کچن کی تمام Appliances مثلاً جوسر' فرج' کوکنگ رینج وغیرہ سب کی سب فرانس' یورپ اور امریکہ کی ملیں گی۔ یہ چیزیں ہم خود کیوں نہیں بنا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی باتوں نے سب کو بہت متاثر کیا۔

لیکچر ختم ہونے کے بعد لنچ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ وہاں پر موجود افراد نے ڈاکٹر صاحب کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور کہنے لگے کہ آپ نے ہماری آنکھیں کھول دی ہیں۔ وہ الگ بات ہے کہ ہم اس پر عمل کریں یا نہ کریں لیکن آپ نے ہمیں ایک مثبت سوچ دی ہے کہ اگر ہم ہمت کریں اور کوشش کریں تو ہم سب کچھ کر سکتے ہیں۔ پاکستان میں تربیت یافتہ مین پاور ہے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ہیں۔ ہم مغربی ممالک سے چیزیں تو درآمد کرتے ہیں لیکن ٹیکنالوجی درآمد نہیں کرتے۔

لنچ کے بعد ہوٹل پہنچ کر ڈاکٹر صاحب نے مجھے بتایا کہ اب ہم عمرے کے لئے جا رہے ہیں جلدی سے تیاری کر لیں۔ اسی دن یعنی 19 مئی کو میں نے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ پہلا عمرہ کیا جو میرے لئے یقیناً باعث فخر بات تھی۔ عمرہ کرتے وقت بے شمار ایسے واقعات پیش آئے جس سے اس بات کا اندازہ ہوتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب اسلامی ممالک میں بھی ایک ہر دلعزیز شخصیت ہیں۔ طواف کرتے کرتے جب لوگوں کی نظر ڈاکٹر صاحب پر پڑتی تو وہ رک جاتے اور بے اختیاری طور پر ڈاکٹر صاحب کو سلام کرتے اور آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ چومنے لگتے اور انہیں دعائیں دیتے۔ اسی طرح صفا مروہ کے گرد چکر لگاتے وقت لوگ ڈاکٹر صاحب کو دور سے ہی پہچان لیتے تھے۔ وہ ہاتھ اٹھا کر ان کی درازی عمر کی دعائیں مانگتے اور کہتے ڈاکٹر خان کو ہماری عمر لگ جائے۔ بزرگ لوگ کہتے کہ ہم آپ کے بہت مشکور ہیں جو آپ نے پاکستان اور اسلامی امہ کے لئے کیا ہے ہم ہمیشہ خانہ کعبہ اور روضہ رسول ﷺ میں آپ کے لئے دعائیں کرتے رہتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ لوگ دل سے ڈاکٹر صاحب سے محبت اور ان کی تعظیم کرتے ہیں۔ میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ جہاں بھی گیا مکہ میں مدینہ میں ہر جگہ لوگ آپ کے گرد جمع ہو جاتے اور ان سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے' ڈاکٹر صاحب ہر طرح کے آدمی سے ملتے' ان کی باتیں سنتے اور دعائیں دینے پر ان کا شکریہ ادا کرتے۔ ڈاکٹر صاحب بہت شفیق انسان ہیں غرور اور تکبر نام کو نہیں۔ یہ وہ خوبی ہے جو بہت کم انسانوں میں پائی جاتی ہے۔ وہ ہر ایک سے دعائیں لیتے ہیں اور ہر ایک کو دعائیں دیتے ہیں۔

دسمبر 1996ء کو جب ملک شام کی وزیر برائے اعلیٰ تعلیم محترمہ ڈاکٹر صالحہ سن کر او آئی سی (کامسٹیک) کی میٹنگ میں شرکت کے لئے اسلام آباد تشریف لائیں تو انہوں نے ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کے لئے جب وہ گیسٹ ہاؤس پہنچیں تو اس میٹنگ کے لئے مجھے بھی گیسٹ ہاؤس بلایا گیا تھا۔ ملاقات کے دوران انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو بتایا کہ ان کے ملک میں نومبر 1997ء کو 37 واں سائنس ہفتہ منایا جا رہا ہے اور ان کی یہ خواہش ہے کہ آپ بھی اس میں شرکت فرمائیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کی دعوت قبول کرتے ہوئے سائنس ہفتہ میں شرکت کرنے کا وعدہ فرمایا۔

اگلے سال نومبر میں جب ہم نے شام جانے کا پروگرام بنایا۔ ہماری فلائٹ اسلام آباد سے دمشق براستہ دوبئی تھی۔ جب ہم دوبئی ائرپورٹ پر لینڈ کرنے والے تھے تو معلوم ہوا کہ اس وقت دوبئی میں سخت طوفان آیا ہوا ہے۔ پائلٹ نے دوبئی ائرپورٹ پر لینڈ کرنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ لینڈ نہیں کر سکا۔ ہم نے دیکھا کہ جہاز ہچکولے کھا رہا تھا۔ جہاز میں مکمل خاموشی تھی۔ میں نے جہاز میں چاروں طرف نظر گھما کر دیکھا تو تمام لوگ دم سادھے دعاؤں میں مشغول تھے۔ مسافروں کے چہروں پر موت کے سائے رقص کرتے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کے چہرے پر کسی بے چینی' سراسیمگی یا موت سے خوف کے اثرات بالکل موجود نہیں تھے بلکہ وہ بڑے اطمینان کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔

تھوڑی دیر بعد پائلٹ نے اعلان کیا کہ وہ دوبئی میں لینڈ نہیں کر سکتے اس لئے وہ ابوظہبی جا رہے ہیں۔ یہ اعلان سن کر مجھے یہ پریشانی لاحق ہوئی کہ دوبئی سے ہم نے دمشق کے لئے جو کنیکٹنگ فلائٹ لینا تھی وہ اب ہمیں نہیں مل سکے گی۔ میں نے جب ڈاکٹر صاحب کو اپنی پریشانی سے آگاہ کیا تو انہوں نے بڑے پرسکون انداز سے اور اطمینان کے ساتھ سمجھاتے ہوئے کہا:

''نذیر ایک بات یاد رکھو جو چیز آپ کے کنٹرول میں نہیں ہے اس کے لئے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بات آپ کے کنٹرول میں نہیں تھی کہ آپ جہاز کو دوبئی ائرپورٹ پر لینڈ کروا سکتے اس لئے جہاز کو دوبئی کی بجائے ابوظہبی لینڈ کرنا پڑا۔ اس جہاز نے جہاں جانا ہوگا وہاں جائے گا۔ چونکہ آپ اس جہاز کو اپنی مطلوبہ منزل تک جلدی نہیں لے جا سکتے اس لئے آپ کو نروس ہونے یا بے چین ہونے کی ضرورت نہیں''۔

چنانچہ ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ ہم نے بڑے آرام سے لابی میں چائے اور کافی وغیرہ پی۔ پوچھنے پر ائرپورٹ کے متعلقہ عملے نے ہمیں بتایا کہ موسم ٹھیک ہوتے ہی جہاز دوبئی کے لئے روانہ ہو جائے گا۔ چنانچہ کچھ ہی دیر بعد یہ اعلان ہوا کہ جہاز دوبئی کے لئے روانہ ہونے والا ہے۔ دوبئی ائرپورٹ پر لینڈ کرنے کے بعد جب ہمیں یہ معلوم ہوا کہ دمشق جانے والی فلائٹ جا چکی ہے تو میں فکرمند ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب کہنے لگے کہ کوئی پرواہ نہیں ہے رات کو ہم یہیں ٹھہریں گے اور صبح کو پہلی فلائٹ کے ذریعے دمشق روانہ ہو جائیں گے۔ چونکہ کوآرڈینیشن کا کام میرے ذمہ تھا اس لئے ڈاکٹر خان کے حکم کے مطابق میں نے سب سے پہلے دمشق میں اپنے میزبانوں کو بذریعہ فون بتایا کہ ہم آج نہیں پہنچ سکے پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے انشاءاللہ کل ہم دمشق پہنچ جائیں گے۔

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے اس پہلو سے میں نے یہ بات سیکھی کہ برے سے برے حالات میں بھی بالکل نہیں گھبرانا چاہیے خاص طور پر ایسے حالات میں جب آپ کے ہاتھ میں کچھ نہ ہو۔ چنانچہ اگلے دن دمشق روانہ ہونے والی فلائٹ کے بارے میں تمام ضروری معلومات لینے کے بعد میں نے سب کی نشستیں بک کروائیں' دبئی میں اپنے میزبان طاہر کو فون کیا کہ وہ ہمیں لینے کے لئے ائرپورٹ پر پہنچے اور تقریباً سوا گھنٹے بعد جب میں واپس آیا تو ڈاکٹر صاحب بڑے اطمینان کے ساتھ لابی میں وقت گزارنے کے لئے چائے اور کافی سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور

بڑے پرسکون دکھائی دے رہے تھے۔
اگلے دن جب ہم دمشق پہنچے تو نائب وزیر برائے تعلیم جناب ڈاکٹر محی الدین عیسی نے ہمارا شاندار استقبال کیا۔ دمشق میں ڈاکٹر صاحب نے ایک لیکچر بھی دیا جس میں کافی لوگوں نے شرکت کی۔ بعد ازاں اس خوبصورت شہر کی سیر کے دوران ڈاکٹر صاحب ایک سیاح کی طرح ہر چیز میں بہت دلچسپی لے رہے تھے۔ دمشق ایک قدیمی شہر ہے یہاں بہت سی قدیم زیارتیں بھی موجود ہیں جن میں آل رسول ﷺ کے تبرکات اور حضرت امام حسینؓ کا سر اقدس بھی رکھا گیا ہے۔ یہاں حضرت امام حسینؓ کی ہمشیرہ حضرت زینبؓ کا دیدہ زیب روضہ بھی موجود ہے جہاں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اپنی عقیدت کا اظہار کرنے کے لئے ہر وقت موجود رہتی ہے۔
ہم نے شام کے دوسرے بے شمار قریبی شہروں کا بھی دورہ کیا۔ ان کی یونیورسٹیوں میں گئے۔ ان کے انسٹی ٹیوٹ دیکھے۔ اس دوران ڈاکٹر صاحب نے ایک چیز جو خاص طور پر نوٹ کی وہ شام کے صدر حافظ الاسد کی تصاویر تھیں جو ملک کے ہر کونے میں جگہ جگہ آویزاں ہیں۔

قسط نمبر 22

عکسِ قدیر ڈاکٹر نذیر احمد

شامیوں کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا مشاہدہ یہ تھا کہ "موجودہ حالات میں یہ قوم کبھی ترقی نہیں کرسکتی کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ خوف زدہ قوم میں اعتماد کی کمی ہوتی ہے اور کوئی بھی بڑا یا تحقیقی کام کرنے کے لئے جرأت حوصلے اور بلا کے اعتماد کی ضرورت ہوتی ہے جو ان میں نہیں ہے"۔ ان کے خوف کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک پروفیسر کے کمرے میں بھی صدر حافظ الاسد کی دو دو تین تین تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ جب ہم یونیورسٹی کی لائبریری میں گئے تو وہاں بھی حافظ الاسد کی بیس بائیس تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ صدر حافظ الاسد نے لوگوں کے دلوں میں اتنا خوف پیدا کر دیا تھا کہ لوگ ڈرتے تھے کہ اگر ان کی تصویر کمرے میں نہ لگائی گئی تو ان کی چھٹی ہو جائے گی۔

ڈاکٹر صاحب کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ ہر چیز کا بغور مشاہدہ کرتے ہیں اور اس کے بعد جو تجزیہ کرتے ہیں وہ حقیقت کے بہت قریب ہوا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہوٹہ لیبارٹری کا قائم کرنا اور اسے دنیا کے جدید ترین ساز و سامان سے لیس کرنے میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی اس خوبی کا بہت اچھا استعمال کیا ہے۔ وہ کسی بھی شخص سے ملاقات کرنے کے بعد اس بات کا اندازہ لگا لیتے ہیں کہ اس شخص سے کیا کام لیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے آج تک انہوں نے جس کسی پر بھی جو ذمہ داری عائد کی ہے وہ اس نے بحسن خوبی نبھائی ہے۔ اسی طرح بیرونی ممالک سے سامان منگوانے میں بھی ڈاکٹر صاحب نے ایک بہترین ٹیم تیار کی جس کے نتائج آج ہم سب کے سامنے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کا یہ کہنا کہ آج کے آر ایل میں ایک ڈاکٹر عبدالقدیر خان نہیں بلکہ کئی ہزار ڈاکٹر عبدالقدیر خان کام کر رہے ہیں دراصل ان کی اسی خوبی کا شاخسانہ ہے۔

شام سے واپسی پر ہم عمرہ کرنے کے لئے سعودی عرب رک گئے۔ چنانچہ 6 نومبر 1997ء کو میں نے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ دوسرا عمرہ کیا۔ میں خدا کا بے حد شکر گزار ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ سفر کرنے کی بدولت مجھے عمرہ کرنے کی سعادت کئی مرتبہ نصیب ہوئی۔ جب بھی ڈاکٹر صاحب کسی ایسے ملک کے دورے پر ہوتے جس کے راستے میں جدہ پڑتا تو وہ بغیر عمرہ کئے کبھی بھی اپنے وطن نہیں لوٹے اس سے ڈاکٹر صاحب کی مذہب سے وابستگی کا پتہ چلتا ہے۔

غلام اسحاق خان صاحب یہ بات بخوبی جانتے تھے کہ ڈاکٹر خان ہی وہ واحد شخصیت ہیں جو اندرون بیرون ملک اپنی یکساں شہرت کے باعث جی آئی کے انسٹی ٹیوٹ کی تعمیر کے سلسلے میں ان کی بہت مدد کر سکتے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ نہ صرف لوگ ڈاکٹر صاحب کی عزت کرتے ہیں بلکہ ان کی بات بھی بڑے غور سے سنتے ہیں۔ چنانچہ غلام اسحاق خان صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے یہ اصرار کیا کہ جی آئی کے انسٹی ٹیوٹ کو متعارف کرانے کے لئے وہ سعودی عرب اور مشرق وسطی کا دورہ کریں اور دورے کے دوران وہ اسلامی ترقیاتی بنک سے بات چیت کریں کہ جی آئی کے انسٹی ٹیوٹ کو نہ صرف مزید قرضہ کی ضرورت ہے بلکہ قرضوں کی ری شیڈولنگ پر بھی نظر ثانی کی جائے حالانکہ غلام اسحاق خان صاحب جی آئی کے انسٹی ٹیوٹ کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر ایچ یو بیگ صاحب اور اسلامی ترقیاتی بنک کے صدر ڈاکٹر احمد محمد علی فنانس کے آدمی ہیں اور ان تینوں کے درمیان دوستانہ مراسم بھی موجود ہیں۔ اسلامی ترقیاتی بنک کو قائم کرنے میں بھی غلام اسحاق خان اور ایچ یو بیگ صاحب نے بڑا کام کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسلامی ترقیاتی بنک نے جی آئی کے انسٹی ٹیوٹ کو اس کی تعمیر کے سلسلے میں 10 ملین ڈالر کا قرضہ فراہم کیا تھا جو یقیناً ایک بہت بڑا قرضہ تھا لیکن اس کے باوجود جی آئی کے انسٹی ٹیوٹ کو مزید سرمائے کی ضرورت تھی۔

غوری میزائل کے کامیاب تجربے اور پاکستان کے کامیاب ایٹمی دھماکوں کے بعد اسلامی ممالک میں پاکستان خاص طور پر ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو بڑی پذیرائی حاصل ہوئی تھی۔ چنانچہ ستمبر 1998ء کو ڈاکٹر صاحب نے غلام اسحاق خان کے اصرار پر سعودی عرب جانے کے لے ایک وفد تشکیل دیا۔ وفد میں ڈاکٹر صاحب، جنرل چوہان، ایچ یو بیگ اور کچھ دوسرے احباب کے علاوہ میں بھی شامل تھا۔ اس دوران ہی ہمیں یہ کہا گیا کہ اس اہم دورے کے لئے وفد میں ایک مترجم کو بھی شامل کیا جائے کیونکہ وہاں سعودی حکمران اور دیگر عہدوں پر فائز اعلی شخصیات وغیرہ سے بات چیت کے لئے ہمیں اپنے مترجم کی ضرورت ہے لہذا بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے پروفیسر اور پروفیسر محمود احمد غازی کے چھوٹے بھائی پروفیسر غزالی صاحب کو بھی وفد میں شامل کیا گیا جن کے ساتھ ہم سب کے دوستانہ مراسم تھے۔

جب ہم دوبئی ائرپورٹ پر اترے تو معلوم ہوا کہ ہمارے دوبئی پہنچنے سے پہلے ہی ڈاکٹر صاحب کے لئے وزیر خزانہ سرتاج عزیز صاحب کا ٹیلی فون آچکا ہے اور یہ تاکید کی گئی تھی کہ ڈاکٹر صاحب کو کہیں کہ وہ ائرپورٹ پر اترتے ہی فوراً مجھ سے بات کرلیں۔ چنانچہ ہمارے میزبان طاہر نے جو ہمارا استقبال کرنے کے لئے وہاں موجود تھے۔ ڈاکٹر صاحب سے ملتے ہی سرتاج عزیز صاحب کا پیغام پہنچایا۔ فون کرنے پر سرتاج عزیز صاحب نے جو ڈاکٹر صاحب کے ٹیلی فون کا بڑا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے ڈاکٹر صاحب کو بتایا:

"وزیر اعظم محمد نواز شریف صاحب یہ چاہتے ہیں کہ آپ فوراً ہی وطن واپس تشریف لے آئیں تاکہ مسلم لیگی اور دیگر اراکین قومی اسمبلی کو سی ٹی بی ٹی کے بارے میں مفصل بریفنگ دی جا سکے"۔

ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا "اس وقت واپسی مشکل ہے تاہم اگلے دن پاکستان واپسی ممکن ہو سکے گی" جسے سرتاج عزیز صاحب نے فوراً ہی تسلیم کرلیا۔

حالات کا تقاضا یہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب ہمیں بھی واپس چلنے کے لئے کہتے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان کا بڑا پن تھا کہ انہوں نے ہمیں اپنا سفر جاری رکھنے پر زور دیا اور ہم میں سے ہر ایک کا نام لے کر یہ بات کہی کہ میں سمجھتا ہوں کہ آپ سب لوگ اس مقصد کو حاصل کر سکتے ہیں جس کے لئے ہم یہاں آئے تھے۔ اگلے دن ڈاکٹر صاحب واپس تشریف لے گئے۔ ہم سب نے اپنے ٹور کو جاری رکھا۔ ٹور کے اختتام پر اللہ تعالی نے مجھے ایک مرتبہ پھر عمرہ کرنے کی سعادت سے نوازا۔ لیکن اس عمرے میں ہمارے لیڈر ڈاکٹر خان صاحب نہیں تھے بلکہ پروفیسر غزالی صاحب تھے۔

ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ سب سے زیادہ دلچسپ سفر ٹمبکٹو کا تھا۔ 19 فروری 1999ء کو ہم اس سفر پر روانہ ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب اس سے قبل 1998ء میں بھی ٹمبکٹو کا سفر کر چکے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی کافی عرصے سے یہ خواہش تھی کہ کسی طرح ٹمبکٹو کے قدیم شہر کو دیکھا جائے۔ انہوں نے بچپن میں اس شہر کے بارے میں بڑی کہانیاں سن رکھی تھیں۔ میں اس سفر میں ان کے ہمراہ نہیں تھا۔ انہوں نے یہ سفر مراکش کے راستے مالی کے دارالحکومت بماکو تک کیا اور وہاں سے ٹمبکٹو کے لئے جہاز چارٹر کروایا تھا۔ تاہم ٹمبکٹو میں ڈاکٹر صاحب صرف 4 یا 5 گھنٹے گزار پائے تھے۔ جس کی وجہ سے ٹمبکٹو کے قدیم شہر کو صحیح طرح دیکھ نہیں پائے تھے۔ چنانچہ یہ فیصلہ ہوا تھا کہ اگلے سال ان ہی دنوں میں ٹمبکٹو کا ایک مرتبہ پھر دورہ کیا جائے گا۔

چنانچہ 19 فروری 1999ء کو ہم ٹمبکٹو کے لئے روانہ ہوئے۔ پروگرام کے مطابق ہم اسلام آباد سے دوبئی اور وہاں سے خرطوم پہنچے۔ خرطوم سے ہم نے ایک جہاز چارٹر کروایا اور ٹمبکٹو کی جانب روانہ ہوئے۔ راستے میں ہمیں جہاز میں ایندھن بھروانے کے لئے سوڈان کے ایک اور شہر الفشیر میں تھوڑی دیر قیام کرنا پڑا۔ یہ شہر سوڈان اور چاڈ کی سرحد پر واقع ہے۔ ہمارا دوسرا اسٹاپ نائجیریا کے شمالی صوبے کا ایک بڑا شہر کانو تھا جہاں ہم نے ایک دن قیام کیا۔ کانو نائیجیریا کا قدیم شہر ہے اور دنیا کے کونے کونے سے سیاحوں کی ایک بڑی تعداد اس شہر کو دیکھنے کے لئے وہاں آتی ہے۔ خاص طور پر کانو کا قدیم عجائب گھر سیاحوں کی دلچسپی کا اہم مرکز ہے۔ اس عجائب گھر میں صدیوں پرانی اشیاء جن میں زیورات، سامان حرب، برتن اور تصاویر وغیرہ رکھی گئی ہیں۔ اس قدیم شہر کے اہم مقامات کو دیکھنے کے بعد جب ہم عجائب گھر پہنچے تو گائیڈ نے وہاں رکھی ہوئی تمام اشیاء کے بارے میں ہمیں بڑی تفصیل سے بتایا۔ جب وہ ہمیں ایک تصویر کے بارے میں بتا رہا تھا جس میں کانو کا امیر تخت پر بیٹھا تھا اور انگریزوں کو دربار میں نیچے بیٹھا ہوا دکھایا گیا تھا تو اس موقع پر ڈاکٹر خان نے تصویر کا جائزہ لیتے ہوئے برجستہ تبصرہ فرماتے ہوئے کہا۔

"مجھے یقین ہے کہ کچھ عرصے بعد انگریز تخت پر بیٹھا ہوا ہوگا اور امیر کانو زمین پر آچکا ہوگا"۔

اس بات پر ہم سب کی بے ساختہ ہنسی چھوٹ گئی اور گائیڈ نے بلند آواز میں قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "یہ مذاق کی بات نہیں بلکہ حقیقتاً ایسا ہی ہوا تھا"۔

ڈاکٹر خان کی مزاح کی حس بہت تیز ہے وہ اپنے لطیفوں اور چٹکلوں سے محفل کو زعفران بنا دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی محفل میں بیٹھا ہوا کوئی بھی شخص بور نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ خوبی ہے کہ وہ الفاظ سے کھیلنے کا فن جانتے ہیں اور موقع پر ایسے فقروں کا استعمال کرتے ہیں کہ کوئی بھی شخص اس کا لطف اٹھائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک دن قیام کے بعد ہمارا جہاز دوپہر کے وقت ٹمبکٹو کے لئے محو پرواز تھا۔ ٹمبکٹو میں ہم نے دو دن اور دو راتیں قیام کیا۔

نومبر 1999ء میں ڈاکٹر صاحب کو سعودی عرب کے کراؤن پرنس جناب عبداللہ بن عبدالعزیز کی جانب سے ریاض میں ہونے والی ایک کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ ملا۔ اس دورے میں ڈاکٹر صاحب شاہی مہمان تھے۔ خوش قسمتی سے میں بھی اس دورے میں ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ تھا۔ جب ہم ریاض پہنچے تو سیمینار شروع ہونے میں ابھی ایک دن باقی تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا یہ دن ریاض میں سیر و تفریح میں گزارنے کی بجائے کیوں نہ عمرہ کیا جائے۔

چنانچہ ہم نے فوراً ہی اس کا پروگرام بنایا حالانکہ کانفرنس کے منتظمین نے کانفرنس کے شرکاء کے لئے کانفرنس کے بعد عمرہ کرنے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب اتنا انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ یہ میرا تیسرا عمرہ تھا۔ شام کو ہم ریاض سے مدینہ روانہ ہوئے جہاں ایک رات قیام کرنے کے بعد اگلے دن ہم جدہ چلے گئے اور عمرہ ادا کیا۔

عمرے کے بعد ہم ریاض واپس آگئے اور سیمینار میں شرکت کی۔ اس سفر کی سب سے خاص بات یہ تھی کہ ریاض میں پاکستانیوں کی بہت بڑی تعداد موجود ہے ہم جہاں بھی گئے انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو بہت عزت دی۔ وہ انہیں دیکھ کر رک جاتے' ان کے ہاتھ چومتے' ان کی خدمات کو سراہتے اور ان کی درازی عمر کے لئے دعائیں کرتے۔ جب پاکستان سفارت خانے کو ڈاکٹر صاحب کی آمد کا پتہ چلا تو انہوں نے بھی ڈاکٹر صاحب کے اعزاز میں کھانا دیا۔ اس کے بعد کراؤن پرنس عبداللہ بن عبدالعزیز نے اپنے محل میں ایک شاندار کھانے کا اہتمام کیا۔ اس تقریب میں ڈاکٹر صاحب اور مختلف ممالک بشمول پاکستان سے آئے ہوئے وفود وغیرہ نے شرکت کی۔ اس موقع پر ڈاکٹر صاحب سے سب معزز شخصیات کا تعارف کروایا گیا اور خاص طور پر کراؤن پرنس سے ڈاکٹر صاحب کا تعارف ان الفاظ میں کروایا۔

This is Dr. Khan, the famous Dr. Khan, the one who has explodec the Nuclea Devices, the one who has blasted (fired) the Ghaur Missile.

تو کراؤن پرنس اتنے خوش ہوئے کہ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کا منہ چوما اور ڈاکٹر صاحب کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آئے۔ انہوں نے کہا "ہمیں آپ پر بہت فخر ہے اور جو آپ کا بم ہے وہ ہمارا بم ہے اور جو آپ کا میزائل ہے وہ ہمارا بھی ہے"۔ تعارف کے بعد لنچ ہوا جس میں کراؤن پرنس نے ڈاکٹر صاحب کو اپنے ساتھ بٹھایا اور وہاں پر ڈاکٹر صاحب کو وی آئی پی پروٹوکول دیا گیا۔

ریاض میں جب ہم بازار گئے تو مجھے ڈاکٹر صاحب کہنے لگے "میں نے یہاں سے کچھ چیزیں خریدنی ہیں"۔

مجھے ڈاکٹر صاحب کی بات سمجھ نہیں آئی کہ آخر ڈاکٹر صاحب نے ریاض سے کیا چیزیں لینی ہیں کیونکہ ڈاکٹر صاحب تو ہمیشہ مدینہ اور مکہ سے تسبیحیں' کھجوریں اور جائے نماز وغیرہ خریدتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے گائیڈ سے کہا کہ ہمیں بازار لے چلئے۔ جب ہم بازار پہنچے تو ڈاکٹر صاحب نے ایک دکان پر رکے دکاندار سے کہا کہ ہمیں وہ جبہ چاہیے جو مسجد کے امام عموماً پہنتے ہیں' جبے کا رنگ براؤن اور اس پر سنہری کڑھائی ہونی چاہیے۔

ہم نے کہا "آپ آخر یہ جبہ کس کے لئے خرید رہے ہیں؟"

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "میں جس مسجد میں نماز پڑھتا ہوں۔ موسم سرما میں وہاں کے امام کو میں نے سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے دیکھ کر یہ سوچا تھا کہ جب بھی میرا ملک سے باہر سعودی عرب جانا ہوا تو ان کے لئے بھاری سا جبہ لے کر آؤں گا"۔ یہ نومبر کا مہینہ تھا جس کے بعد دسمبر اور رمضان کے متبرک مہینے کا آغاز ہونا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف امام مسجد کے لئے بڑا قیمتی اور موٹا جبہ خریدا بلکہ مسجد کے موذن کے لئے بھی اسی طرح کا کالے رنگ کا جبہ خریدا۔ ڈاکٹر صاحب ہر ایک کا خیال رکھتے ہیں۔ بعض اوقات تو ہم حیران رہ جاتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب ہمیشہ یہ سب کچھ کیسے یاد رکھتے ہیں کہ انہوں نے کس کے لئے کیا چیز لینی ہے۔ ڈاکٹر صاحب جب بھی بیرون ملک جاتے ہیں تو اپنے سٹاف کے لئے تحفے تحائف لانا کبھی نہیں بھولے۔

فروری 2000ء میں ٹمبکٹو جانے کا ایک دفعہ پھر پروگرام بنا۔ میں بھی ڈاکٹر صاحب کا ہمسفر تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ سفر انتہائی یادگار اور دلفریب تھا خاص طور پر ٹمبکٹو میں دریائے نائجر کی سیر کا بہت لطف آیا۔ دریائے نائجر ٹمبکٹو شہر سے تقریباً 15 کلومیٹر دور ہے۔ جب ہم دریا پر پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ وہاں پر سیاحوں کے لئے باقاعدہ ڈیک وغیرہ بھی بنایا گیا ہے اور خوبصورت کشتیاں جن میں دریا کی مزے دار مچھلی کو پکانے کا بھی پورا انتظام ہوتا ہے موجود تھیں۔ ہم سب کشتی پر سوار ہوئے اور دریا کے اندر 12 کلومیٹر تک دور چلے گئے۔ اس دریا کی سب سے خاص بات یہ تھی کہ اس دریا میں ہپو پوٹامس بڑی تعداد میں موجود تھے۔ یہاں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا جس سے ڈاکٹر صاحب کی حسن ظرافت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اپنے قریب اتنے سارے ہپو پوٹامس تیرتے دیکھ کر ڈاکٹر خان نے مذاقاً فرمایا:

"کشتی کو قریب لے جا کر دیکھو کہ یہ ہپو پوٹامس اصلی ہیں یا نقلی۔ کیونکہ مجھے شک ہے کہیں سیاحوں کو خوش کرنے کے لئے مقامی لوگ ان کی کھالیں پہن کر تو نہیں بیٹھے ہوئے"۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ فقرہ جہاں ان کی ظرافت کی حس کو پیش کرتا ہے وہاں مقامی لوگوں کے بارے میں ان کے دقیق مشاہدے کی بھی عکاسی کرتا ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ ڈاکٹر صاحب کسی کو مصیبت میں گھرا ہوا نہیں دیکھ سکتے اور اس کی ہر ممکن مدد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ٹمبکٹو کے قدیم بازار کی سیر کے دوران بھی ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا کہ جب ڈاکٹر صاحب نے اپنی فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک غریب مقامی عورت کی مدد کی۔ ہوا یوں کہ بازار سے گزرتے ہوئے ہم نے ایک مقامی عورت کو چھوٹی چھوٹی مچھلیاں فرائی کرتے ہوئے دیکھا تو ڈاکٹر خان اس کے پاس رک گئے۔ انہوں نے فوراً ہی مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"اس عورت سے ساری مچھلیاں خرید لو"۔

مچھلیاں خریدنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے مجھے کہا:

"یہ مچھلیاں اس کے ساتھ ہی چھوٹے چھوٹے بچوں کے ہمراہ بیٹھی ہوئی اس عورت کو یہ کہہ کر دے دو کہ یہ تمہارے بچوں کے لئے تحفہ ہے"۔

وہ عورت بھنی ہوئی مچھلیاں لے کر اتنی خوش ہوئی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اسنے ڈاکٹر خان کو بہت دعائیں دیں۔

اسی طرح ایک دوسرا واقعہ اس وقت پیش آیا جب ہم ایک میڈیکل سٹور کے پاس سے گزر رہے تھے تو ہمارے گائیڈ عبدالرحمٰن نے جنرل چوہان جو پیشے کے اعتبار سے میڈیکل ڈاکٹر ہیں سے ایک خاص میڈیسن خریدنے کی فرمائش کردی جو بواسیر کے مرض میں استعمال کی جاتی ہے۔ جنرل صاحب نے ڈاکٹر خان کی جانب دیکھا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا:

"جنرل صاحب ہم اس کو چار یا پانچ ٹیوبیں خرید کر دے دیتے ہیں"۔ یہ سنتے ہی میں نے میڈیکل سٹور سے پانچ ٹیوبیں خرید کر عبدالرحمٰن کو دے دیں۔ گائیڈ نے ڈاکٹر صاحب کو بہت دعائیں دیں۔ ڈاکٹر خان نے عبدالرحمٰن کو کہا:

"تم پاکستان آؤ تو ہم تمہارا علاج کروائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب نے جنرل چوہان کی طرف اشارہ کر کے کہا یہ تمہارا علاج کریں گے"۔

عبدالرحمٰن نے ڈاکٹر صاحب کو بتایا کہ وہ ایک غریب آدمی ہے اس کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں ہیں کہ وہ بماکو جا کر اپنا آپریشن کروا سکے' دوائیاں لے سکے اور ہسپتال کا خرچ برداشت کر سکے تو وہ پاکستان جا کر کیسے اپنا علاج کروا سکتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ تم اس کی فکر نہ کرو تمہیں ٹکٹ بھی ملے گا' دوائیاں بھی ملیں گی' آپریشن بھی ہوگا اور تحفے بھی ملیں گے۔

کچھ عرصے بعد عبدالرحمٰن نے پاکستان آنے کا پروگرام بنایا۔ آنے سے پہلے اس نے فون پر ڈاکٹر خان سے بات کی کہ وہ آنا چاہتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فوراً ہینک (Henk) ہینک کو فون کر کے انہیں عبدالرحمٰن کو ٹکٹ بھجوانے کے لئے کہا۔ ہینک ہمارے دوست ہیں وہ ہالینڈ میں رہائش پذیر ہیں انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے کہنے پر فوراً ہی عبدالرحمٰن کو ریٹرن ٹکٹ بھجوا دی۔ جب عبدالرحمٰن بماکو پہنچا تو طاہر (دبئی میں ہمارے دوست) نے اسے بماکو میں دوبئی کا ویزہ بذریعہ فیکس بھجوا دیا۔ جب وہ دوبئی پہنچا تو طاہر کے آدمی نے اس کا استقبال کیا۔ اس نے دوبئی میں ایک دو دن قیام کیا۔ اس دوران طاہر نے اسے پاکستان کے لئے ویزہ لگوا کے دیا اس طرح وہ پاکستان آگیا۔ پاکستان پہنچ کر دو تین دن اس کے ٹیسٹ ہوئے اس کے بعد KRL کے ہسپتال میں اس کا آپریشن ہوا۔ ہسپتال میں جو کمرہ چیئرمین کے لئے ریزرو ہوتا ہے' مہمان کو اسی کمرے میں ٹھہرایا گیا۔ تین چار دن ہسپتال میں رہنے کے بعد وہ گیسٹ ہاؤس میں منتقل ہو گیا۔ میں اکثر اس کی تیمارداری کے لئے جاتا تو اس سے خوب گپ شپ ہوتی۔ وہ ڈاکٹر صاحب کو بہت دعائیں دیتا۔ میں جب بھی اس کے کمرے میں جاتا تو وہ مصلے پہ بیٹھا عبادت میں مصروف نظر آتا۔ وہ کبھی تسبیح پھیرنے میں مصروف ہوتا' کبھی قرآن مجید اور کبھی نماز پڑھ رہا ہوتا۔ وہ ڈاکٹر صاحب کی درازی عمر اور صحت کے لئے دعائیں کرتا اور اکثر کہتا کہ خدا نے ڈاکٹر خان کو میرا وسیلہ بنایا اور میں پاکستان پہنچ گیا۔

جب وہ جانے لگا تو ڈاکٹر صاحب نے اسے اس کی بیوی' بچوں اور دوستوں کے لئے بے شمار تحفے دیئے۔ جب وہ پاکستان آیا تھا تو صرف ایک چھوٹا سا بیگ لایا تھا لیکن جاتے وقت اس کے پاس سامان سے بھرے ہوئے تین سوٹ کیس' چار بیگ اور ایک ویلر تھا۔ ڈاکٹر خان اس پر بہت مہربان تھے وہ کہتے تھے کہ "غریب آدمی ہے اس کی بیوی' بچوں' ہمسائیوں' جاننے والوں کے علاوہ ان لوگوں کے لئے بھی کچھ تحفے بھیج دیتے ہیں جو اس ہوٹل میں کام کرتے تھے جہاں ہم ٹھہرے تھے۔ کمشنر اور پولیس والوں کے لئے بھی کچھ نہ کچھ بھیج دو کیونکہ وہ غریب لوگ ہیں ان کی مدد کرنی چاہیے"

عبدالرحمٰن بہت خوش قسمت تھا کہ اس کا ناکرہ ڈاکٹر خان سے ہو گیا جنہوں نے اس کی مدد کے لئے اپنے تمام مخیر حضرات دوستوں' صدیقی صاحب' طاہر' ہینک' کیپٹن غوث چوہدری وغیرہ سے رابطہ کیا اور یہ فیصلہ کیا کہ ٹمبکٹو میں اسے ایک نیا ہوٹل تعمیر کر کے دیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب کے تمام دوستوں نے اس کی بڑی مدد کی اور ہوٹل کے نقشے وغیرہ تیار ہونے کے بعد اس کی تعمیر کا کام اپنے آخری مراحل میں پہنچ چکا ہے۔ ہوٹل کے لئے فرنیچر خریدا جا چکا ہے اور بجلی اور سینیٹری کا کام بھی مکمل ہو چکا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے خیال میں عبدالرحمٰن ایک جرأت مند شخص ہے جس میں مشکل فیصلہ کرنے کی قوت بھی بدرجہ اتم

موجود ہے' اس نے اپنے خرچ پر ٹمبکٹو سے ہما کو آنے کا رسک لیا' یہ جانے بغیر کہ ہم کون ہیں اور اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے' دوبئی پہنچنے پر اسے ویزہ ملے گا بھی یا نہیں' وہ پاکستان پہنچا۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ اس خوبی کی وجہ سے اللہ تعالی نے اس کی دعا سن لی ہے اور اب ہم اس کو ہوٹل بنا دیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ہر ایک سے پیسے لے کر اسے بجھوا رہے ہیں اور اس کے ہوٹل کی ہر چیز یہاں سے جا رہی ہے۔ وہ اپنے ہوٹل کا افتتاح ڈاکٹر خان کے ہاتھوں کروانا چاہتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس ہوٹل کا نام اپنی بیگم کے نام پر ہینڈرینا خان ہوٹل رکھا ہے۔ مسز خان کا بھی یہ پروگرام ہے کہ جب یہ ہوٹل تیار ہو جائے گا تو وہ بھی اسے دیکھنے جائیں گی۔

میں نے ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ چوتھا عمرہ اکتوبر 2000ء میں کیا تھا۔ ہوا یوں کہ اسلامی ترقیاتی بنک نے 2000ء کے شروع میں ایک پینل IDB ایڈوائزری پینل آن سائنس اینڈ ٹیکنالوجی بنایا۔ چونکہ اسلامی ترقیاتی بنک نے ڈاکٹر صاحب کو بھی اس کا ممبر بنایا۔ اس لئے بینک نے اکتوبر 2000ء میں ڈاکٹر صاحب اور تمام ممبران کو میٹنگ کے لئے جدہ بلایا۔ ڈاکٹر صاحب کے پہنچنے پر اسلامی ترقیاتی بنک کے صدر ڈاکٹر احمد محمد علی نے ڈاکٹر صاحب کا استقبال کیا۔ میں نے اس میٹنگ میں بطور آبزرور شرکت کی۔ سب سے پہلے بینک کے نائب صدر نے خطاب کیا اور کہا کہ پینل کے اس پہلے اجلاس میں ہم نے چیئرمین کا انتخاب کرنا ہے۔ اجلاس میں پاکستان کے وزیر برائے سائنس ٹیکنالوجی ڈاکٹر عطاء الرحمٰن بھی موجود تھے۔ اسلامک ڈویلپمنٹ بنک کے صدر ڈاکٹر احمد محمد علی اور پوری اسلامی امہ سے آئے ہوئے کئی سینئر وفود جو اجلاس میں شرکت کر رہے تھے سب نے مل کر متفقہ طور پر ڈاکٹر خان صاحب کو اس میٹنگ کا چیئرمین نامزد کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے بڑے احسن طریقے سے اجلاس کی صدارت کی۔ میں نے ایک بات جو شدت سے محسوس کی وہ ڈاکٹر صاحب کی انکساری' عاجزی' سادگی' ان کا اخلاق جس میں کسی قسم کی بھی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ پروفیسر عطاء الرحمٰن صاحب کے ساتھ اور دوسرے لوگوں کے ساتھ بڑی عاجزی کے ساتھ بات کر رہے تھے اور ہر ایک کی بات کا جواب مسکرا کر دے رہے تھے۔ میں یقین سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ اللہ تعالی نے جس طرح ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو اس دنیا میں عزت و توقیر سے نوازا ہے یہ اگر کسی دوسرے شخص کے حصے میں آتی تو اس کی شخصیت کے ہر پہلو میں رعونت اور مغروریت کے اثرات نمایاں ہوتے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب میں بال برابر بھی غرور کا عنصر نہیں پایا جاتا۔ میں سمجھتا ہوں یہ وہ خصوصیات ہیں جو ڈاکٹر صاحب کو دیگر تمام شخصیات میں ممتاز کرتی ہے۔

میٹنگ کے بعد ہم ہوٹل میں واپس آ گئے۔ نہا کر ہم تازہ دم ہوئے اور 17 اکتوبر 2000ء کو شام 5 بجے عمرہ کے لئے روانہ ہوئے۔ ہم ہمیشہ جدہ کے کسی ہوٹل میں ٹھہرتے ہیں۔ جب بھی ہم ڈاکٹر صاحب کے ساتھ عمرہ کے لئے جاتے تو ڈاکٹر صاحب ہم کو یہی ہدایات دیتے تھے کہ ہم نے سب سے پہلے طواف کرنا ہے اس کے بعد نماز پڑھنی ہے اور صفا و مروا کی سعی کرنے کے بعد واپس آ کر نفل پڑھ کر رخصت ہو جانا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ہر کام کے لئے وقت مقرر کیا ہوتا تھا یہی وجہ تھی کہ ہم ان تمام فرائض سے تقریباً 2 گھنٹے میں فارغ ہو جاتے تھے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ڈاکٹر صاحب اتنے اچھے منتظم ہیں کہ جہاں بھی جائیں پہلے سے ہی تمام کاموں کو آرگنائز کر لیتے ہیں اور ہر کام پلاننگ کے تحت کرنے کے عادی ہیں۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ چار عمرے کئے ہیں اور ان چاروں عمروں میں ڈاکٹر صاحب نے تمام فرائض وقت مقررہ پر ادا کئے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے آج تک جس کام کا بیڑا بھی اٹھایا ہے اس کو کامیابی کے ساتھ بروقت مکمل کیا ہے۔

پچھلے تین عمروں کی طرح اس عمرے پر بھی وہی کیفیت تھی۔ لوگوں نے ڈاکٹر صاحب کو دیکھتے ہی انہیں اپنے گھیرے میں لے لیا' وہ ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ چوم رہے تھے' انہیں دعائیں دے رہے تھے اور ان سے آٹوگراف لے رہے تھے۔

اس دفعہ ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا کہ جب ہم صفا و مروا کے درمیان سعی کر رہے تھے تو ایک شخص نے ڈاکٹر صاحب کو سلام کیا اس کے ساتھ اس کی بیوی بھی تھی۔ اس نے بھی ڈاکٹر صاحب کو سلام کیا۔ وہ بھی صفا و مروہ کا چکر لگا رہے تھے۔ پھر ہم نے خانہ کعبہ کے پاس کھڑے ہو کر نوافل ادا کئے۔ عمرہ کے فرائض سے فارغ ہو کر جب ہم باہر نکلے تو میں نے دیکھا کہ اسی عورت نے ہاتھ میں آٹوگراف کی کتاب پکڑی ہوئی ہے اور تیزی سے ڈاکٹر صاحب کی جانب آ رہی ہے۔ قریب آ کر اس نے ہمیں بتایا کہ اس نے جلدی جلدی اپنا عمرہ مکمل کیا اور بھاگی بھاگی اپنے ہوٹل کے کمرے میں گئی اور وہاں سے یہ کتاب ڈاکٹر صاحب کے آٹوگراف لینے کے لئے لائی ہے۔ اس نے بھی ڈاکٹر صاحب کو بہت دعائیں دیں۔ اس موقع پر ڈاکٹر صاحب نے لوگوں کو یقین دلایا کہ غوری اور نیوکلیئر دھماکوں کی کامیابی میں آپ سب کی دعائیں ہمارے ساتھ تھیں جس کی وجہ ہماری محنتیں رنگ لائیں۔ لوگ ڈاکٹر صاحب کی انکساری اور اخلاق سے اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ ان سے ملاقات کرنیکے بعد وہ اکثر یہ کہتے دکھائی دیتے ہیں کہ یہ شخص عام زندگی میں کتنا سادہ اور خوش اخلاق ہے یقین نہیں آتا کہ یہ وہی شخص ہے جو ہمارے ایٹمی پروگرام کا خالق ہے۔ یہ کہنے کے بعد ان کے دل سے ڈاکٹر صاحب کے لئے دعائیں نکلتی ہیں۔

میں اکثر یہ سوچتا تھا کہ کہوٹہ جیسے حساس پراجیکٹ کی منظوری' جدید لیبارٹریوں کا قیام بین الاقوامی پابندی کے باوجود بیرونی ممالک سے حساس اور اہم پرزہ جات کی درآمد اور ان کی تنصیب کا مرحلہ' خواندگی کی شرمناک صورتحال' فنی ماہرین وسٹاف اور متعلقہ فیلڈ میں پی ایچ ڈی انجینئر اور سائنسدانوں کی عدم دستیابی ...... یہ تمام مشکل کام نامساعد حالات میں کیونکر ممکن ہو سکے؟ اور پھر غوری کا کامیاب تجربہ اور کامیاب ایٹمی دھماکے یہ سب مراحل کیسے طے ہو گئے؟ لیکن جب میں نے ڈاکٹر خان کی شخصیت کو قریب سے دیکھا تو مجھے ان سب سوالوں کے جواب مل گئے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ وہ تن تنہا سب پر بھاری ہیں۔ وہ یقیناً کرشمہ ساز خوبیوں کے مالک ہیں۔ وہ ایسے منتظم اعلی ہیں کہ جو اپنی مستقل مزاجی' نیک نیتی' پابندیٔ وقت' کام کرنے کی لگن' محنت اور سب سے بڑھ کر اپنی قوت فیصلہ سے ہر مشکل سے مشکل کام کو آسان بنانے میں مہارت رکھتے ہیں۔ وہ جس منصوبے میں شامل ہو جاتے ہیں اسے دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ جیسے اسے پر لگ گئے ہوں' مہینوں کا کام دنوں میں اور دنوں کا کام چند گھنٹوں میں ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ آج کا کام آج ہی کرنے کے عادی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دفتر میں داخل ہونے والی کوئی بھی فائل 5 یا 10 منٹ سے زیادہ ان کی میز پر نہیں رہتی۔ میں اکثر ڈاکٹر صاحب کو ایک ایسے ساحر سے تشبیہہ دیتا ہوں جو اپنی صلاحیتوں سے ہر منصوبے میں ایسی روح پھونک دیتے ہیں کہ جو منصوبہ سالوں میں مکمل ہونا ہوتا ہے وہ چند مہینوں میں اپنے تکمیل کے مراحل سے گزر جاتا ہے۔ کہوٹہ اور جی آئی کے انسٹی ٹیوٹ وغیرہ اس کی واضح مثالیں ہیں۔ ہم سب کو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ جس نے ہمیں ڈاکٹر خان جیسی شخصیت سے نوازا۔ اللہ انہیں صحت کلی عطا کرے اور ان کا سایہ ہم پر ہمیشہ قائم رکھے۔ (آمین)

کے۔آر۔ایل کے پراجیکٹس

دفاعی و تعلیمی منصوبے

فرانس کے صدر جنرل ڈیگال سے جب دریافت کیا گیا کہ امریکہ، برطانیہ، اور نیٹو کی ایٹمی چھتری کی موجودگی میں فرانس کا ایٹمی پروگرام شروع کرنے کا کیا فائدہ ہے تو انہوں نے برجستہ کہا تھا جوہری پروگرام سے آپ کو جو تکنیکی مہارت حاصل ہوتی ہے اس کی وجہ سے آپ عالمی منڈی میں ہزارہا طریقوں سے مقابلہ کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ہمارا ایٹمی پروگرام بھی اپنے قومی دفاع کے شعبے میں خودکفالت حاصل کرنے میں انتہائی مفید ثابت ہوا۔ کے۔آر۔ایل نے ملکی دفاعی اہلیت کو بڑھانے کیلئے انتہائی جدید ترین ہتھیاروں کے نظام تیار کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہم نے تمام مراحل کے دوران مختلف قسم کی ٹیکنالوجیز میں جو مہارت حاصل کی تھی انکی وجہ سے ہم نے قومی اہمیت کے کئی دفاعی منصوبے شروع کئے۔ہم نے نہ صرف جدید ترین ہتھیار تیار کرنے کے شعبے میں خود کفالت حاصل کی بلکہ اس سے ہمیں بھاری زرمبادلہ بچانے میں بھی مدد ملی۔

اس سلسلے میں اس ادارے میں زبردست تحقیقی کام ہو رہا ہے جس کا مقصد اپنی بہادر فوج کو جدید ترین روائتی ہتھیاروں سے لیس کرنا ہے ذیل میں ان مختلف حربی نظاموں کے بارے میں بتاؤں گا جو ہم نے اپنے اصل کام یعنی یورینیم کی افزودگی کے علاوہ تیار کئے ہیں۔

غوری میزائل

غوری زمین سے زمین تک مار کرنے والا بیلسٹک میزائل ہے جسے موبائل لانچنگ سسٹم کے ذریعے چھوڑا جاتا ہے۔ اس میزائل سے دشمن کے میزائل لانچنگ اور کمانڈ کمیونی کیشن کے علاقوں، فوجی ٹھکانوں اور ان کے زیر استعمال ائر پورٹوں، صنعتی پلانٹوں اور اقتصادی، سیاسی، سائنسی اور ٹیکنالوجیکل مراکز کو نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔

غوری میزائل کی تکنیکی ساخت

زمین سے زمین تک مار کرنے والے پاکستان کے پہلے درمیانی رینج کے بیلسٹک میزائل غوری میں مائع ایندھن استعمال کیا جا سکتا ہے۔اس کی دیگر اہم معلومات درج ذیل ہیں۔

پے لوڈ (وارہیڈ)	۱۰۰۰ کلوگرام
میزائل کی لمبائی	۱۶ میٹر
مجموعی وزن	۱۶ ٹن
انجن فیول کا وزن	۱۴ ٹن

نوٹ:

غوری ون کا کامیاب تجربہ ۶ اپریل ۱۹۹۸ء کو کیا گیا جس کی زیادہ سے زیادہ رینج ۱۵۰۰ کلومیٹر ہے۔
غوری ٹو کا کامیاب تجربہ ۱۴ اپریل ۱۹۹۹ء کو کیا گیا۔اسکی زیادہ سے زیادہ رینج دو ہزار کلومیٹر ہے۔

غوری میزائل کی ساخت

غوری مندرجہ ذیل حصوں پر مشتمل ہے۔

۱۔ فیوزلاج

جو مزید ان حصوں پر مشتمل ہے۔

(ا) پرزہ جات
(ب) آکسی ڈائزر ٹینک سیکشن
(ج) فیول ٹینک سیکشن
(د) ٹیل (Tail) سیکشن

۲۔ کنٹرول سسٹم (Cs)

جو ان حصوں پر مشتمل ہے۔

(ا) آٹومیٹک سٹیل آرزیشن سسٹم
(ب) آٹومیٹک رینج کنٹرول سسٹم
(ج) سوئچ گیئر
(د) الیکٹریکل اکیوپمنٹ

۳۔ وارہیڈ سسٹم

(ا) وارہیڈ
(ب) سیپریشن اینڈ سٹیبلائزیشن

۴۔ ایل۔پی۔آر۔ای (LPRE)
مائع پروپیلنٹ راکٹ انجن

۵۔ ائیر فیول سسٹم

۶۔ میزائل ایمرجنسی ڈسٹرکشن سسٹم (MEDS)

عنزہ زمین سے فضاء تک مار کرنے والا گائیڈڈ میزائل

کے۔آر۔ایل نے بین الاقوامی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں اور بھارت کی میزائل ٹیکنالوجی سے علاقے کو درپیش شدید خطرات کے پیش نظر میزائل ٹیکنالوجی کے شعبے میں بھی سرگرمی کا مظاہرہ کیا۔مختلف اقسام کے عنزہ میزائلوں کی تیاری اس شعبے میں ہماری محنت کا ثبوت ہے۔اس میزائل کا نام حضرت محمد ﷺ کے نیزے کے نام پر رکھا گیا ہے یہ زمین سے فضا تک مار کرنے والے تین مختلف اقسام کے میزائل ہیں۔

عنزہ ایم کے ون

عنزہ ایم کے ون آسانی سے منتقل کیا جانے والا میزائل ہے جسے ایک آدمی کاندھے پر رکھ کر چلا سکتا ہے۔اپنے ہدف تک ٹھیک ٹھیک پہنچنے والا لیزر رینج میزائل ہے۔یہ میزائل جنوری ۱۹۹۰ء میں فوج کے حوالے کیا گیا اور اس کے زیر استعمال ہے اور کے۔آر۔ایل میں تیار کیا جا رہا ہے۔یہ انتہائی قابل اعتماد ہے وزن میں ہلکا اور آسانی سے ادھر ادھر لے جایا جا سکتا ہے۔عنزہ ایم کے ون میں برقی میکانکی فیوز نصب ہے جو وارہیڈ کو از خود انگیخت کر سکتا ہے۔اسے خودکار طریقے سے بھی چلایا جا سکتا ہے اور یہ چار ہزار دو سو میٹر تک مار کر سکتا ہے۔

عنزہ ایم کے ٹو

عنزہ ایم کے ٹو، عنزہ ایم کے ون کی بدلی ہوئی لیکن بہتر صورت ہے۔جس میں پائی جانے والی خوبیاں پہلے کے مقابلے میں زیادہ ہیں۔عنزہ ایم کے ٹو کی پہلی کھیپ ستمبر ۱۹۹۴ء میں پاک فوج کے حوالے کی گئی جبکہ بڑے پیمانے پر تیاری کا کام اکتوبر ۱۹۹۴ء میں شروع کیا گیا۔اس میزائل کا مقابلہ زمین سے فضا تک مار کرنے والے تمام جدید ترین میزائلوں سے کیا جا سکتا ہے۔تاہم ایم کے ون کے مقابلے میں اس کی رفتار زیادہ ہے یعنی M/SEV 600 انتہائی نتیجہ خیز ہے۔یہ پانچ ہزار میٹر تک مار کر سکتا ہے۔

بکتر شکن اینٹی ٹینک میزائل

بکتر شکن، ٹینک شکن میزائل کی دوسری قسم ہے جو شعاعوں رینج کے ذریعے خود پیدا کردہ اور فاصلے سے دیئے جانے والے رہنما سگنل کے ذریعے ہدف تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس میں دشمن کے علاقے میں اندر تک مار کرنے اور جام کئے جانے سے محفوظ رہنے کی بے پناہ صلاحیت ہے۔یہ آسانی سے چلایا جا سکتا ہے اور یہ تین ہزار میٹر کے فاصلے سے ہر قسم کے ٹینک کو تباہ کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

بارودی سرنگیں صاف کرنے کے مائن چارجر

بارودی سرنگیں صاف کرنے والے یہ چارجر تین مختلف رینج کے ہیں:

ایم ایس ایس ایل 80 ایم ایس ایس ایل 125 اور ایم ایس ایس ایل 250 ...... یہ چارجز لائن چارج موٹر راکٹ ڈی سی بیٹری اور دوسرے اجزاء پر مشتمل ہوتے ہیں۔انہیں راکٹ موٹر کے ذریعے بارودی سرنگوں کے علاقے میں پھینکا جاتا ہے اور متعلقہ علاقے میں گرنے کے چند سیکنڈ بعد فاصلاتی برقی ذرات کے ذریعے ڈیٹونیٹ کیا جاتا ہے انہیں بارودی سرنگوں کے کسی بھی علاقے میں مخصوص حدود میں بارودی سرنگیں صاف کرنے کیلئے استعمال کیا جاتا ہے جس سے فوجی وہاں سے بحفاظت گزر جاتے ہیں۔

ملٹی بیرل راکٹ لانچر

اس کا قطر 132.4 ملی میٹر ہے اور اسے پردار راکٹ پھینکنے کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔جو ۲۵ کلومیٹر تک مار کر سکتے ہیں۔یہ لانچر گاڑی میں بھی نصب کیا جا سکتا ہے اور اسے گاڑی کے ذریعے بھی کھینچا جا سکتا ہے۔اس کا رخ ۱۸۰ درجے تک بدلا جا سکتا ہے۔جس سے ہدف کو جا لینے کی صلاحیت بہت بڑھ جاتی ہے۔اس میں بیرل کی تعداد تیس تک ہوتی ہے جنہیں تین لائنوں میں پانچ پانچ کی تعداد میں رکھا جاتا ہے۔اس کے ذریعے گاڑی کے اندر سے ایک راکٹ یا ایک سے زیادہ راکٹ فائر کئے جا سکتے ہیں۔تاہم ساٹھ میٹر تک گاڑی میں ایک تار سے منسلک ریموٹ کنٹرول یونٹ کی مدد سے راکٹ فائر کیا جا سکتا ہے۔

لیزر رینج فائنڈر

کے آر ایل میں ہمارے سائنس دانوں اور انجینئروں کی مشترکہ کوششوں سے ایک آلہ بنایا ہے جو محاذ پر دشمن کی نقل و حرکت کا ٹھیک ٹھیک تعین کرنے اور سراغ لگانے کیلئے بہت مفید آلہ ہے۔اس کی رینج بیس کلومیٹر سے زیادہ ہے۔

کیمیائی توانائی پر مبنی بکتر بند گاڑی

یہ بکتر بند گاڑی توانائی کے استعمال کی بنیاد پر تیار کی گئی ہے جو بہت کم وقت میں انتہائی تیز رفتاری سے توانائی خارج کرتے ہوئے حملہ آور ہتھیاروں کا بخوبی مقابلہ کرسکتی ہے۔ گاڑی تین مختلف سائز میں تیار کرلی گئی ہے جو کیمیائی توانائی کے استعمال کے ذریعے انتہائی جدید قسم کے ہتھیاروں کا مؤثر طریقے سے مقابلہ کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔ اشارہ ملتے ہی اس کی دھماکہ خیز شیٹ جو کہ دو آرمر پلیٹ پر بنی ہوئی ہے اور جس میں دھماکہ خیز مادہ زیادہ ہوتا ہے چارج ہوجاتی ہے اور جب انتہائی تیز رفتاری سے چلنے والے جیٹ کو چلایا جاتا ہے تو دھات کی پلیٹیں اور یہ حرکت پذیر پلیٹس آنے والے ہتھیار کو غیر مؤثر بنا دیتی ہیں اور اس طرح وہ بکتر بند گاڑی میں داخل نہیں ہوسکتا۔ اس بات کی بھرپور کوشش کی گئی ہے کہ اس بکتر بند گاڑی میں جو دھماکہ خیز مواد استعمال ہوتا ہے وہ حادثاتی طور پر چارج نہ ہوجائے مثلاً کوئی چھوٹا ہتھیار گولہ۔

کے۔ ار۔ایل میں اعلیٰ تعلیم اور تحقیق کو سبقت

ایک اور شعبہ جس کی طرف ڈاکٹر اے کیو خان نے خاص توجہ دی اور جو ان کی ترجیحات میں شامل رہا ہے وہ ملک میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ایک ٹھوس بنیاد قائم کرنا ہے۔ یہ حقیقت ناقابل تردید ہے کہ آج کے دور میں معیشت کے فروغ مضبوط دفاع اور توسیع پذیر سماجی شعبے کیلئے ٹیکنالوجی کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ کیونکہ دور حاضر میں ترقی سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبے میں ٹھوس بنیادی سہولتوں کا دوسرا نام ہے۔ ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ملکوں کے درمیان پایا جانے والا فرق اور امتیاز اس کا شاہد ہے کہ ان دونوں میں جو فرق ہے وہ ان کی سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں صلاحیتوں کی وجہ ہے۔ اگر اس زاویے سے دیکھا جائے تو یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ پچاس سال سے زائد عرصہ گزر جانے کے باوجود پاکستان میں تحقیق و ترقی کا شعبہ انتہائی خام حالت میں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مغربی دنیا ہم پر غیر ضروری دباؤ ڈالتی ہے۔ یہ ایک ایسی صورتحال ہے جو کسی بھی باوقار اور خودمختار ملک کے لئے ناقابل قبول ہے۔ خودمختاری کو ہر حال میں حتمی حیثیت حاصل ہے۔ خواہ وہ سیاست کا شعبہ ہو یا ٹیکنالوجی کے حصول کا جائز حق لیکن ڈاکٹر خان سے بہتر کون شخص جانتا ہوگا کہ جب کوئی شخص اپنا حق استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے راستے میں کیسی کیسی رکاوٹیں کھڑی کر دی جاتی ہیں۔ خودمختاری اور آزادی کا یہی احساس ہے جس کی وجہ سے انہوں نے ہمیشہ اپنے ان باصلاحیت اور ہونہار سائنس دانوں' ٹیکنالوجی کے ماہرین اور انجینئروں کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ آگے آئیں اور قومی وقار کی اس مقدس جنگ میں اپنا کردار ادا کریں۔ Advance میٹیریلز سائنس کا ایک ایسا پیچیدہ شعبہ ہے جسے شاید دوسرے شعبوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اس موضوع پر پہلا سمپوزیم ۱۹۸۹ء میں ہوا جو اب ہر دو سال بعد کے۔آر۔ایل میں ہوتا ہے۔ اب تک متعدد سمپوزیم ہو چکے ہیں۔ ہر سمپوزیم میں دنیا بھر کے بہترین سائنس دانوں، دھات کاری کے ماہرین اور انجینئروں نے بڑی تعداد میں شرکت کی اب تک ہم آسٹریا، بیلجیم، بحرین، چین، فن لینڈ، جرمنی، بھارت، ایران، اٹلی، جاپان، اردن، قازقستان، ملائیشیا، میکسیکو، روس، سعودی عرب، سپین، سویڈن، برطانیہ، ازبکستان اور ویسٹ انڈیز کے بہترین سائنس دانوں، دھات کاری کے ماہرین اور انجینیروں کی میزبانی کا شرف حاصل کرچکے ہیں جب کہ بڑی تعداد میں مقامی سائنس دان اور انجینئر اس کے علاوہ ہیں۔

میگنیٹس اور مقناطیسی مواد پر ورکشاپ

یہ ورکشاپ ۱۹۹۴ء میں ہوئی اور اس کی وجہ سے ملکی سائنس دانوں کو میگنیٹس اور مقناطیسی مواد جیسے اہم شعبے کی طرف متوجہ کرنے میں زبردست کامیابی ہوئی تھی اگرچہ میگنیٹس اور مقناطیسی مواد حجم کے اعتبار سے تو اہم نا پ نہیں ہے لیکن روایتی اور ایڈوانسڈ انجینئرنگ کے استعمال میں حد سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ میگنیٹ امکانی توانائی کا مستقل ذریعہ اور الیکٹرو انڈسٹری کیلئے بہت مفید اور ناگزیر مواد ہے۔ بحیثیت مقناطیسی مواد یہ موٹروں، جنریٹروں، لفٹرز، کیبل پر چلنے والی گاڑیوں، مائیکرو ویو ٹیوب ٹرانسفارمر اور مقناطیسی Sensors کی تیاری میں استعمال ہوتا ہے۔

سوفٹ وئیر کے بارے میں کل پاکستان مقابلے اور نمائشیں

آج کل سائنس کے شعبے میں پیشہ ورانہ کمپیوٹرز کی اہمیت اور کردار بڑھتا جارہا ہے۔ اس لئے مختلف قسم کے سوفٹ وئیرز کی مانگ بھی بڑھتی جارہی ہے۔ اس وجہ سے ہمیشہ یہ تمنا رہی ہے کہ سوفٹ وئیر تیار کرنے کی مقامی صنعت کی حوصلہ افزائی کی جائے تا کہ نہ صرف قیمتی زرمبادلہ بچایا جا سکے بلکہ ملکی طور پر سوفٹ وئیر کی عالمی منڈی میں سبقت حاصل کی جائے۔ اس لئے ملک میں سوفٹ وئیر پیکج تیار کرنے کے مقصد کے پیش نظر کے آر ایل پچھلے سات سال سے سوفٹ وئیر کی اس منفرد نمائش کا اہتمام کررہی ہے۔ اس عرصے میں پیشہ ورانہ اور مختلف درجوں میں پڑھنے والے طالب علموں کی دلچسپی کی وجہ سے ان سوفٹ وئیرز کی نمائش میں حصہ لینے والوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ یکے بعد دیگرے ہونے والی نمائشوں میں جو سوفٹ وئیر رکھے گئے ان کا معیار بھی بہتر ہوتا جارہا ہے۔

پاور الیکٹرونک اور OPTO الیکٹرونکس کے بارے میں قومی سیمینار

یہ سیمینار پہلی بار ۱۸ جون ۱۹۹۶ء کو ہوا تھا جس میں بڑی تعداد میں متعلقہ لوگوں نے شرکت کی اور کے آر ایل کیلئے یہ سیمینار بھی ایک نیا سنگ میل ثابت ہوا جو اس کیلئے ایک اعزاز کا باعث بنا۔

ویکیوم ٹیکنالوجی پر کورس کا اہتمام

ویکیوم ٹیکنالوجی کی بڑھتی ہوئی ضرورت کے پیش نظر کے۔آر۔ایل نے ۵۔۱۹ اکتوبر ۱۹۹۷ء میں پانچ روزہ کورس کا اہتمام کیا۔ کورس کا مقصد یہ تھا کہ ویکیوم ٹیکنیکس کے بارے میں تھیوری اور عملی دونوں طریقوں کے ذریعے معلومات بہم پہنچائی جائیں۔ کورس میں ویکیوم ٹیکنالوجی کے رہنما اصولوں کو سمجھانے کی طرف زیادہ تر توجہ دی گئی تا کہ ویکیوم سسٹم میں درپیش آنے والی مشکلات پر قابو پایا جا سکے۔ ویکیوم سسٹم کی ڈیزائننگ کیلئے گائڈ لائن فراہم کی جا سکے اور خاص طور پر کورس میں شرکت کرنے والوں کی ماہرین کے ساتھ اس ضمن میں درپیش مشکلات کو ڈسکس کرنے کا موقع مل سکے۔ پاکستان کی سائنسی برادری نے اس کورس کی بہت پذیرائی کی جو اس کی کامیابی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

دیگر منصوبے

کے۔آر۔ایل میں سوچنے سمجھنے والے لوگوں یعنی تھنک ٹینک کے پاس نظریات اور اعلیٰ خیالات کی کبھی کمی نہیں رہی اور جب کبھی یہ ادارہ تحقیقی اجتماعات کا اہتمام کرتا ہے تو کے۔آر۔ایل کے سائنس دان ہمیشہ صف اول میں پائے جاتے ہیں۔ درج بالا کوششوں کے علاوہ کے۔آر۔ایل کئی مذاکروں، مباحثوں کا اہتمام کرے گا جن میں روٹری مشینری میں ارتعاشات کے موضوع پر قومی کانفرنس اور مرحلہ وار تبدیلیوں کے موضوع پر بین الاقوامی کانفرنس جیسے اجتماعات شامل ہوں گے۔ ان کا مقصد متعلقہ یہ ہے کہ شعبوں میں کام کرنے والے لوگوں کو آئے دن جو سوالات پیش آتے ہیں' انکا انہیں تسلی بخش جواب دیا جا سکے اس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ کے۔آر۔ایل میں متعلقہ لوگ ہمیشہ تحقیق میں مصروف رہتے ہیں۔

کے ار ایل کھیل کے میدان میں

کھیل اور سائنس میں بظاہر کوئی رابطہ نہیں۔ تجربات و تجزیات میں گھرے سائنس دان سے عام طور پر ایسی توقع رکھنا خام خیالی ہی تصور کیا جاتا ہے کہ وہ کھیل کے میدان میں بھی ویسا ہی چابک دست ہوگا جیسا اپنی تجربہ گاہ میں۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے اس تاثر کو غلط ثابت کردیا یہ انکی ایک ایسی خاصیت ہے جو نہ صرف ڈاکٹر خان کی شخصیت کو ہمہ جہت بناتی ہے بلکہ ان کا وہ جامع تاثر بھی ابھارتی ہے جو انہیں اپنے ہم عصروں میں نمایاں کردیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کرکٹ ورلڈ کپ کے موقع پر ڈاکٹر خان کو ایک میچ میں بطور مہمان خصوصی مدعو کیا گیا تو جوان سال تماشائیوں کا جوش وخروش دیدنی تھا۔ انکے لئے یہ امر ازحد مسرت کا باعث تھا کہ ان کا ہر دلعزیز اور آئیڈیل ڈاکٹر خان محض آہنی ڈھال ہی نہیں بلکہ حلقہ یاراں میں بہت منکسر المزاج بھی ہیں۔

کھیل کا میدان ان کیلئے ہمیشہ ویسی ہی کشش رکھے رہا ہے جیسی کشش وہ اپنی لائبریری یا لیبارٹری میں پاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب عام انسانی نظر سے دور کہوٹہ کے ویرانے آباد ہو رہے تھے اور کے۔آر۔ایل کی ابتدائی عمارت کی تعمیر ہو رہی تھی تو ان ہی اولین ڈھانچوں میں ایک ڈھانچہ اس مہمان خانے کا بھی تھا جسے سپورٹس کلب کی حیثیت حاصل تھی۔ یہاں سکواش، والی بال، ٹینس اور بیڈمنٹن کے کورٹس سے لے کر ایک جاذب نظر سوئمنگ پول تک ہر سہولت فراہم کی گئی تھی۔ ایسا سب محض تفریح طبع کیلئے نہیں تھا بلکہ اس کے پیش نظر ایک بہت اہم مقصد کار فرما تھا۔ جسمانی محنت سے لے کر ذہنی آزمائش تک مشقت بھلے کیسی ہی اہم کیوں نہ ہو یہ ذہنی آسودگی اور اطمینان قلب کے بغیر نتائج کی حامل نہیں ہوسکتی اور یہ اہم کلب یقیناً ڈاکٹر خان کی نظروں سے اوجھل نہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ وہ ایک بہت بڑا کام ناتجربہ کار نوجوانوں سے لینے جارہے تھے جس میں کامیاب ہونے کیلئے ضروری تھا کہ ان نوجوانوں کو بہترین ماحول اور تفریح فراہم کی جائے تا کہ یہ تازہ دم سپاہیوں کی طرح بڑی آزمائش میں بے خطر کود جائیں اور ویسے بھی لہو گرم رکھنے کیلئے کھیل کے میدان سے بہتر جگہ کون سی ہوسکتی تھی۔

کہوٹہ پراجیکٹ کے یہ ابتدائی ایام ہر اعتبار سے منفرد تھے۔ بے سروسامانی کے عالم میں اللہ کے سپاہی بنام خدا جہد حق میں مصروف کار تھے اور دنیا ان سے بے خبر تھی کہ ان کا کام خفیہ رکھنا ضروری تھا۔ بیشتر سائنس دان اور انجینئر نوجوان تعلیم یافتہ اور کنوارے تھے جن کی رہائش کا انتظام پراجیکٹ کی حدود ہی کے اندر تھا اور ظاہر ہے کہ اس طرح ڈاکٹر خان کو اپنا دیرینہ شوق ان نوجوانوں میں منتقل کرنے کا موقع میسر آیا اور چند ہی دنوں میں کرکٹ، ہاکی اور فٹ بال کی ٹیمیں سامنے آ گئیں۔ یہ سنہری دن یوں بھی یادگار ہیں کہ نہ صرف ملکی سالمیت سے متعلق ایک عظیم

منصوبے کی ابتدا ہو رہی تھی بلکہ بے تکلف، خلوص و محبت اور قلبی وابستگی کی وہ فضا بھی پروان چڑھ رہی تھی جو اس پراجیکٹ کا خاصہ ہے۔ پلانٹ میں ان دنوں فقط ایک ہموار میدان ہوا کرتا تھا جسے ہیلی پیڈ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ یار دوستوں نے بلے اور بال کا بندوبست کیا اور شروع ہو گئی کرکٹ۔ بڑے بڑے کنٹینرز کو جو میدان کے چاروں اطراف بکھرے پڑے تھے باؤنڈری تصور کر لیا گیا اور ہیلی پیڈ کرکٹ پچ بن گیا۔ کے۔آر۔ایل میں یہ کرکٹ کی پہلی آمد تھی جبکہ آج کے۔آر۔ایل کے کرکٹ گراؤنڈ کا شمار ملک کے بہترین میدانوں میں ہوتا ہے۔ یہ فقط بلند بانگ دعوی ہی نہیں بلکہ ایسی حقیقت ہے جس کا اعتراف نہ صرف ملکی سطح پر گاہے بگاہے ہوتا رہا ہے بلکہ بین الاقوامی طور پر بھی اسے مستند مانا جاتا ہے۔ اکثر غیر ملکی ٹیمیں یہاں آزمائشی میچ کھیل چکی ہیں اور ویسٹ انڈیز کی ٹیم نے تو کے۔آر۔ایل کی ٹیم کے ساتھ ایک چار روزہ دوستانہ میچ بھی کھیلا جو اپنی نوعیت کا ایک منفرد واقعہ ہے۔

یہ سب ڈاکٹر خان کے کرکٹ کے کھیل سے والہانہ لگاؤ کا مظہر ہے۔ آپکا یہی شوق کے۔آر۔ایل کرکٹ ٹیم کی صورت میں سامنے آیا ہے جو بہت قلیل عرصے میں ملکی سطح پر ایک مضبوط حیثیت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی ہے۔ اس کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ قومی اہمیت کے تمام فرسٹ کلاس میچوں میں مثلاً پیٹرنز ٹرافی (گریڈ ون) اور ولز کپ وغیرہ یہ ٹیم کھیل چکی ہے۔ اس ٹیم کے کئی ارکان قومی ٹیم میں شامل ہو کر پاکستان کی جانب سے بھی اپنے جوہر دکھا چکے ہیں۔ ان میں شعیب اختر، اظہر محمود، محمد وسیم محمد اکرم، عبد الرزاق، وغیرہ نمایاں ہیں اور ایسا سب کچھ ڈاکٹر خان کی ذاتی دلچسپی اور حوصلہ افزائی کی بدولت ہی ممکن ہوا ہے۔ بے پناہ مصروفیات اور وقت کی کمی ڈاکٹر خان کو اب از خود میدان میں اترنے کی اجازت تو نہیں دیتی مگر جس انداز سے وہ ٹیم کے ارکان اور کھلاڑیوں سے کرکٹ کے موضوع پر سیر حاصل گفتگو فرماتے اور انہیں اپنے ماہرانہ مشوروں سے نوازتے ہیں اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نہ صرف اس کھیل کے بارے میں وسیع معلومات رکھتے ہیں بلکہ اس میں ماہر ہیں ان کا کہنا ہے کہ پچھلے 54 برسوں میں اہم عالمی کھلاڑیوں کے نام اور ان کے بنائے ہوئے سب ریکارڈ انہیں زبانی یاد ہیں۔ کم و بیش تمام قومی کھلاڑیوں اور ہیروز سے آپ کے ذاتی مراسم ہیں خواہ وہ ماجد خان ہوں یا عمران، میانداد ہوں یا انتخاب عالم۔ کے۔آر۔ایل کرکٹ گراؤنڈ کی رسم افتتاح کے موقع پر تو ظہیر عباس کو بطور خاص بحیثیت مہمان خصوصی مدعو کیا گیا تھا۔ ظہیر عباس اور میانداد ڈاکٹر خان کے پسندیدہ کھلاڑیوں میں سے ہیں۔

کرکٹ کے علاوہ ایک اور میدان جس میں ڈاکٹر خان کے۔آر۔ایل کے کھلاڑیوں سے محبت محض ہار جیت کی بنیاد پر نہیں رکھتے بلکہ بلا تفریق شکست و کامیابی ان کی حوصلہ افزائی فرماتے ہیں۔ بھارت اور شارجہ میں ہونے والے ٹورنامنٹ میں شعیب اختر کی اعلیٰ کارکردگی کے پیش نظر ڈاکٹر خان نے شعیب اختر کو خراج تحسین دینے کیلئے کے۔آر۔ایل کی طرف سے پاکستان کی قومی ٹیم کو پچاس ہزار کا چیک بھی دیا تھا۔ کھیل کو ڈاکٹر خان نے کبھی بھی انا کا مسئلہ نہیں بنایا بلکہ وہ سپورٹس مین سپرٹ پر یقین رکھنے والے شخص ہیں۔ ہر اہم ٹورنامنٹ کے بعد وہ کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی کی خاطر ان کے درمیان تشریف لاتے ہیں، ان کا نکتہ نظر توجہ سے سنتے ہیں اور ان کی مشکلات اور پریشانیوں کے ہر ممکن ازالے کی سعی فرماتے ہیں۔ اگلے معرکے کی تیاری کے لئے عمل کا تعین کرتے ہیں اور یوں مسکراہٹوں سے شروع ہونے والی نشست مسکراہٹوں پر ختم ہوتی ہے۔

والی بال کا کھیل ڈاکٹر خان کو ان کے لڑکپن کی جانب لے جاتا ہے کہ یہی تو وہ کھیل ہے جو عبد القدیر خان نے بھوپال کی گلیوں میں کھیلا اور جس سے ناطہ کراچی کے میدانوں میں بھی نہ توڑا۔ یہی وجہ ہے کہ کے۔آر۔ایل کی والی بال کی ٹیم اگرچہ کوئی ایسا معرکہ تو نہیں انجام دے پائی ہے مگر اس کے کھلاڑی کسی بھی طرح سے ڈاکٹر خان کو کم عزیز نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک ہر کھلاڑی اہم اور صلاحیتوں سے مالا مال ہے۔ انتظار فقط درست وقت اور لمحہ کا ہے کہ جب وہ اپنے بھرپور جوہر دکھا سکے۔ کھیل کا نتیجہ ثانوی ہے۔ اہم تو یہ مرکزی خیال ہے کہ قوم کے جوانوں کو صحت مند سرگرمی فراہم کی جائے۔ اس اعتبار سے کے۔آر۔ایل کے کوہ پیماؤں کا ذکر نہ کرنا یقیناً ناانصافی ہو گی۔

پراجیکٹ کے اولین دنوں کی یادگار کوہ پیماؤں کا یہ کلب "کے۔آر۔ایل" ماؤنٹنگ اینڈ ٹریکنگ کلب" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کلب کی بنیاد قائد اعظم یونیورسٹی سے فارغ التحصیل طلباء کے اس گروپ نے رکھی جو کے۔آر۔ایل سے اس کے اولین دنوں میں وابستہ ہوا۔ اب تک سینکڑوں مہمات اس کلب کی وساطت سے ملک کے طول و عرض میں جا چکی ہیں۔ جن پر مشتمل کئی سفرنامے بھی شائع ہوتے ہیں۔ اس کی کامیابی یقیناً ڈاکٹر خان کی نظروں سے پوشیدہ نہیں اور یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ یہ کلب آپ کو خاص طور پر عزیز ہے۔

کے۔آر۔ایل میں ایک بلاک بطور خاص اس کلب کیلئے تعمیر کروا دیا گیا ہے جہاں اس کے اجلاس بڑی باقاعدگی سے منعقد ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کلب کیلئے جدید اور خصوصی ساز و سامان بھی باہر سے منگوایا گیا ہے۔

ڈاکٹر خان کی شخصیت کا یہ پہلو اگرچہ بہت کم لوگوں کے علم میں ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ آپ کی یہی وہ خصوصیت ہے جو آپ کو خطروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے، ناکامیوں کو حوصلہ مندی سے جھیلنے اور ناامیدی کے پردے چیر کر

امید کی کرن کا ڑھ لینے کی جلا بخشی ہے۔ آپ کی یہی خاصیت ہے کہ آپ کو بلندی نگاہ، دلنوازی سخن اور پر سوزی جاں عطا کر پائی ہے اور قوم کو وہ دیدہ ور میسر آیا کہ جس کے انتظار میں نرگس ہزاروں سال اپنی بے نوری پہ روتی تھی۔

جائزہ تجزیہ و خدشات

اسلامی دنیا کے ایٹمی منصوبے

پاکستان کی ایٹمی طاقت طشت از بام ہو چکی ہے اور دنیا یہ جان چکی ہے کہ عالم اسلام میں پاکستان ہی وہ واحد ملک ہے جس نے عالمی دباؤ اور بے تحاشا اقتصادی پابندیوں کے باوجود ایٹمی ٹیکنالوجی پر دسترس حاصل کر لی ہے۔ یہودی اور ہندو لابی نے پاکستان کے ایٹمی منصوبوں کو کئی بار سبوتاژ کرنے کی کوشش کی مگر انہیں ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ 1958ء میں پاکستان نے اپنا پہلا ایٹمی ریسرچ ری ایکٹر حاصل کرنے کے لئے امریکہ سمیت دیگر بڑے ملکوں سے رابطہ کیا تھا مگر بیل منڈھے نہ چڑھ سکی تاہم ساٹھ کی دہائی میں امریکہ اور کینیڈا نے پاکستان کو پہلا ایٹمی ری ایکٹر فراہم کیا۔ اس کے بعد 1974ء تک پاکستان کو ایٹمی ری ایکٹروں کے سلسلے میں پیش رفت کے ساتھ ساتھ پابندیوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ ۱۹۷۴ء میں بھارت نے ایٹمی دھماکے کئے تو پاکستان نے بھی ایٹم بم بنانے کا اعلان کر دیا۔ پاکستان کے ایٹمی توانائی کمیشن کو ان دنوں پرزہ جات اور افزودہ یورینیم کے حصول میں خاصی دشواریاں پیش آئیں۔ اسی اثنا میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان مطلع سائنس پر نمودار ہوئے اور انہوں نے سینٹری فیوج نظام کے تحت کہوٹہ پلانٹ کی بنیاد رکھی اور یوں ایٹمی پراجیکٹ پر تیزی سے کام شروع ہو گیا۔

ایٹمی توانائی کمیشن اور کہوٹہ والوں نے نہ صرف بہت جلد پاکستان کو ایٹم بم سے بہرہ مند کر دیا بلکہ ایٹمی توانائی کے ذریعے پاکستان میں طب اور زراعت کے شعبے میں تحقیق کے راستے کھول دیئے۔ جبکہ چھوٹے کیمیائی ہتھیاروں اور میزائلوں کو چین اور کوریا کی مدد سے مقامی طور پر تیار کرنا شروع کر دیا۔ عالم اسلام میں آج پاکستان کو بلاشبہ ایک سردار کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے مگر ہمارے ہاں بہت کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہے کہ دنیائے اسلام کے چند دوسرے ممالک بھی ایٹمی ٹیکنالوجی کے حصول کی دوڑ میں شامل ہو چکے ہیں۔ ان میں سے چند ایک ملک تو ایسے ہیں جنہوں نے آج سے تیس چالیس سال پہلے ایٹمی ٹیکنالوجی کی داغ بیل رکھ دی تھی مگر انہیں یہودی لابی کے ہاتھوں بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ پاکستان خوش قسمت ملک ہے کہ خدانخواستہ اسے ایسے حالات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اگرچہ اندرا گاندھی کے دور حکومت میں بھارت نے اسرائیل اور روس کی مدد سے کہوٹہ پراجیکٹ پر حملہ کرنے کی تیاری کی تھی مگر اس کے قتل کے بعد بھارت نے دم سادھ لیا تھا۔ پاکستان کے ایٹمی دھماکوں سے پہلے بھی یہ افواہ سرگرم تھی کہ اسرائیل اور بھارت پاکستان کے ایٹمی پراجیکٹ تباہ کرنے والے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے پاکستان کو محفوظ رکھا اور اس کی طاقت دنیا پر عیاں کر دی۔ پاکستان کے علاوہ جو چند اسلامی ممالک ایٹم بم کے حصول کے لئے کام کر رہے ہیں۔ ان میں یہ ممالک نمایاں ہیں۔

عراق

اسلامی دنیا میں عراق پہلا ملک ہے جس نے ایٹمی ٹیکنالوجی پر سب سے زیادہ توجہ دی اور تیزی کے ساتھ اس میدان میں ترقی بھی کر لی۔ عراق نے 1960ء کے عشرے میں ایٹمی ٹیکنالوجی کی طرف قدم بڑھایا تھا۔ چونکہ عراق شروع سے ہی روس کا دوست رہا ہے لہذا اپنے پہلے ریسرچ ری ایکٹر کے لئے بھی اس نے روس سے مدد حاصل کی۔ 1953ء میں روس نے عراق کو ایک چھوٹا سا ریسرچ ری ایکٹر فراہم کیا۔ اسے تموز اول ایٹمی مرکز کا نام دیا گیا۔ ""تموز"" ایک انقلابی مہینے کا نام ہے۔ اس مہینے میں بعث پارٹی برسر اقتدار آئی لہذا بغداد کے قریب پہلا ایٹمی مرکز قائم کیا گیا تو اس کا نام بھی ""تموز"" دوم رکھا گیا۔ یہ نام صدر صدام حسین نے رکھا تھا۔

""تموز اول"" کی تعمیر میں روس کے علاوہ دیگر مغربی ممالک نے بھی امداد فراہم کی تھی۔ یہ روسی ساخت کا ری ایکٹر آئی آر ٹی 2000 ایک چھوٹا سا تحقیقی ماڈل تھا۔ اور اس سے دو میگاواٹ تھرمل حاصل ہوتی تھی۔ تموز اول نے 1968ء میں کام کا آغاز کر دیا تھا۔ بعد ازاں اس مرکز کی توسیع کر دی گئی 1978ء میں اس کی صلاحیت 97 فیصد افزودہ یورینیم ہے اور اس کی کارکردگی 70 میگاواٹ تھرمل ہے۔ پورا سال کام کرنے کے لئے پانچ سے پندرہ کلوگرام افزودہ یورینیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ روس نے عراق کو ایک ریڈیو آئسوٹوپ لیبارٹری بھی فراہم کی تھی لیکن 1950 کے بعد عالمی دباؤ کے تحت روس عراق کو ٹیکنالوجی فراہم کرنے میں پس و پیش سے کام لینے لگا تو عراق نے مایوسی کے عالم میں فرانس سے رابطہ کر لیا اس دور میں فرانس ایٹمی ٹیکنالوجی میں سب سے آگے تھا۔ فرانس کو تیل کے بحران کا بھی سامنا تھا۔ عراق میں تیل کے ذخائر 41 بلین بیرل تھے اور اس کا شمار تیل برآمد کرنے والے بڑے ممالک میں ہوتا تھا۔ فرانس نے تیل کا بحران ختم کرنے کے لئے عراق کو ایٹمی سہارا دینے کے لئے ہامی بھر لی۔

1974ء میں فرانس کے وزیراعظم ژاک شیراک نے عراق کا دورہ کیا اور ایٹمی ٹیکنالوجی کے معاہدے پر دستخط کر دیئے۔ اس سمجھوتے کے تحت عراق نے فرانس سے پانچ سو میگاواٹ کے گیس گریفائٹ ری ایکٹر حاصل کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ پہلے تو فرانس آمادہ ہو گیا لیکن بعد میں اس نے انکار کر دیا۔

گریفائٹ ری ایکٹر کو کئی مقاصد کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہودی لابی نے اس سمجھوتے پر بے حد شور مچایا کہ عراق اس ایٹمی ٹیکنالوجی کے ذریعے ایٹم بم بنانا چاہتا ہے۔ کیونکہ گریفائٹ ری ایکٹر کی مدد سے پلوٹونیم کی ایک خاص مقدار بڑی تیزی سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ فرانس نے عراق کو تحقیقی مقاصد کے لئے ایک ری ایکٹر فراہم تو کر دیا مگر بہت جلد یہودی لابی کے تحت اس پر کام بند کر دیا۔ یہ آٹھ سو کلوواٹ کا ایک چھوٹا سا ری ایکٹر تھا جس کا نام ""تموز دوم"" رکھا گیا۔

عراق نے فرانس کے علاوہ اٹلی سے بھی ایٹمی ٹیکنالوجی کے لئے معاہدات کر لئے۔ حالانکہ اٹلی کا ایٹمی پروگرام ابھی اپنے ابتدائی مراحل میں تھا کہ 1968ء میں اسے مجبور کر کے این پی ٹی پر دستخط کرا لئے گئے۔ تاہم اس نے 1969ء میں اپنے فیول ری پراسیسنگ کے پروگرام کا آغاز کر دیا تھا۔

اٹلی عراق سے تیل حاصل کرتا تھا۔ ایک رپورٹ کے مطابق اٹلی نے 1973ء میں اپنے کل درآمدی تیل کا 17 فیصد' 1978ء میں 21 فیصد اور 1979ء میں 24 فیصد تیل عراق سے حاصل کیا تھا۔ لہذا صدر صدام نے عراق کے ایٹمی مرکز کی توسیع اور نئی ٹیکنالوجی کی خاطر 1975ء میں گفت و شنید کی۔ لیکن اٹلی بھی عالمی دباؤ کے زیر سایہ کام کر رہا تھا لہذا اس نے عراق کو ریڈیو کیمسٹری لیبارٹری کی فروخت کی بھی پیشکش کر دی۔ یہ لیبارٹری تین ہاٹ سیلز پر مشتمل تھی۔ اٹلی نے ایٹمی تحقیق میں تعاون کے ایک دس سالہ معاہدے پر بھی دستخط کئے۔ اس نے عراق کو فیول فیبریکیشن لیبارٹری مہیا کرنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔

پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو جس طرح کے دباؤ کا سامنا رہا ہے' سب سے پہلے عراق کو اس دباؤ کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ یہودی لابی کو شروع سے ہی یہ خدشہ تھا کہ عراق عالم اسلام میں واحد ملک ہے جو ایٹمی قوت حاصل کرنے کے بعد اسرائیل کو نیست و نابود کر دے گا اور پھر مشرق وسطیٰ میں اس کی اجارہ داری کو چیلنج بھی نہیں کیا جا سکے گا۔ اس تناظر میں یہودی لابی نے سازشوں کا جال پھیلا دیا اور 6 اپریل 1979ء کو فرانس کی بندرگاہ طولون کے قریبی قصبہ میں عراق کے ""تموز اول"" اور ""تموز دوم"" کے بعض حصوں کو تباہ کر دیا۔ یہ ری ایکٹر مکمل تیار تھے اور معاہدے کے تحت انہیں عراق کو فراہم کرنا تھا۔ یہ اسرائیل کی کارستانی تھی جسے فرانس نے ہی ایٹمی قوت بنایا تھا۔

عراق کے ایٹمی پروگرام کو دوسرا دھچکا اس وقت لگا جب جون 1980 میں عراق کے اہم ترین سائنسدان ڈاکٹر یحییٰ المشہد کو پیرس کے ہوٹل میریڈین میں قتل کر دیا گیا اس مصری نژاد سائنسدان نے روس میں تربیت حاصل کی تھی۔ عراقی حکومت نے 1975ء میں اس کی خدمات حاصل کی تھیں۔

اسرائیل نے عراق کے خلاف دوسرے اسلامی برادر ملکوں کو بھی اکسانا شروع کر دیا اور انہیں باور کرا دیا کہ عراق ان کے لئے خصوصاً ایران کے لئے خطرہ ثابت ہوگا۔ لہذا 30 ستمبر 1980 کو ایرانی طیاروں نے تموز پراجیکٹ پر حملہ کر دیا۔ اگرچہ اس حملہ سے ری ایکٹر کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا مگر عراق کے پہلو میں ہی ایک اور محاذ کھل گیا۔ لہذا عراق نے ایٹمی مراکز کو بعض دوسرے مقامات پر منتقل کرنے کے علاوہ 26 پونڈ اعلیٰ افزودہ یورینیم کو ری ایکٹر سے علیحدہ کر کے ایک خفیہ مقام پر چھپا دیا۔

اسرائیل نے جب دیکھا کہ عراق پر ان نقصانات کا کوئی اثر نہیں ہوا تو اس نے ""آپریشن بابل"" کی تیاریاں شروع کر دیں اور جون 1981 میں اسرائیل کے سولہ جدید لڑاکا طیاروں نے عراق کے ایٹمی مراکز (تموز اول اور تموز دوم) پر شدید حملہ کر کے اسے تباہ کر دیا۔ عراق کا ایٹمی وار پروگرام جامد ہو گیا مگر اس دوران اس نے خاصی ترقی کر لی تھی۔ 1990ء امریکہ نے عراق کویت جنگ کی آڑ میں عراق کی دیگر ایٹمی تنصیبات کو بھی تباہ کر دیا تھا مگر عراق زخم زخم ہونے کے باوجود اپنی ایٹمی توانائیاں محفوظ رکھ کر امریکہ کے لئے درد مستقل ثابت ہوا۔ خلیجی جنگ کے دوران عراق نے جدید ایٹمی ہتھیار بھی استعمال کئے جو اس بات کی علامت تھے کہ عراق اس میدان میں خاصی ترقی کر چکا ہے۔ 1999ء میں امریکہ نے ایک بار پھر حملہ کر دیا اور اس بار بھی جواز یہی پیش کیا گیا۔ عراق نے سلامتی کونسل کے معاہدات کی خلاف ورزی کر کے اپنے ایٹمی ہتھیار اور تنصیبات تباہ نہیں کیں لہذا اسے سبق سکھانے کے لئے اس پر حملہ ناگزیر ہے۔

عراق دنیائے اسلام میں واحد ملک ایسا ہے جس پر امریکہ نے عذاب مسلط کر رکھا ہے مگر وہ ایٹمی قوت سے دستبردار نہیں ہوا۔ اب کچھ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ عراق کے پاس کتنی ایٹمی ٹیکنالوجی رہ گئی ہے۔ لیکن سی آئی اے اور موساد کی رپورٹس کے مطابق عراق نے روس سے ایٹمی ہتھیار اور ٹیکنالوجی دوبارہ حاصل کر لی ہے۔ مگر دنیا حیران ہے کہ اگر عراق کے پاس اب بھی یہ جدید ہتھیار موجود ہیں تو وہ امریکہ کے خلاف انہیں استعمال کیوں نہیں کر رہا؟

ایران

1998ء میں پاکستان نے غوری میزائل اور ایٹمی دھماکوں سے دنیا کو حیران کر کے رکھ دیا تھا اور عالمی ذرائع ابلاغ صرف پاکستان اور بھارت کے ایٹمی دھماکوں پر مرکوز ہو کر رہ گئے تھے۔ حالانکہ اسی دوران ایران بھی "شہاب" داغ کر میزائل کی دوڑ میں شامل ہو گیا تھا۔ اس نے غوری اور پرتھوی کے پلے کا میزائل داغا تھا مگر اسے توجہ حاصل نہ ہو سکی۔ اپریل 99ء میں پاکستان نے اپنا شاہین چھوڑا تو ایران نے بھی "سیدون" کے نام سے اپنا دوسرا جدید میزائل پیش کر دیا۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ایران ایٹمی ٹیکنالوجی کے میدان میں خاصی پیش رفت حاصل کر چکا ہے۔

ایران نے ایٹمی طاقت حاصل کرنے کے لئے ساٹھ کی دہائی میں کام شروع کر دیا تھا۔ 65-1962 میں شاہ ایران نے امریکہ سے ایک سوئمنگ پول ٹائپ 5 میگاواٹ کا ایک ریسرچ ری ایکٹر حاصل کیا تھا۔ جبکہ مغربی جرمنی سے دو پاور ری ایکٹر ایک بارہ سو ایم ڈبلیو ای بھی حاصل کئے تھے۔ ایران نے فرانس سے بھی دو نو سو ایم ڈبلیو ای پاور کے ری ایکٹر حاصل کئے مگر اس بارے میں کسی کو معلوم نہیں کہ ان سے کام لیا گیا کہ نہیں۔

انقلاب ایران کے بعد ایران کو عالمی دباؤ کا سامنا کرنا پڑا مگر اس نے اپنا سفر جاری رکھا۔ 1984ء میں ایرانی اٹامک انرجی آرگنائزیشن کے سربراہ رضا امراللہی نے انٹرنیشنل اٹامک انرجی ایجنسی کے ایک اجلاس میں بتایا تھا کہ ایران نیوکلیائی تحقیق کے مختلف منصوبوں پر عمل پیرا ہے۔ ایران نے ایٹمی تعلیم کے لئے اپنے نوجوانوں کو دوسرے ممالک میں بھی بھیج دیا ہے۔ جبکہ ایرانی ماہرین مختلف ممالک سے جدید تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ایران توانائی کے نئے ذرائع بھی دریافت کر رہا ہے۔ اس نے پلازما فزکس پر خاصی تحقیق کر لی ہے۔ جبکہ آئسوٹوپ کی تیاری پر بھی توجہ دے رہا ہے۔ اس مقصد کے لئے ایک خصوصی مرکز بھی قائم کیا جا رہا ہے جہاں ایٹمی توانائی کو طبی مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے گا۔ ایران این پی ٹی پر دستخط کر چکا ہے اور اب وہ ایٹمی توانائی کو زیر زمین رکھ کر مختلف مقاصد کے لئے کام لے رہا ہے۔

لیبیا

ساٹھ کی دہائی میں جو دو اسلامی ممالک یہودی لابی کے لئے دردِ سر بنے ان میں عراق کے بعد لیبیا کا نام لیا جاتا ہے۔ یہودی لابی کے خیال میں لیبیا تیل کی دولت سے مالا مال ہے اور اسی وجہ سے وہ اپنی انتہا پسندانہ سرگرمیوں میں ملوث رہتا ہے۔ لیبیا کے صدر قذافی ایک سچے اور نڈر مسلمان ہیں اسی وجہ سے مغربی پریس نے ان پر کئی انداز میں تنقید کی ہے۔ لیبیا کے ایٹمی پروگرام کو سبوتاژ کرنے کے لئے مغربی دنیا نے کئی افسانے تراش رکھے ہیں۔ اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں کہ عراق کے صدر صدام حسین کے بعد لیبیا کے صدر معمر قذافی ہی وہ واحد مسلمان حکمران ہیں جنہوں نے یہودی لابی اور امریکہ کے آگے سر نہیں جھکایا اور اس پاداش میں انہیں مسلسل جارحیت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ امریکہ اور ان کے حواریوں کو اس بات کا یقین ہے کہ اگر صدر قذافی نے ایٹمی قوت حاصل کر لی تو مشرق وسطیٰ کے مسلمان ممالک نہ صرف یورپ کے لئے خطرہ بن جائیں گے بلکہ امریکہ کو بھی اپنی سرحدیں مختصر کرنا پڑ جائیں گی۔ خاص طور پر اسرائیل کا وجود ہی ختم ہو جائے گا۔ انہیں خطرات کے پیش نظر لیبیا کو پھانسنے کے لئے اسرائیلی اور امریکی ایجنسیوں نے سازشوں کا جال پھیلا رکھا ہے اور کسی نہ کسی بہانے سے لیبیا کو پریشان کیا جاتا ہے۔ صدر قذافی کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ایٹم بم خریدنے کی قوت رکھتے ہیں۔ یہودی پریس کے مطابق صدر قذافی نے چین کے عظیم لیڈر چواین لائی سے ایٹم بم مانگے تھے مگر انہوں نے معذرت کر لی تاہم چین نے لیبیا کو ایٹمی تحقیقات کرنے میں مدد دینے کا ارادہ ظاہر کیا۔

مغربی ذرائع کے مطابق لیبیا نے ایٹمی ٹیکنالوجی کے حصول کے لئے بہت سے ممالک سے رابطہ کیا جن میں کینیڈا؟ مغربی جرمنی' اٹلی اور امریکہ شامل تھے مگر سب نے معذرت کر لی۔ 1980ء میں اس نے بھارت سے نقد ادائیگی اور کم قیمت پر تیل فراہم کرنے کے عوض ایٹمی ٹیکنالوجی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی مگر اسے ناکامی ہوئی۔

پوری دنیا جانتی ہے کہ لیبیا کے پاس ایٹم بم نہیں ہے۔ اس کے باوجود لیبیا نے امریکہ اور اسرائیل کو یہ باور کرا دیا ہے کہ اس کے لئے ایٹم بم کا حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ جنوری 1975ء میں صدر قذافی نے ایک اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا:

"اب وہ وقت آنے والا ہے جب ایٹم بم کسی کے لئے راز نہیں رہے گا۔ چند برس قبل ہم اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ اپنے لئے چند لڑاکا سکواڈرن خرید لیں اور اب وہ وقت آنے والا ہے کہ ہم ایٹم بم خرید سکیں گے۔ ایٹم بم پر اب اجارہ داری ختم ہونے کو ہے"۔

مغربی میڈیا کے مطابق صدر قذافی مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ لیبیا کے پاس ایٹمی تحقیق کا کوئی مرکز ہی نہیں ہے۔ روس لیبیا کا ایک اچھا دوست رہا ہے۔ اس نے ہی لیبیا کو مشروط طور پر ایک چھوٹا سا ریسرچ ری ایکٹر اور لیبارٹریز فراہم کی ہیں اور لیبیا کو یہ کہہ رکھا ہے کہ استعمال شدہ ایندھن کو واپس روس بھجوا دیا جائے۔ روس نے لیبیا کو این پی ٹی پر دستخط کے لئے بھی مجبور کیا تھا جس پر اس نے دستخط کر دیئے تھے۔

مغربی ذرائع نے لیبیا کے اسلامی بم کے بارے میں یہ بات بھی مشہور کر رکھی ہے کہ صدر قذافی نے جب یہ دیکھا کہ یہودی لابی انہیں اپنے ملک میں ایٹم بم نہیں بنانے دے گی تو انہوں نے پاکستان کو اس بات پر آمادہ کیا اور پانچ ارب سے زائد کی مالی امداد دی تھی۔ اس سلسلے میں بھٹو اور قذافی میں 1974ء میں ایٹمی تعاون کا معاہدہ بھی ہوا تھا۔ لاہور میں ہونے والی 37 اسلامی ملکوں کی سربراہی کانفرنس میں بھٹو نے سعودی عرب سمیت دوسرے اسلامی ممالک کے سربراہوں کو اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ وہ پاکستان کو اسلامی قوت بنانے کے لئے بھی ان کی مدد کریں۔ بھٹو کی اس اپیل کے نتیجے میں صدر قذافی نے بھٹو کو یقین دلایا تھا کہ وہ لیبیا کی "دیرینہ خواہش" پوری کرنے پر آمادہ ہوں تو لیبیا ان کی مدد کرے گا۔

ملائیشیاء

ملائیشیا نے مارچ 1972ء میں پسپائی کے مقام پر ایٹمی ریسرچ سنٹر قائم کیا تھا۔ اس منصوبے کا مقصد صرف توانائی حاصل کرنا تھا۔ اکتوبر 1972ء میں انٹرنیشنل اٹامک انرجی ایجنسی کے نمائندوں نے بھی ملائیشیا کو پرامن مقاصد کے استعمال کی خاطر ایٹمی تحقیق کی اجازت دے دی تھی۔ اگست 1973ء میں اس مرکز کا نام تن اسماعیل اٹامک ریسرچ سنٹر رکھ دیا گیا۔ یہ سنٹر بانگی کے جنگلوں میں قائم ہے۔ یہ ریسرچ سنٹر دارالحکومت سے 42 کلومیٹر دور جنوب میں واقع ہے اور 127 ایکٹر پر پھیلا ہوا ہے۔ ملائیشیا نے مزید پیش رفت کے لئے مارچ 1976ء میں نیوکلیئر ریسرچ ری ایکٹر کی خریداری کے لئے ٹینڈر جاری کیا اور ایک امریکی فرم جنرل اٹامک کمپنی کو اس کی سپلائی کی منظوری دی۔ نومبر 1976ء میں ٹریگا ایم کے ٹوری ایکٹر کی فراہمی کا معاہدہ ہوا۔ شروع میں یہ پراجیکٹ وزارت ٹیکنالوجی کے زیر انتظام تھا مگر 16 جون 1983ء کو اس کی کارکردگی مزید بہتر بنانے کے لئے وزیر اعظم کی نگرانی میں دے دیا گیا۔

ملائیشیا "ایٹم برائے امن" کے مقولے پر گامزن ہے' اس نے این پی ٹی پر دستخط کر دیئے ہیں اور اپنی ایٹمی تحقیقات کا دائرہ محدود کر دیا ہے۔ اس نے ایٹمی توانائی کے ذریعے کوالالمپور کے انٹرنیشنل ائرپورٹ کو ائرکنڈیشنڈ کیا ہوا ہے۔ ملائیشیا کے جنگلوں میں ربڑ کو ایک خاص کیڑا بہت نقصان پہنچاتا ہے۔ اس کیڑے کو تابکاری کے ذریعے ختم کرنے پر تحقیق ہو رہی ہے۔

انڈونیشا

انڈونیشیا بھی ایک ترقی پذیر اسلامی ملک ہے۔ اس نے ایٹمی ٹیکنالوجی کے حصول کے لئے بہت بعد میں ہاتھ پاؤں مارے انڈونیشیا نے جوہری توانائی کے منصوبوں پر عمل کرنے سے پہلے ہی این پی ٹی پر دستخط کر دیئے تھے۔ بعد ازاں اس نے ایک جرمن فرم کے تعاون سے 1984ء میں ایک ریسرچ ری ایکٹر تعمیر کرنا شروع کیا تھا۔ یہ ایک میگاواٹ کا منصوبہ ہے۔ یہ ری ایکٹر جکارتہ سے 25 کلومیٹر دور مغربی جاوا میں سرپانگ کے مقام پر تعمیر کیا جا رہا ہے۔ انڈونیشیا اس ری ایکٹر سے طبی و صنعتی مقاصد کے لئے آئسوٹوپ حاصل کرے گا۔ جبکہ زراعت' معدنیات اور دیگر شعبوں میں تحقیق کے لئے اس سے کام لیا جائے گا۔

ترکی

پاکستان اور نائیجر کے بعد ترکی واحد اسلامی ملک ہے جسے قدرت نے یورینیم کے ذخائر سے نوازا ہے۔ امریکہ نے ترکی کو ایک میگاواٹ کا ایک ریسرچ سنٹر فراہم کیا تھا۔ ترکی یورپ کا اتحادی ملک ہے اس نے این پی ٹی پر دستخط کر دیئے ہیں اس کے علاوہ ترکی ایک 600 ایم ڈبلیو ای پاور ری ایکٹر کی تعمیر کا منصوبہ بھی بنا رہا ہے۔ اس وقت ترکی میں 3500 ٹن یورینیم کے ثبوت مل چکے ہیں۔ یہ اسلامی ایٹمی قوت کے حصول کو صرف طب زراعت تک ہی محدود رکھنا چاہتا ہے مغربی ذرائع کے مطابق ترکی سے کسی بھی یورپی ملک بالخصوص اسرائیل کو خطرہ نہیں ہے تاہم ترکی اپنے ایٹمی منصوبوں پر تیزی سے عمل کر رہا ہے۔ وہ وقت دور نہیں جب ترکی دوبارہ ایک مکمل اسلامی ملک بن کر ابھرے گا تو یورپ کو اس کے ایٹمی مراکز سے بھی خطرہ درپیش ہو جائے گا۔

کویت

کویت نے خلیجی جنگ سے پہلے ایٹمی ریسرچ سنٹر قائم کرنے کی خواہش کا اظہار کر دیا تھا۔ کویت ایک چھوٹی مگر اہم ریاست ہے۔ آج یہ تیل کی دولت سے مالا مال ہے۔ مگر مستقبل میں تیل کے یہ کنوئیں خشک بھی ہو سکتے ہیں۔ لہذا توانائی کے بحران سے بچنے کے لئے کویت نے ری ایکٹر خریدنے کی تگ و دو شروع کر دی تھی۔ ایک رپورٹ کے مطابق خلیجی جنگ کے بعد کویت نے نیوکلیئر ریسرچ کے منصوبوں پر امریکہ سے معاہدات کر لئے ہیں اور بہت جلد یہاں ایٹمی تنصیبات شروع کر دی جائیں گی۔

پاکستان اپنا اسلحہ بیچنے پر مجبور کیوں ہوا؟

پاکستان نے 14 تا 17 نومبر کو ایکسپورٹ سنٹر کراچی میں آئیڈیاز 2000ء کے تحت ایک بھرپور دفاعی نمائش کا اہتمام کیا جس کے ذریعے دنیا کو پاکستان میں تیار ہونے والی جنگی مصنوعات سے متعارف کرایا گیا لیکن بین السطور میں اس جرأت کا بھی اظہار کر دیا گیا کہ پاکستان دفاعی صلاحیت میں خود کفالت حاصل کر چکا ہے اور کسی دباؤ کے بغیر جدید اسلحہ کی تیاری سے ہاتھ نہیں روک سکتا۔

دفاعی سازوسامان کی خرید و فروخت کوئی ممنوعہ تجارت نہیں ہے دنیا کے بیشتر ترقی یافتہ ممالک دوسرے ممالک کو جنگی مصنوعات فروخت کرتے ہیں اس وقت دنیا میں امریکہ سب سے بڑا ملک ہے جو دفاعی سازوسامان کا 56 فیصد کھلی مارکیٹ میں بیچتا ہے اس کے بعد فرانس ہے جو اس ڈیمانڈ کا صرف 15 فیصد پورا کر پاتا ہے جبکہ 15 فیصد سے نیچے بہت سے ممالک ہیں ان میں چین روس برطانیہ اور اٹلی جیسے ممالک ہیں۔ اس حوالے سے جنرل پرویز مشرف نے یہ کہا ہے کہ اگر دنیا کے بڑے ممالک اپنے جدید دفاعی ہتھیار عالمی سطح پر فروخت کر سکتے ہیں تو پاکستان بھی اپنی دفاعی مصنوعات برآمد کر سکتا ہے۔ انہوں نے واضح کیا ہے کہ امریکی پابندیوں سے پاکستان اسلحہ فروخت کرنے سے گریز کرے گا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ فوجی حکومت پاکستان میں معاشی بحالی اور خود کفیل ہونے کے لئے دفاعی سازوسامان کی بڑے پیمانے پر عالمی منڈی میں فروخت کی منصوبہ بندی بنا چکی ہے اور اس سلسلے میں جنگی مصنوعات کی نمائش اور برآمدات کا ادارہ بنا دیا گیا ہے جنرل پرویز مشرف نے دفاعی سازوسامان کی فروخت کے لئے رواں سال (2001-2000) کے دوران 10 بلین ڈالر پیداوار کی برآمدات کا ہدف دیا جو حاصل نہ ہو سکا۔

پاکستان میں تیار ہونے والی جنگی مصنوعات عالمی معیار کی حامل ہیں۔ دفاعی نمائش سے قبل ہی پاکستان کا دفاعی سازوسامان ہاتھوں ہاتھ خریدا جا رہا ہے۔ 1999 میں پاکستان نے مشرق وسطیٰ جنوب مشرقی ایشیا' افریقہ اور امریکہ جرمنی جیسے 14 ممالک کو اسلحہ برآمد کیا لیکن آئیڈیاز 2000ء نمائش کے بعد چھ مزید ممالک نے جنگی مصنوعات خریدنے کے لئے رابطہ قائم کیا ہے۔

پاکستان کی خوش قسمتی ہے کہ پاکستان آرڈیننس فیکٹری کے پاس نیٹو اور مشرقی معیار کے دفاعی آلات تیار کرنے کی صلاحیت ہے۔ اعلیٰ معیار کی جنگی مصنوعات تیار کرنے پر پی او ایف نے موڈی انٹرنیشنل سے آئی ایس او 2001 سرٹیفکیٹ بھی حاصل کیا ہے۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ پاکستان آرڈیننس فیکٹری میں عالمی معیار کے دفاعی آلات تیار ہوتے ہیں۔ پی او ایف اس معیار کو برقرار رکھنے اور دفاعی آلات کی زیادہ سے زیادہ ڈیمانڈ بڑھانے میں دلچسپی رکھتی ہے اور یہاں مزید ستاون اشیاء تیار کی جا رہی ہیں جو بہت جلد دوسرے ممالک کو فروخت کی جائیں گے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسی وجوہات تھیں جن کی وجہ سے پاکستان نے دنیا کی نظروں سے چھپ کر سخت پابندیوں میں بھی دفاعی سازوسامان کی تیاری کا عمل برابر جاری رکھا۔ اور اب کیسی مجبوریاں ہیں کہ پاکستان دفاعی سازوسامان کی فروخت کو باقاعدہ بنانے کے لئے ایک ادارہ قائم کرنا چاہتا ہے جو پوری دنیا کو پاکستان کی دفاعی مصنوعات خریدنے پر راغب کرے گا۔

نمائش میں عبدالقدیر خان ریسرچ لیبارٹریز کہوٹہ' ہیوی انڈسٹریز کہوٹہ' پاکستان آرڈیننس فیکٹری واہ کینٹ نیول ڈاکیارڈ اور نیشنل ڈیفنس کمپلیکس میں تیار ہونے والی جن جنگی مصنوعات کو رکھا گیا تھا۔ ان میں میزائل ''ٹینک' بکتر بند گاڑی' ریڈار' سپر مشاق طیارہ' سٹارفش مائن' اینٹی ٹینک شکن میزائل اور بالخصوص نیوی کی طرف سے تیار کردہ آگسٹا سب میرین شامل تھے۔ یہ نمائش ہر حوالے سے جامع منصوبہ بندی کی عکاس تھی۔ اس کی خاص بات یہ بھی تھی کہ صدر پاکستان رفیق تارڑ اور جنرل پرویز مشرف نے تین دن تک شرکت کی اور ہر سٹال پر گئے۔

اس نمائش کے مقاصد کیا تھے؟

عام پاکستانی تو شاید اس بارے میں آگاہ نہ ہو گا مگر دفاعی ماہرین دانشور اور عالمی قوتیں اس نمائش کے مقاصد سے آگاہ تھیں کہ پاکستان نے ایٹمی دھماکوں کے اظہار کے بعد یہ دوسرا جرأت مندانہ قدم اس لئے اٹھایا کہ دنیا کے سامنے پاکستان ایک اسلحہ ساز قوت کے طور پر متعارف ہو جائے تاکہ اس کے نتیجے میں پاکستان کے دفاع کے بارے میں کمزوری کا جو تاثر پایا جاتا تھا وہ دور ہو' بالخصوص یہ کہنا کہ پاکستان دفاعی اعتبار سے بھارت کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور اس کی اسلحہ سازی کی قوت نہ ہونے کے برابر ہے۔ لہذا بھارت کے ساتھ کسی بھی امکانی جنگ میں پاکستان چند ہفتوں سے زیادہ عرصے تک لڑنے کی صلاحیت نہیں رکھتا لیکن اس نمائش سے اب دنیا بھر پر واضح ہو گیا ہے کہ پاکستان جوہری اسلحہ اور میزائلوں کی تیاری پر مکمل مہارت رکھتا ہے لہذا اس کے بارے میں غلط اندازے نہ لگائے جائیں۔

قیام پاکستان کے وقت ہندوستان میں اسلحہ اور گولہ بارود تیار کرنے والی 13 فیکٹریاں تھیں۔ مگر یہ فیکٹریاں بھارت کے حصے میں آئیں۔ دفاعی سامان اور اسلحہ کی تقسیم کے معاہدے کے مطابق جو کچھ پاکستان کے حصے میں آیا وہ اپنی مقدار اور تعداد کے اعتبار سے بہت کم تھا۔ اس پر مزید ستم ظریفی یہ ہوگئی کہ بھارت نے اسلحہ اور گولہ بارود کی جو کھیپ پاکستان بھیجی اس میں ناکارہ بندوقیں تھیں۔ جن کی بنیاد پر فوج منظم کرنی تو دور کی بات چھوٹی موٹی پولیس فورس کے لئے بھی یہ سازوسامان ناکافی تھا۔ اس پس منظر میں پاکستان کے پاس دو ہی راستے تھے کہ وہ مغربی دنیا بالخصوص امریکہ کی طرف دیکھے چونکہ سوویت یونین فطری طور پر بھارت کا حلیف تھا اور اسلام اور بالخصوص مذہب کی بنیاد پر بننے والی ریاست کو برداشت نہ کرنے والا ملک تھا۔ ملکی قیادت کے سامنے یہ سوال تھا کہ وہ فوج کو منظم کرنے کے لئے کہاں سے اسلحہ اور مدد حاصل کرے۔ اس تناظر میں پاکستان نے اپنے آپ کو مغربی دنیا کے ساتھ وابستہ کیا۔ ابتدائی عرصے میں پاکستان کو کچھ مالی اور عسکری مدد ملی بھی جس کی بنیاد پر فوج کی تنظیم نو کی گئی لیکن جلد ہی مغربی دنیا اور بالخصوص امریکہ کی طرف سے بھارت کی خوشامد کی کوشش کی جانے لگی۔ بالخصوص 1962ء میں بھارت اور چین کے درمیان جنگ ہوئی تو مغربی دنیا نے بھارت کی مالی اور فوجی امداد کے منہ کھول دیئے۔ چند ماہ ہی میں کروڑوں ڈالر کا اسلحہ بھارت پہنچ گیا۔ پاکستان نے بہت احتجاج کیا مگر کہیں بھی پاکستانی موقف کو پذیرائی نہ ملی۔ یہی وہ مرحلہ تھا جب پاکستان کی قیادت کو احساس ہوا کہ امریکہ اور مغرب کے لئے پاکستان ترجیح اول نہیں ہے بلکہ وہ بھارت کو ترجیح دیں گے۔ بعد میں 1965ء کی پاک بھارت جنگ میں یہ ثابت ہو گیا کہ امریکہ پاکستان کا دوست نہیں ہو سکتا کیونکہ اس نے مشکل کی اس گھڑی میں نہ صرف غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کیا بلکہ پاکستان کے لئے دفاعی پرزوں کی برآمد پر بھی پابندی لگا دی۔ 1962ء سے ہی پاکستان نے چین کے ساتھ دوستانہ مراسم استوار کرنے شروع کر دیئے تھے۔ 1963ء میں دونوں ممالک کے درمیان سرحدی معاہدہ بھی خوش اسلوبی سے طے پا گیا۔

چین نے پاکستان کو خود کفالت کا راستہ اختیار کرنے میں مدد دی۔ امریکہ اور مغرب کے بارے میں پاکستان کو اب کوئی شک و شبہ نہیں تھا۔ اس لئے خود پاکستان کی خواہش تھی کہ وہ دوسروں پر انحصار بند کر کے دفاعی خود کفالت کی شاہراہ پر گامزن ہو۔ ہیوی مکینیکل کمپلیکس واہ اس کا ایک شاندار نمونہ ہے۔ چین نے پاکستانی ہنرمندوں کو تربیت دی۔ محنت کے عادی پاکستانی انجینئروں اور جوانوں نے معجزے کر دکھائے۔

اس نمائش کا ایک بڑا اہم پہلو یہ بھی تھا کہ روایتی اسلحہ پاکستان کی ایکسپورٹ بڑھانے کا موجب بنے گا۔ اس وقت پاکستان کی برآمدات محض 8 ارب ڈالر کے برابر ہیں جبکہ ایک محتاط اندازے کے مطابق حکومت کا خیال ہے کہ وہ اگلے چند سالوں میں 10 ارب ڈالر کا اسلحہ فروخت کر سکتی ہے۔ میزائلوں کی فروخت سے کئی گنا زیادہ زرمبادلہ کمایا جا سکتا ہے۔ مگر ابھی پاکستان نے اس بڑے پیمانے پر ہتھیار فروخت کرنے کا فیصلہ نہیں کیا ہے۔ مگر بہرحال پاکستان کے پاس یہ آپشن ہر وقت موجود رہے گا۔

پاکستان اسلحہ سازی اور جوہری صلاحیت کے آج جس مقام پر ہے اس کا پس منظر بہت دلگداز ہے۔ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد تمام مسلمان فوجی یونٹوں کو ختم کر دیا گیا تھا۔ پورے ہندوستان میں 1947ء تک ایک بھی مسلمان یونٹ نہیں تھی جس میں مسلمانوں کو عددی برتری حاصل ہو۔ البتہ ہندو سکھ جاٹ اور گورکھا یونٹ قائم کی گئی۔ ان یونٹوں میں مسلمانوں کو رکھا جاتا تھا۔ مسلمانوں کی شجاعت اور بہادری کی وجہ سے آہستہ آہستہ برٹش آرمی کی کئی یونٹوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہو گئی۔ انگریز صوبہ پنجاب اور سرحد کے جوانوں کی ہمیشہ فوج میں شمولیت کی حوصلہ افزائی کرتے کیونکہ یہ بہترین جنگجو لوگ تھے۔

تقسیم ہند کے وقت یہ طے پایا تھا کہ جو جہاں کا باشندہ ہے وہ اپنے علاقے کی فوج میں رہے گا مگر اس میں یہ آسانی بھی تھی کہ اگر وہ مذہب کی بنیاد پر نقل مکانی کرتا ہے تو دوسرے ملک منتقل ہو کر وہاں کی فوج میں شامل ہو سکتا ہے۔ بظاہر ایک بڑا سادہ فارمولا تھا مگر یہ محض کاغذی فارمولا ہی رہا۔ حکومت برطانیہ نے فوجیوں اور اسلحے کی فہرستیں تیار کیں۔ نئے ملک کی نئی فوج کے حصے میں 508 یونٹ آئے جن میں سے 200 یونٹ پورے ہندوستان کی مختلف چھاؤنیوں میں تھے۔ صوبہ سرحد میں 32 بٹالین موجود تھیں مگر ان میں سے 18 خالص غیر مسلموں پر مشتمل تھیں اور باقی 14 مخلوط تھیں۔ ان میں ہندو سکھ جاٹ اور مسلمان سب شامل تھے۔

14 اگست 1947ء کو شمالی کمان کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل سر فرینک میسروی (Messervy) کو پاکستان آرمی کا پہلا آرمی چیف مقرر کیا گیا۔ کئی ماہ تک آرمی کو منظم کرنے میں صرف ہو گئے۔ طے پایا کہ ڈیڑھ لاکھ فوجی ایک لاکھ 60 ہزار آرڈیننس سٹورز 60 ہزار ٹن گولہ بارود اور 17000 گاڑیاں پاکستان کو دی جائیں گی۔ چونکہ اس زمانے میں پنجاب اور دہلی کے علاقے میں مسلمانوں کے خلاف سخت کشیدہ ماحول تھا اس لئے مسلمان افواج کو بمبئی کے راستے بحری جہازوں سے آنا پڑا۔ پورے ہندوستان سے مسلمان فوجیوں کو بمبئی کے عارضی کیمپ میں جمع ہونے اور پھر وہاں سے کراچی منتقل ہونے میں چھ ماہ لگ گئے۔ ایک لاکھ ساٹھ ہزار ٹن آرڈیننس سٹورز میں سے

فروری 1948ء میں صرف ڈھائی ہزار ٹن ملا۔ایک سال بعد 23ہزار ٹن اور مل گیا مگر باقی آرڈیننس آج تک بھارت کے پاس ہی ہے۔

یہ وہ پس منظر ہے جس میں پاکستان کے دفاع کی بنیادیں رکھی گئیں اور آج پاکستان بجا طور پر جدید اسلحہ رکھنے اور فروخت کرنے کا مجاز ہے۔

پاکستان کا ایٹمی مواد اور آلات برائے فروخت

سابق آرمی چیف جنرل مرزا اسلم بیگ کا تجزیہ

پاکستان نے بالآخر ایٹمی مواد و آلات بیچنے کا اعلان اور خرید و فروخت کا طریقہ کار اور شرائط بڑی تفصیل کے ساتھ اخبارات میں پورے صفحے کے اشتہار میں بیان کردی ہیں۔حکومت کا یہ فیصلہ بڑی اہمیت کا حامل ہے اور ایٹمی مواد اور آلات جو ماضی میں ایٹمی طاقتیں چھپ کر خریداروں کو بیچتی رہی ہیں' پاکستان نے اس غلط روایت سے ہٹ کر اس ٹیکنالوجی کو کھلم کھلا بیچنے کا فیصلہ کیا ہے۔لہذا ضروری ہے کہ اس منفرد فیصلے کا ایک مختصر تجزیہ کیا جائے تا کہ اس کی افادیت ظاہر ہو سکے۔

ایک مشہور کہاوت ہے کہ"جب تجارت اچھی ہو تو یہ اسے مشتہر کرنے کے وسائل خود مہیا کرتی ہے اور اگر خراب ہو تو اسے مشتہر کرنا ضروری ہوتا ہے"۔پاکستان کے معاملے میں موخر الذکر نظریہ اسے مشتہر کرنے کا سبب بنا جسے وزارت تجارت نے پاکستان اٹامک انرجی کمشن سے این او سی حاصل کر کے ایک پورے صفحے کے اشتہار کی صورت میں شائع کرایا تا کہ ایٹمی مواد اور آلات کو دنیا کی بہتری اور فلاح کے لئے استعمال کیا جا سکے۔یہ ایک مثبت فیصلہ ہے جس کا امریکہ کے صدر آئزن آور نے بھی وعدہ کیا تھا لیکن اسے عملی جامہ پہنانے سے قاصر رہے۔انہوں نے کہا تھا کہ"ایٹم امن کے لئے ہے۔عسکری طاقت نے ایٹم پر اجارہ داری حاصل کر لی ہے اور امن ایک خیال تصور بن کے رہ گیا ہے"۔جب ہیروشیما اور ناگاساکی پر امریکہ نے ایٹم بم برسائے تو اس نے اس امر کا اعادہ کیا کہ "ایٹمی ٹیکنالوجی کا علم دنیا کے ترقی پذیر ممالک کو منتقل کیا جائے گا تا کہ محروم لوگ بھی اس سے استفادہ کر سکیں"مگر امریکہ نے ایسا نہیں کیا۔

حکومت پاکستان کے اس فیصلے کے خلاف شکوک و شبہات ظاہر کئے جائیں گے کہ ایٹمی ٹیکنالوجی فروخت کرنے سے ایٹمی پھیلاؤ کو تقویت پہنچے گی جو درست نہیں اس لئے کہ یہ فیصلہ NPT کی شرائط کے عین مطابق ہے۔جیسا کہ اس معاہدے کے درج ذیل الفاظ سے ظاہر ہے۔"یہ اصولی طور پر طے پایا گیا ہے کہ ایٹمی صلاحیت سے اس معاہدے کے تمام فریق پر امن مقاصد کے لئے استفادہ کر سکیں گے۔مزید طے پایا کہ معاہدے کے تمام فریق صلاحیت کے پر امن مقاصد کے لئے اسے دوسرے ممالک کو منتقل کرنے کے مجاز ہوں گے"۔

NPT کے آرٹیکل 4 شق 1 اور 2 میں ایٹمی صلاحیت کے پر امن استعمال سے متعلق تفصیل بیان کی گئی ہے۔لیکن یہ امر افسوسناک ہے کہ پانچ بڑی ایٹمی طاقتوں نے ایٹمی ہتھیار بنا کر اسے اپنی اجارہ داری قائم رکھنے کے لئے استعمال کیا۔

پاکستان نے ہمیشہ برِ اعظم ایشیا میں طاقت کے توازن کو صحیح مقام پر قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔مثلاً 1974ء میں بھارت نے پہلا ایٹمی دھماکہ کیا تو پاکستان نے ایٹمی صلاحیت حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا اور بارہ سال کی مدت میں ایٹمی پروگرام کے تمام مقاصد حل کر لئے اور پھر بغیر کسی دباؤ کے اور مصلحت کو پیش نظر رکھتے ہوئے 1998ء میں اعتدال اور ٹھہراؤ کی پالیسی اپنائی جو آج تک قابل عمل ہے۔فرق صرف یہ ہے کہ آج سے تین سال پہلے بھارت کے دوسرے ایٹمی دھماکے کے جواب میں پاکستان نے اس سے بڑھ کر دھماکے کئے اور اپنی صلاحیت کا بھرپور مظاہرہ کیا۔دراصل پاکستان کی ٹھہراؤ کی پالیسی کے تقریباً وہی اجزا ہیں جو سی ٹی بی ٹی کے مسودے میں شامل ہیں مثلاً:

- ☆ بغیر ہتھیار بنائے نچلی سطح پر دفاعی صلاحیت برقرار رکھنا
- ☆ ایٹمی ہتھیاروں کے تجربوں پر پابندی
- ☆ اسلحے کے استعمال میں پہل کی مدافعت کا اختیار برقرار رکھنا۔
- ☆ ایٹمی افزودگی کے مواد کی پیداوار میں کمی۔
- ☆ ایٹمی مواد اور ٹیکنالوجی کی منتقلی پر پابندی۔

ان امور پر عمل کرنے کے لئے ایک کمانڈ اور کنٹرول سسٹم قائم کیا گیا جو ابھی تک موثر انداز میں کام کر رہا ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ پاکستان نے ٹھہراؤ کی پالیسی کسی بیرونی دباؤ کے نتیجے میں نہیں اپنائی بلکہ اسے اخلاقی قدروں کے فروغ کے لئے قائم رکھا ہے۔

پاکستان کو اپنی ایٹمی صلاحیت اور آلات کو فروخت کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔بالکل اسی طرح جیسا کہ ترقی یافتہ ممالک اپنی مختلف ٹیکنالوجی اور سامان بیچتے ہیں خصوصاً انفارمیشن ٹیکنالوجی جو تباہ کن ہتھیار بنانے میں بھی استعمال ہوتی ہے اور پر امن مقاصد کے لئے بھی۔اس لئے پاکستان کا یہ فیصلہ حق پر مبنی ہے اور خصوصاً اس وقت جبکہ پاکستان پر 1998ء کے ایٹمی دھماکے کے بعد سے جو پابندیاں لگائی گئی ہیں اور جس طرح کا اقتصادی دباؤ ڈالا گیا ہے اور جتنے مسائل پیدا کئے گئے ہیں ان کے جواب میں پاکستان کا یہ فیصلہ درست ہے۔

بڑے تعجب کی بات ہے کہ مغربی دنیا ہمارے قومی سلامتی کے مفادات' ہماری ایٹمی صلاحیت حاصل کرنے کے تقاضے اور ملک کی اقتصادی ترقی کی ضرورت کو نہ سمجھ سکے بلکہ اس کے برعکس مزید اقتصادی پابندیاں عائد کر دی گئیں تا کہ عام آدمی کی پریشانیوں میں اضافہ کر دیا جائے اور حکومتی نظام کو غیر متوازن کر دیا جائے۔بین الاقوامی مالیاتی ادارے (IMF) کے قرضوں کی ادائیگی کے لئے دباؤ پاکستان سے CTBT پر دستخط کرانے کے لئے ایک حربہ ہے۔

حکومت کی ایٹمی مواد فروخت کرنے کی پالیسی نہایت شفاف ہے اور اس میں کوئی ابہام نہیں پایا جاتا۔ایٹمی آلات کی فہرست بھی ظاہر کر دی گئی ہے اور خریدار کو یہ سرٹیفکیٹ دینے کی شرط بھی عائد کر دی گئی ہے کہ وہ یہ بتائے کہ اسے خریدنے والا کون ہے اور کس کام کے لئے استعمال کیا جائے گا۔پاکستان اس صلاحیت کا استعمال دوسرے ممالک کے ساتھ Share کرنا چاہتا ہے۔یہ خدشہ کہ اس سے ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ میں مدد ملے گی قطعاً غلط ہے۔ کئی ممالک زرمبادلہ کمانے کی خاطر اس صلاحیت کو خفیہ طریقوں سے فروخت کرتے رہے ہیں مثلاً سوویت یونین کی شکست و ریخت کے بعد بے شمار ایٹمی مواد بازاروں میں بکنے لگا جس پر نہ کوئی پابندی تھی اور نہ رکاوٹ۔یہ ایٹمی مواد کن ہاتھوں میں گئے' کسی کو اس کا علم نہیں' لیکن پاکستان نے زرمبادلہ کمانے کے لئے جو پالیسی اپنائی ہے وہ ایک باعزت طریقہ ہے۔آخر ایٹمی ٹیکنالوجی کو تعمیری اور مفید منصوبوں میں استعمال کے لئے فروخت کر کے زرمبادلہ کمانے میں کیا قباحت ہے۔درحقیقت پاکستان کے لئے اپنے قرضے ادا کرنے کا یہ ایک بہترین طریقہ ہے اور پاکستان قانونی طریقہ سے زرمبادلہ کمانے کا حق رکھتا ہے۔

سی ٹی بی ٹی کی تلوار پاکستان کی گردن پر

ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو منظر عام سے ہٹانے کی ایک بڑی وجہ سی ٹی بی ٹی کا اطلاق کرنا ہے مگر ماہرین کا کہنا ہے کہ سی ٹی بی ٹی کے اطلاق کا ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی ریٹائرمنٹ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لئے وہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ عالمی طاقتیں دراصل پاکستان کو یورینیم کی افزودگی کے عمل سے روکنا چاہتی ہیں اور ایک عرصے سے پاکستان پر ایٹمی پروگرام رول بیک کرنے کے لئے دباؤ ڈالتی رہی ہیں۔ مگر ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور ایٹمی توانائی کا ادراک رکھنے والے سی ٹی بی ٹی اور اس طرز کی متعدد پابندیوں کے خلاف ہیں۔ اگر پاکستان سی ٹی بی ٹی پر دستخط کر دیتا ہے تو اسے لامحالہ ان پابندیوں کا بھی سامنا کرنا پڑے گا جن کے نتیجے میں پاکستان رول بیک کرے گا اور یوں یورینیم کی افزودگی کا عمل متاثر ہو گا۔ لہذا مبینہ طور پر حکومت نے طے کر لیا ہے کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو کہوٹہ سے ہٹا دیا جائے۔ اور ان کی جگہ کسی دوسرے سائنسدان کو کہوٹہ کی عملداری سونپ دی جائے۔ جو یقیناً اس پراجیکٹ کو طے شدہ شیڈول کے تحت چلائیں گے جس سے یورینیم کی افزودگی کا عمل تعطل پذیر ہو جائے گا۔

یہ سی ٹی بی ٹی کی دہشت ہے یا اندرونی سازشوں کا تانا بانا کہ جن کی بنا پر ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو کہوٹہ سے ہٹا دیا گیا ہے حالانکہ اب ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور ڈاکٹر ثمر مبارک بھی کہہ چکے ہیں کہ سی ٹی بی ٹی پر دستخط کرنے کا اختیار حکومت کو حاصل ہے۔ اگر وہ مناسب سمجھتی ہے کہ ہم نے ملکی سلامتی کے دفاع اور توانائی کی ترقی کے لئے یقینی صلاحیت حاصل کر لی ہے اور اس کو بڑھانے کی مزید ضرورت نہیں ہے تو حکومت اس معاہدے پر دستخط کرنا چاہے تو کر دے۔ بین السطور میں دونوں معتبر سائنسدانوں نے جن خدشات و توقعات کا اظہار کیا ہے اس سے ان کے اصل موقف سے بھی آگاہی حاصل ہوتی ہے کہ درحقیقت سی ٹی بی ٹی پر دستخط انہیں گوارا نہیں۔ ظاہر ہے جب تک وہ اپنے عہدوں پر رہیں گے ملک بیرونی طاقتوں کے لئے پریشانی کا باعث بنا رہے گا۔

سی ٹی بی ٹی سے ایٹمی پاکستان کو بہت سے خدشات لاحق رہیں گے اور پاکستان کو ایک بار پھر اس مقام پر تنہا اور نہتا کھڑا کر دیا جائے گا جہاں وہ کہوٹہ پراجیکٹ کے آغاز سے قبل کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر بھارت کے آگے پھینک دیا جائے گا۔ سی ٹی بی ٹی سے پاکستان کی سلامتی کو کیا خطرات لاحق ہیں مناسب ہے کہ اس کا بہترین تجزیہ اور نکات پیش کرنے کے لئے پاکستان کے چند جید تجزیہ نگاروں کے مضامین پر نظر دوڑا لیں جو انہوں نے سی ٹی بی ٹی کے حوالے سے تحریر کئے ہیں۔

سابق سکریٹری خارجہ محمد اکرم ذکی صاحب نے روزنامہ "نوائے وقت" میں شائع ہونے والے اپنے ایک طویل مضمون میں سی ٹی بی ٹی کے مندرجات اور ان سے لاحق خطرات پر مفصل روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ کمپری ہینسو ٹیسٹ بین ٹریٹی (سی ٹی بی ٹی) جنیوا میں ہونے والی تحدید اسلحہ کانفرنس میں ہوئی اور اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ۱۰ ستمبر ۱۹۹۶ء کو اس کی منظوری دی۔ پاکستان سمیت ۱۵۸ ووٹ اس کی حمایت میں ڈالے گئے جبکہ ۵ ممالک نے ووٹ نہ دیا اور بھارت، لیبیا، بھوٹان نے اس کے خلاف ووٹ دیا۔

بھارت کئی برس سے ایٹمی طاقتوں کی طرف سے حمایت نہ کئے جانے کے باوجود سی ٹی بی ٹی کے حق میں تھا لیکن جب یہ واضح ہو گیا کہ اس حوالے سے اتفاق رائے ظاہر ہو رہا ہے تو بھارت نے اسے اپنی نیوکلیئر آپشنز کے لئے ایک خطرہ قرار دینا شروع کر دیا۔ نومبر ۶۵ء تک بھارت نے نئی تجاویز دینی شروع کر دیں کہ ایک مخصوص تاریخ تک مکمل ایٹمی Disarmament ہو جائے۔ بالآخر اس نے یہ کہا کہ اگر اسے اس معاہدے پر دستخطوں کے لئے کہا گیا تو وہ اس معاملے سے الگ ہو جائے گا۔

روس، برطانیہ، چین اور پاکستان اس بات سے اتفاق نہیں کر سکتے تھے کہ بھارت کو اس معاہدے سے باہر رکھا جائے۔ انہوں نے اس بات پر اصرار کیا اور ایک سمجھوتہ کیا کہ وہ تمام چوالیس ممالک جن کے پاس ایٹمی ریکٹر کام کر رہے ہیں اس معاہدے پر ضرور دستخط کریں اور اس کے نافذ العمل ہونے سے قبل اس کی توثیق کریں۔ اب تک چوالیس میں سے اکتالیس ممالک دستخط کر چکے ہیں جبکہ بھارت، پاکستان اور جنوبی کوریا نے نہیں کئے۔

۴۴ میں سے ۲۶ توثیق کر چکے ہیں امریکہ، روس اور چین نے توثیق نہیں کی۔ امریکی سینٹ تو اس معاہدے کو مسترد ہی کر چکی ہے۔ مستقبل قریب میں اس معاہدے کے نافذ العمل ہونے کے بہت کم امکانات ہیں اس لئے پاکستان کو اس معاملے میں کوئی فیصلہ کرتے ہوئے عجلت نہیں کرنی چاہیے اور اس کے تمام مضمرات کا جائزہ لے لینا چاہیے۔

جزوی ٹیسٹ بین ٹریٹی:

سی ٹی بی ٹی دراصل پی ٹی بی ٹی یا Partial Test Ban Treaty کا شاخسانہ ہے جو ۵ اگست ۱۹۶۳ء کو امریکہ، برطانیہ اور روس کے کہنے پر منظور ہوئی اور ۱۰ اکتوبر ۶۳ء کو نافذ العمل ہوئی۔ اس کے تحت بیرونی فضا، زیر آب اور اوپری فضا میں ایٹمی دھماکوں پر پابندی لگا دی گئی جبکہ سی ٹی بی ٹی کا مقصد یہ تھا کہ مکمل اور جامع پابندی لگا دی جائے۔ بھارت نے پی ٹی بی ٹی پر ۱۹۶۳ء میں دستخط کئے تھے لیکن ۸۸ء تک اس کی توثیق نہیں کی تھی۔

نیوکلیئر ٹیسٹ:

امریکہ پہلا ملک تھا جس نے ۱۶ جولائی ۱۹۴۵ء کو ایٹمی دھماکہ کیا تھا اور اس کے تین ہفتے بعد اس خوفناک ہتھیار کی پوری طاقت جاپانی شہروں ہیروشیما (۶ اگست) اور ناگاساکی (۹ اگست ۴۵ء) پر آزما ڈالی جس سے تاریخ انسانی کی بدترین تباہی ہوئی۔

دوسرا ملک روس تھا جس نے ۱۹۴۹ء میں ایٹمی دھماکہ کیا اور برطانیہ ۱۹۵۲ء میں غیر اعلان شدہ ایٹمی طاقت بن گیا۔ تینوں ایٹمی طاقتوں نے بنیادی طور پر ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۱ء تک ایٹمی دھماکوں پر پابندی سے اتفاق کیا تھا اور اس شعبے میں اپنی اجارہ داری قائم رکھنے اور دوسرے ممالک کو اتفاقی طور پر ایٹمی طاقتیں بن جانے سے روکنے کے لئے PTBT کا قدم اٹھایا تھا۔

فرانس نے ڈیگال کی حکومت کے دوران ۱۹۶۰ء میں تین ایٹمی دھماکے کئے تھے۔ ۵ اگست ۱۹۶۳ء کو جب امریکہ ۳۳۱، روس ۲۱۶، فرانس ۸ اور برطانیہ ۲۳ دھماکے کر چکا تھا تو PTBT کو حتمی شکل دی گئی۔ چین ابھی ایٹمی طاقت ظاہر نہیں کیا گیا تھا۔ اس وقت فرانس اور چین پی ٹی بی ٹی میں شریک نہیں ہوئے تھے چین نے اپنی ایٹمی استعداد کا مظاہرہ اکتوبر ۱۹۶۴ء میں کیا تھا۔

نان پرولی فیریشن ٹریٹی (NPT):

ایٹمی اسلحہ کا پھیلاؤ روکنا مغربی اقوام کا سب سے بڑا مسئلہ بن چکا ہے اگرچہ وہ اس بات میں تو کامیاب نہیں ہو سکے کہ چین کو ایٹمی استعداد کے حصول سے روک سکیں البتہ ان کی ایٹمی اسلحہ کے پھیلاؤ کو روکنے کی جدوجہد زیادہ سنجیدگی سے شروع ہو گئی اور انہوں نے اس بارے میں ایک معاہدہ کرنے کے مذاکرات شروع کر دیئے، جو جنیوا میں ۱۹۶۸ء کو ہوا اور ماسکو، واشنگٹن اور لندن میں اس پر دستخط ہوئے۔ یہ ۵ مارچ ۱۹۷۰ء سے نافذ العمل ہوا۔ اس معاہدے کے تحت امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس اور چین کو ایٹمی طاقتیں مانا گیا۔ دوسرے تمام ممالک کو ایٹمی ہتھیار رکھنے والے ممالک بننے کا حق نہیں دیا گیا۔ بھارت اور بعض دوسرے ممالک نے اسے ایک امتیازی معاہدہ قرار دیا اور اس کی مذمت کی۔ پانچ ایٹمی طاقتوں نے یہ ذمہ داری قبول کی کہ وہ دیگر ممالک کو ایٹمی ٹیکنالوجی منتقل نہیں کریں گے نہ ہی غیر ایٹمی ممالک کی حوصلہ افزائی کریں گے کہ وہ ایٹمی ہتھیار تیار کریں (آرٹیکل نمبر ایک)۔ غیر ایٹمی ممالک کے لئے کوئی ایسا پروگرام شروع کرنے کی ممانعت کر دی گئی جس کا مقصد ایٹمی ہتھیار حاصل کرنا ہو (آرٹیکل ۱۱)۔

ایٹمی ممالک نے یہ عزم بھی کیا کہ وہ ایٹمی ہتھیاروں کی دوڑ روک دیں گے، اپنے ایٹمی ہتھیاروں کے ذخائر کم کرنے کے مذاکرات کریں گے اور ایٹمی تحدید اسلحہ کے لئے کام کریں گے (آرٹیکل ۶)۔ انہوں نے یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ غیر ایٹمی ممالک کو پرامن مقاصد کے لئے ایٹمی ٹیکنالوجی کی کھلی منتقلی کریں گے۔ ان ممالک کا یہ حق انہوں نے تسلیم کر لیا کہ انہیں پرامن مقاصد کے لئے ایٹمی توانائی کے شعبے میں ریسرچ اور تیاری کا ناقابل تنسیخ حق حاصل ہے (آرٹیکل ۵) ایٹمی ممالک نے نہ تو یہ وعدے پورے کئے اور نہ ہی انہیں سنجیدگی سے لیا ہے۔ چین اور فرانس نے این پی ٹی پر ۱۹۹۲ء تک دستخط نہیں کئے تھے۔ چین نے اسے ۹ مارچ ۱۹۹۲ء، فرانس نے ۳ اگست ۱۹۹۲ء کو قبول کیا۔ مارچ ۱۹۹۳ء میں شمالی کوریا پہلا ملک تھا جس نے این پی ٹی سے علیحدگی اختیار کی۔

پاکستان اور بھارت نے بھی اس پر دستخط نہیں کئے ہیں۔ پاکستان کا موقف رہا ہے کہ اگرچہ وہ ایٹمی تحدید اسلحہ کا حامی ہے لیکن وہ اس وقت تک دستخط نہیں کرے گا جب تک بھارت ایسا نہیں کرتا کیونکہ وہ خود کو بھارت کے مقابلے میں کمتر پوزیشن میں نہیں لا سکتا۔

۱۹۷۹ء میں پاکستان نے تجاویز دیں کہ بھارت اور پاکستان بیک وقت انٹرنیشنل اٹامک انرجی ایجنسی کے تحفظات قبول کریں۔ بھارت نے ان تجاویز کو رد کر دیا جس طرح اس نے پاکستان کی طرف سے تحدید اسلحہ کی بہت سی دیگر تجاویز کو رد کر دیا۔

این پی ٹی کے نافذ العمل ہونے کے پچیس برس بعد جنیوا میں ایک ریویو کانفرنس ہوئی۔ بہت سے ممالک نے کوشش کی کہ ایٹمی اسلحہ رکھنے والے ممالک اپنے وعدے پورے کرنے کے لئے کسی مدت یا تاریخ کا تعین کر دیں لیکن وہ کامیاب نہ ہوئے اور این پی ٹی میں ترامیم کے بغیر غیر معینہ مدت کے لئے توسیع کر دی گئی۔ اس وقت سے ایٹمی طاقتیں مصر ہیں کہ غیر ایٹمی طاقتیں اپنی اس پوزیشن میں این پی ٹی قبول کریں۔ ظاہر ہے کہ مئی ۱۹۹۸ء کے ایٹمی دھماکوں کے بعد پاکستان کے لئے یہ ناممکن ہو چکا ہے کہ وہ ایک غیر ایٹمی طاقت کے طور پر ٹریٹی میں شریک ہو اور ہمیں یہ کوشش جاری رکھنی چاہیے کہ ہمارے حقیقتاً ایٹمی تشخص کو قبول کیا جائے۔ رول بیک کا تو سوچا ہی نہیں جا

سکتا۔

مئی ۱۹۹۸ء سے قبل پاکستان کا موقف:

مئی ۹۸ء کے دھماکوں سے قبل پاکستان ایٹمی تحدید اسلحہ کا پرجوش حامی تھا۔۱۹۷۴ء میں بھارت کے پہلے ایٹمی دھماکے کے بعد اس نے جنوبی ایشیا میں ایٹمی ہتھیاروں سے آزاد علاقہ قائم کرنے کی تجویز دی اور اس کے بعد ہر سال اقوام متحدہ میں اس بارے میں قراردادیں پیش کرتا رہا جس کی وسیع پیمانے پر حمایت ہوئی لیکن بھارت نے یہ تمام تجاویز مسترد کر دیں۔

یہ تجاویز اس طرح تھیں:

۱۔۱۹۷۸ء............بھارت اور پاکستان کو مشترکہ طور پر اعلان کرنا چاہیے کہ وہ ایٹمی ہتھیار تیار کریں گے نہ حاصل کریں گے۔

۲۔۱۹۷۸ء............ایک دوسرے کی ایٹمی تنصیبات کا باہمی معائنہ کیا جائے۔

۳۔۱۹۷۹ء............دونوں ملک بیک وقت این پی ٹی قبول کر لیں۔

۴۔۱۹۷۹ء............دونوں اپنی تمام نیوکلیئر تنصیبات پر آئی اے ای اے کے تحفظات قبول کریں۔

۵۔۱۹۸۷ء............باہمی/علاقائی سطح پر ایٹمی دھماکوں پر پابندی لگا دی جائے۔

۶۔۱۹۹۱ء............امریکہ، روس، چین، بھارت اور پاکستان، پانچ ممالک پر مشتمل ایک کانفرنس بلائی جائے جو جنوبی ایشیا میں ایٹمی اسلحہ کے عدم پھیلاؤ کے بارے میں ہو۔

۷۔۱۹۹۳ء............جنوبی ایشیا میں "زیرو میزائل رجیم" قائم ہو۔یعنی کوئی ملک میزائل سازی نہ کرے۔

۸۔۱۹۹۷ء............بھارت اور پاکستان جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کریں۔

کیمیاوی ھتھیار:

۱۹۹۲ء میں پاکستان نے بھارت کو تجویز دی تھی کہ وسیع پیمانے پر تباہی لانے والے تمام ہتھیاروں پر پابندی کا سمجھوتہ کر لیا جائے۔مثلاً ایٹم بم، حیاتیاتی ' کیمیکل ہتھیار، میزائل۔اے بی سی ایم بھارت نے صرف کیمیاوی ہتھیاروں کے حوالے سے ردعمل ظاہر کیا کہ اس پر بات ہو سکتی ہے۔دونوں ممالک نے اگست ۹۲ء میں انڈو پاک باہمی معاہدے پر اتفاق کیا جس کے تحت کیمیاوی ہتھیاروں کی تیاری کی جائے گی نہ ہی یہ اپنے پاس رکھے جائیں گے۔جب بھارت نے کیمیاوی ہتھیاروں کے کنونشن میں شرکت کی تو اس نے کیمیائی ہتھیاروں کے ذخیرے کی تفصیل ظاہر کی۔ یہ ذخیرہ اس نے ۱۹۹۲ء کے انڈو پاک سمجھوتے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کر رکھا تھا۔

بھارت نے پاکستان کی تحدید اسلحہ کے بارے میں نہ تو کوئی تجویز مانی اور نہ ہی اپنے وعدے پورے کئے۔

مئی ۱۹۹۸ء میں جب بھارت نے ایٹمی دھماکے کئے تو پاکستان کو دھمکانا شروع کر دیا۔عالمی برادری نے ان بھارتی دھمکیوں کا سنجیدگی سے نوٹس نہ لیا۔پاکستان اپنے دفاع کے لئے اور فوجی اور نفسیاتی توازن قائم رکھنے کے لئے خود بھی ایٹمی دھماکے کرنے پر مجبور ہو گیا۔ماضی میں تحدید اسلحہ کے لئے جو بھی تجاویز دی گئی تھیں وہ بے معنی ہو کر رہ گئیں۔

سٹریٹجک ریسٹرینٹ رجیم: (Strategic Restraint Regime)

۱۹۹۸ء میں پاکستان نے بھارت کو ایٹمی اور روایتی شعبوں میں اس بارے میں تجویز دی ایٹمی شعبے میں تحمل و استحکام کی امن تجاویز کے جواب میں بھارت نے نئے ایٹمی ڈاکٹرائن کا اعلان کیا جو ایک بڑے ایٹمی ہتھیاروں کے ذخیرے اور بری فوج' بحریہ اور فضائیہ میں ڈیلیوری سسٹم کے حوالے سے تھا۔پاکستان کے پاس اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں رہ جاتا تھا کہ وہ اپنے سلامتی کے معاملات کا تحفظ کرے۔پاکستان نہ تو ایٹمی ہتھیاروں کی دوڑ چاہتا تھا اور نہ ہی بہت سے ہتھیاروں کے معاملے میں بھارت سے مسابقت چاہتا تھا بلکہ یہ چاہتا تھا کہ وہ کم از کم سطح پر ایک با اعتبار ایٹمی ڈیٹرنٹ حاصل کر لے جو متنوع بھی ہو اور بھارت کی ہر دم بڑھتی ہوئی ایٹمی صلاحیت سے مطابقت بھی رکھتا ہو۔پاکستان نے مزید ایٹمی تجربات نہ کرنے کا اعلان کیا ہوا ہے لیکن وہ مزید ایٹمی دھماکوں کا آپشن نہیں چھوڑ سکتا نہ ہی اس بات سے اتفاق کر سکتا ہے کہ ایٹمی مواد کی تیاری روک دے گا۔

ایٹمی مواد کی تیاری روک دینے کا معاھدہ:

ایٹمی قوتوں کی یہ خواہش بھی ہے کہ جنیوا میں مذاکرات شروع ہوں تاکہ ان کے نتیجے میں ایٹمی مواد کی تیاری روکنے کے کنونشن کی تکمیل ہو جائے۔اس کنونشن کے خاتمے سے قبل وہ یہ چاہتے ہیں کہ تمام ممالک ایٹمی مواد کی تیاری فوری طور پر روک دیں۔اگر وہ ملک اس بات کو قبول کر لیں جو کسی بھی وقت ایٹم بم بنا لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں تو پھر وہ این پی ٹی کو قبول کرنے کا بالواسطہ قدم اٹھا لیتے ہیں کیونکہ نہ تو وہ ایٹمی ہتھیار بنا سکیں گے نہ انہیں ٹیسٹ کر سکیں گے۔

ھتھیاروں کا ذخیرہ:

پاکستان کو FMCT کی تیاری کے مذاکرات کے لئے تیار رہنا چاہیے تاکہ ہم جان سکیں کہ بالآخر کس طرح کا کنونشن ظہور پذیر ہو گا۔ایک بہت اہم سوال ایٹمی مواد کے ذخیرے کا ہے۔پاکستان کی سلامتی کے لئے سب سے بڑا خطرہ بھارت سے ہے۔پاکستان کی ایٹمی مواد کی تیاری اور بھارت کے ایٹم اور ایٹمی مواد کے ذخیرے میں بہت بڑا فرق ہے۔اس لئے FMCT اس طرح ہونا چاہیے کہ وہ علاقائی توازن کا احاطہ کرتا ہو۔بظاہر پاکستان یہ ذمہ داری قبول نہیں کر سکتا کہ وہ FMCT پر دستخط ہو جانے سے پہلے ہی اور موجودہ ذخیرے کا سوال اٹھائے بغیر ہی ایٹمی مواد کی تیاری بند کر دے گا۔

لیبارٹری ٹیسٹ:

سی ٹی بی ٹی بظاہر تجربات پر پابندی کا ایک معاہدہ ہی ہے' اس لئے سی ٹی بی ٹی کا جواز پیش کرنا اس بات پر اکتفا کر لینے میں ہے۔اس کا مطلب ایٹمی استعداد رول بیک کرنا نہیں نہ ہی یہ ہمیں اپنے ہتھیاروں کی کارکردگی بہتر بنانے سے روکتا ہے کیونکہ معیار اور تعداد دونوں حوالوں سے دھماکوں کے لیبارٹری ٹیسٹوں کی اجازت ہے۔یہ نہیں دیکھا جاتا کہ اس شعبے میں ہماری صلاحیت کیا ہے۔سوال یہ ہے کہ کمپیوٹروں کے شعبے میں ہماری صلاحیت کیا ہے؟

امریکہ نے 1052 ٹیسٹ کئے ہیں اور اس کے پاس دنیا کے جدید ترین کمپیوٹر ہیں لیکن امریکی لیڈر یہ احساس کرتے ہیں کہ اگر انہوں نے سی ٹی بی ٹی پر دستخط کر دیئے تو حقیقی ایٹمی دھماکوں کے بغیر ان کی ہتھیاروں کو بہتر بنانے کی صلاحیت کمزور ہو جائے گی۔روس نے ایک ہزار دھماکے کئے ہیں۔وہ بھی لیبارٹری ٹیسٹوں کے قابل اعتبار ہونے کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔اس طرح چین بھی ایسے تجربات پر انحصار کے لئے تیار نہیں۔پاکستان جس نے صرف چھ دھماکے کئے ہیں اور جس کی کمپیوٹر صلاحیت محدود ہے وہ کس طرح دھماکوں کا آپشن مسترد کر سکتا ہے۔اگر ہمیں بھارت کے مقابلے میں کم از کم حد تک قابل اعتبار ڈیٹرنس قائم رکھنا ہے تو پھر ضروری ہے کہ ہم ریسرچ اور ڈویلپمنٹ کا کام کریں۔بھارت کے نئے ایٹمی ڈاکٹرائن میں اس کی تینوں مسلح افواج کو ایٹمی ہتھیار فراہم کئے جائیں گے۔زمین پر موبائل لانچرز ہوں گے۔وہ ۴۰۰ ایٹمی ہتھیار بنائے گا جس کا وسیع ڈیلیوری سسٹم ہو گا۔ظاہر ہے کہ پاکستان کا کم از کم حد تک با اعتبار ڈیٹرنٹ متنوع ہونا چاہیے' یہ ایک جامد نظریہ نہیں' کیونکہ اس کا تعلق بھارت کی بڑھتی ہوئی صلاحیت سے ہو گا۔اس بات کی دلیل دی جاتی ہے کہ بھارت نے ایک ایسی ایٹمی ڈاکٹرائن تیار کر لی ہے جس پر کبھی عمل نہیں ہو سکے گا۔لیکن بھارت نے اپنے دفاعی بجٹ میں ۳ ارب ڈالر کا جو اضافہ کیا ہے اس کے بعد اس کے ایٹمی پروگرام کے نفاذ کے بارے میں اگر کوئی شبہات ہیں انہیں سنجیدگی سے لیا جانا چاہیے۔

لچکدار ردعمل کے ٹیکنیکل ایٹمی ھتھیاروں کی ضرورت:

اگر ہم یہ قبول بھی کر لیں کہ پاکستان نے کم از کم حد تک قابل عمل ڈیٹرنٹ حاصل کر لیا ہے۔تو بھی سٹریٹجک ڈیٹرنٹ ہی ایک بڑی جنگ روک سکتا ہے۔شاید اسی وجہ سے اب بھارت ایک محدود جنگ کے نظریہ کو اجاگر کر رہا ہے۔ایک محدود حملے کی صورت میں ایٹمی ہتھیار پکڑ لینا ممکن نہیں۔پاکستان کو چاہیے کہ وہ ایک لچکدار اور مناسب ردعمل کی اہلیت حاصل کرے جس کے ذریعے دھمکی یا چیلنج سے نمٹا جا سکے۔اس صلاحیت کا مطلب ہے کہ ہمارے پاس روایتی ہتھیار، ٹیکنیکل نیوکلیئر ہتھیار اور سٹریٹجک نیوکلیئر ہتھیار ہونے چاہئیں۔

چنانچہ یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے روایتی ہتھیاروں کو جدید بنائیں اور ٹیکنیکل نیوکلیئر ہتھیار بنائیں بھی اور ٹیسٹ بھی کریں جو ایک محدود جنگ میں ڈیٹرنٹ کا کام دیں۔سی ٹی بی ٹی پر دستخطوں کے بعد یہ ممکن نہیں ہو گا۔

پہلے یوم تکبیر پر

ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا انٹرویو

س: ڈاکٹر عبدالقدیر صاحب! 28 مئی کو یوم تکبیر منایا جا رہا ہے آپ یہ بتائیں کہ پاکستان کی تاریخ میں یوم تکبیر کی کیا اہمیت ہے۔اس دن نے پاکستان کو اقوام عالم میں کیا مقام دلایا ہے؟

ج: اس دن نے پاکستان کے وقار میں اضافہ کر دیا ہے ہر پاکستانی کو اس بات کا احساس ہو گیا ہے کہ اس کے ملک کی سلامتی کا تحفظ ہو گیا ہے۔لوگوں میں سکون و اطمینان کی کیفیت پائی جاتی ہے اب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے کوئی دشمن پاکستان کی طرف میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا اور نہ ہی کوئی ملک پاکستان کو بلیک میل کر سکتا ہے۔دنیائے اسلام میں پاکستان کے بارے میں ایک مبہم سی تصویر تھی اب ان کو ایک طاقتور اور مضبوط پاکستان نظر آ رہا ہے پہلے ہر کوئی عالم اسلام کی قیادت کے دعوے کرتا تھا ایٹمی قوت بننے کے بعد پورا عالم اسلام پاکستان کی طرف دیکھ رہا ہے۔پاکستان نہ صرف ایٹمی قوت بن گیا ہے بلکہ اس نے میزائل سازی کے کئی مراحل بھی طے کر لئے ہیں۔پاکستان اب میزائل سازی کی صنعت میں بھارت سے پیچھے نہیں۔یہ سب کچھ وزیراعظم محمد نواز شریف کی سیاسی

بصیرت سے ممکن ہوا۔ انہوں نے دنیا پر یہ ثابت کر دکھایا کہ انہیں ڈرا دھمکا کر یا لالچ دے کر نیوکلیئر پروگرام اور میزائل سازی سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہیں کیا جا سکتا لہٰذا انہوں نے ملکی مفاد کو پیش نظر رکھ کر جو قدم اٹھایا اس کے نہ صرف مثبت نتائج برآمد ہوئے بلکہ پوری قوم نے ان کے فیصلوں کی تائید کی۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے 28 مئی 98ء نے پاکستان کو ایٹمی قوت بنایا ہے اس لحاظ سے یوم تکبیر آنے والی صدی میں ایک یادگار دن کے طور پر منایا جاتا رہے گا۔ اب ہمیں اپنی تمام تر توجہ سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی پر مرکوز کر دینی چاہیے۔ پاکستان کو عظیم انجینئر پیدا کرنے کی منصوبہ بندی کرنی چاہیے۔

س: پاکستان کے اندر اور باہر ایک لابی مسلسل اس بات کا پراپیگنڈہ کر رہی ہے کہ ایٹمی دھماکوں نے پاکستان کی معیشت کو بری طرح دھچکا پہنچایا ہے؟

ج: ایٹمی دھماکوں سے پاکستان کی معیشت کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ ملکی معیشت کے بارے میں کچھ فیصلوں کے منفی اثرات تو مرتب ہو سکتے ہیں لیکن ان فیصلوں کا ایٹمی دھماکوں سے کوئی تعلق نہیں۔ پاکستان کے ایٹمی قوت بننے سے جو قوت حاصل ہوئی ہے اور ملک کو جو تحفظ حاصل ہوا ہے اس کی تو ہم کوئی بھی قیمت ادا کرنے کے لئے تیار ہیں۔ وزیراعظم نے خود کہا ہے کہ فارن کرنسی اکاؤنٹس منجمد کرنے کا فیصلہ درست نہ تھا۔ فارن کرنسی اکاؤنٹس منجمد کرنے سے لوگوں کا حکومت پر سے اعتماد اٹھ گیا جو بڑی مشکل سے بحال ہوگا"۔

س: ایٹمی قوت بننے کے لئے اظہار کی ضرورت لازمی ہوتی ہے؟

ج: پاکستان نے تو دسمبر 1984 میں نیوکلیئر ہتھیار بنا لئے تھے ہمارے پاس ریکارڈ موجود ہے میں نے اس وقت کے جنرل ضیاء کو لکھ بھیجا تھا کہ اگر آپ حکم دیں تو ایک ہفتے کے نوٹس پر ایٹمی دھماکے کر سکتے ہیں لیکن اس وقت محض اس لئے ایٹمی دھماکہ نہیں کیا گیا کہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ جب بھارت نے ایٹمی دھماکے کئے اور بھارتی قیادت پاکستان کو دھمکی آمیز پیغامات ارسال کرنے لگی تھی تو ہم نے بھی یہی فیصلہ کر لیا کہ پاکستان کی سلامتی کے لئے ایٹمی دھماکہ ضروری ہے وزیراعظم نے ایٹمی دھماکے کرنے کے بارے میں ایک بار فیصلہ کر لیا تو پھر انہوں نے اس سلسلے میں کوئی دباؤ قبول نہیں کیا۔ اگر ایٹمی دھماکے نہ کئے جاتے تو پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے بارے میں شکوک و شبہات کا اظہار کیا جاتا عوام کا مورال بھی گر جاتا پھر ہمارے دشمن بھی یہ بات برملا کہتے کہ ہمارے پاس ایٹم بم بنانے کی صلاحیت نہیں"۔

س: ڈاکٹر صاحب! اہل دانش اور سائنس و ٹیکنالوجی سے دلچسپی رکھنے والوں کی رائے ہے کہ ایٹمی پروگرام میں مزید ایک قدم آگے بڑھنے کی ضرورت ہے اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج: میری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ اس میدان میں جتنا کچھ ہم نے کرنا تھا وہ کافی ہے اب ہمیں سائنس و ٹیکنالوجی کے فروغ پر توجہ دینی چاہیے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی یونیورسٹیاں اور تعلیمی ادارے بنانے چاہئیں۔ دنیا میں ترقی کا ایک ہی راستہ ہے ہمیں صحیح مسلمان بننے کی کوشش کرنی چاہیے اللہ تعالیٰ اور نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونا چاہیے"۔

س: ڈاکٹر صاحب! آپ نے قوم کو ایٹم بم کا تحفہ دے کر ملک کو ناقابل تسخیر بنا دیا ہے یہ بات ریکارڈ پر موجود ہے کہ ایک لابی نے آپ سے یہ کریڈٹ چھیننے کی کوشش کی تھی اس سلسلے میں کی جانے والی شعوری کوششیں آپ نے کس طرح ناکام بنائیں؟

ج: منافق میرے بارے میں جو چاہے کہیں میں تو اپنے اللہ پر بھروسہ کر کے کام جاری رکھے ہوئے ہوں اگر کسی کو میرے کام کے بارے میں ذرا بھر شبہ ہے وہ راجہ بازار گوالمنڈی' قصہ خوانی' طورخم یا کسی اور جگہ چلا جائے عوام خود فیصلہ کر دیں گے کہ کس نے قوم کے لئے کیا کیا ہے؟ کچھ لوگوں کو تو بے وقوف بنایا جا سکتا ہے لیکن پوری قوم کو بے وقوف نہیں بنایا جا سکتا۔ ڈاکٹر خان کا نام تاریخ میں لکھا گیا اس نے قوم کے لئے جو خدمات انجام دی ہیں ان سے پوری قوم واقف ہے مجھے اس سلسلے میں ڈھنڈورا پیٹنے کی ضرورت نہیں۔

س: پاکستان کے ایٹمی قوت بننے کے بعد آپ کی سماجی مصروفیات میں کچھ اضافہ ہوا؟

ج: میں نے تو اپنے آپ کو سائنس و ٹیکنالوجی کے فروغ کے لئے وقف کر دیا ہے کہوٹہ اور میانوالی میں دو پولی ٹیکنیک بنائے ہیں۔ کراچی میں نیشنل ہیلتھ کا انسٹیٹیوٹ بنا رہے ہیں ہم ہمدرد یونیورسٹی میں ریسرچ سنٹر بنا رہے ہیں۔ الشفاء آئی ہسپتال میں میرے نام سے پوسٹ گریجوایٹ ریسرچ سنٹر منسوب کیا گیا ہے۔

س: سیٹلائٹ لانچنگ سسٹم شروع کیا گیا تھا لیکن بدر II ابھی تک لانچ نہیں ہو سکا؟

ج: سپارکو سیٹلائٹ لانچنگ کا کام کر رہی ہے ڈاکٹر عبدالمجید کا شمار قابل قدر سائنسدانوں میں ہوتا ہے انہوں نے بدر II بنا کر روس بھجوا دیا ہے وہاں اس کی جانچ پڑتال ہو رہی ہے روسی راکٹ اسے لانچ کرے گا سائنسی کام میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔

س: آپ کے ہاں بھی تو لیزر ٹیکنالوجی پر کام ہو رہا ہے؟

ج: اس پر ہم کام کر رہے ہیں اسے ہم یورینیم کی انرچمنٹ کے لئے بھی استعمال کرتے ہیں اسے صنعتی مقاصد کے لئے بھی استعمال کیا جا رہا ہے۔

س: یہ ڈیفنس کے لئے بھی تو استعمال ہوتی ہے؟

ج: ہم اس کے لئے لیزر بنا رہے ہیں ۲۰'۲۵ کلومیٹر تک رینج ہے ہم کئی ہزار تیار کر چکے ہیں۔

س: کیا اس سے قبل لیزرز .... باہر سے خریدے جاتے تھے؟

ج: جی ہمارے ہاں لیزر بنانے سے قبل حکومت باہر سے ہی خریدتی تھی جب سے ہم نے لیزر بنانے شروع کئے حکومت نے باہر سے منگوانے بند کر دیئے۔

س: ڈاکٹر صاحب کبھی آپ کے ذہن میں یہ بات آئی کہ آپ نے جو تاریخی نوعیت کا کام کیا ہے اس کا کریڈٹ کسی اور کے سر تھوپ دیا جائے گا؟

ج: میں تو سیدھا سادھا انسان ہوں جس کام پر لگ جاؤں اسے مکمل کر کے چھوڑتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ خود راہ بناتا جاتا ہے۔ اس لئے اس بات کی پرواہ نہیں کہ کوئی کریڈٹ لے لے گا میں نے کریڈٹ حاصل کرنے کے لئے کام نہیں کیا میں تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر صرف پاکستان کے لئے آیا تھا۔

س: ڈاکٹر صاحب! آپ نے کام شروع کیا تو آپ کو یقین تھا کہ آپ نے جو کام شروع کیا ہے وہ پایہ تکمیل کو پہنچے گا؟

ج: بہرحال میں نے نیک نیتی سے 1976ء میں یہ کام شروع کیا کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ کام چند سالوں میں پایہ تکمیل کو پہنچے گا اللہ تعالیٰ نے یہ کام میری زندگی میں مکمل کرنا تھا سو کر دیا۔

س: کہوٹہ پلانٹ ذوالفقار علی بھٹو کے دور سے شروع ہوا پھر جنرل ضیاء الحق غلام اسحاق خان بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کا دور حکومت رہا۔ آپ اس بات کا تقابل کریں گے کہ کس دور میں سب سے زیادہ کام ہوا؟

ج: ہم نے جو کام شروع کیا تھا وہ جنرل ضیاء الحق کے دور میں ہی ختم ہو گیا تاہم ایٹمی دھماکہ کرنے کا اعزاز محمد نواز شریف کے سر ہے کیونکہ انہوں نے بین الاقوامی دباؤ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ایٹمی دھماکہ کرنے کا فیصلہ کیا تاریخ کو مسخ نہیں کیا جا سکتا۔ ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں کام شروع ہوا تھا جنرل جہانداد نے اپنی کتاب میں یہ لکھا ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو نے یہ پروگرام شروع کیا تھا لیکن ابھی ہم پلانٹ لگانے کی تیاریاں کر ہی رہے تھے کہ ملک میں مارشل لاء لگ گیا لیکن باقی تمام کام جنرل ضیاء الحق کے دور میں مکمل ہوا۔ غلام اسحاق خان اس پراجیکٹ کے براہ راست انچارج تھے پہلے ان کے ساتھ آغا شاہی پھر صاحبزادہ یعقوب علی خان ممبر تھے ان دونوں نے بہت مدد کی تھی۔

س: چاغی میں ایٹمی دھماکہ کے لئے سرنگ بنانے کا کام کب شروع ہوا؟

ج: سرنگ پر ۱۹۷۷ء سے ہی تھوڑا بہت کام شروع ہو گیا تھا یہ کام سب سے پہلے ایک بریگیڈیئر کی سربراہی میں شروع ہوا تھا۔

س: جنرل ضیاء الحق کے دور میں آپ ایٹمی دھماکہ کے لئے تیار تھے؟

ج: جی ہاں میں نے جنرل ضیاء الحق کو لکھ بھیجا تھا وہ جب چاہیں ہم ایٹمی دھماکہ کر دیں گے ان کے دور میں بعض مصلحتوں کی وجہ سے دھماکہ نہیں کیا گیا اس پراجیکٹ کی تکمیل میں ہمیشہ مالی مشکلات حائل رہی ہیں۔

س: ایٹمی دھماکہ نہ کرنے کے بارے میں حکومت پاکستان پر بڑا دباؤ تھا ایسی صورت حال میں آپ نے حکومت پاکستان کو کیا مشورہ دیا تھا؟

ج: میں نے نواز شریف کو ایٹمی دھماکہ کرنے کا مشورہ دیا اگر ہم ایٹمی دھماکہ نہ کرتے تو پھر ہمیں زندگی بھر ایٹمی دھماکہ کرنے کا موقع نہ ملتا۔ پاکستانی قوم ہمیں برا بھلا کہتی کہ ہمارے پاس صلاحیت ہے ہی نہیں۔

س: اسرائیل ایک یہودی ریاست ہے اس سے پاکستان کی سلامتی کو خطرات لاحق ہو گئے ہیں؟

ج: پاکستان پولیس مین کا کردار تو ادا نہیں کر سکتا وہ خطے کے ممالک کے لئے قوت کا باعث تو ہو سکتا ہے پاکستان کو سب سے پہلے اپنے گھر کی حالت بہتر بنانی ہے ہم نے اس بارے میں ٹھیکیداری تو لے نہیں رکھی پاکستان کو تو سب سے پہلے اپنی حفاظت کی ضرورت ہے۔ اسرائیل نے پاکستان کو کوئی دھمکی دی اور نہ ہی ہم نے ابھی تک اسے کوئی دھمکی دی ہے جنرل جمشید اور جنرل نقوی موجود ہیں ان سب کے سامنے جنرل ضیاء الحق نے کہا کہ وہ پراپیگنڈہ کر رہے ہیں۔ ایٹمی پروگرام کی ٹیکنالوجی تو میرے دماغ میں موجود ہے یہ کسی سے بطور تحفہ تو نہیں لی یہ ٹیکنالوجی میرے دماغ میں محفوظ ہے جن لوگوں نے پیسے کھائے ہیں خود حکومت کو ان کے بارے میں علم ہے۔

س: کسی مسلمان ملک کی جانب سے آپ کو ایٹمی پروگرام میں مدد کرنے کی پیش کش آئی ہے۔

ج: جی نہیں پاکستان کا ایٹمی پروگرام قوم کی امانت ہے۔ سب کو علم ہے یہ بڑی حساس ٹیکنالوجی ہے۔ کوئی کسی سے کچھ مانگ نہیں سکتا اور نہ ہی کوئی کسی کو کچھ دے سکتا ہے۔ لوگ شکایت کرتے تھے کہ پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے بارے میں تفصیلات کا پتہ چل جائے گا۔ وہ منظر عام پر لائی جائیں گی۔ پراجیکٹ میں ہزاروں افراد کام کر رہے ہیں لیکن کبھی کسی نے مجھ پر ایک انگلی بھی نہیں اٹھائی انہوں نے پراجیکٹ کی بات پراجیکٹ میں ہی رہنے دی۔

س: ڈاکٹر صاحب! آپ نے اپنی زندگی میں بہت بڑی کامیابیاں حاصل کر لی ہیں اب تو آپ سماجی سرگرمیوں کے لئے کچھ وقت نکال رہے ہوں گے؟

ج: مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ اس کام میں اتنا مصروف رہا ہوں کہ اپنے خاندان کو وقت نہ دے سکا بچے جوان ہوگئے ان کے ساتھ زیادہ وقت نہ گزار سکا ملک کی خاطر کچھ تو قربانی دینا پڑتی ہے۔ سیاچین میں ڈیوٹی دینے والے فوجیوں کے تو ہاتھ پاؤں خراب ہو جاتے ہیں آخر وہ بھی تو انسان ہیں ہم تو پھر بھی آرام دہ ماحول میں کام کر رہے ہیں۔

س: آپ کی شہرت ہے کہ آپ اپنے پراجیکٹ کے ادنیٰ کارکن سے بڑے افسر تک براہ راست رابطہ رکھتے ہیں۔ لیکن جب سے آپ کے ادارہ نے مطلوبہ اہداف مکمل کر لئے ہیں اب اپنے کارکنوں سے براہ راست رابطے میں کمی کیوں آ گئی ہے؟

ج: جب میں نے پراجیکٹ قائم کیا تو اس وقت وہاں کارکنوں کی تعداد کم تھی میرا اپنے کارکنوں سے براہ راست رابطہ تھا لیکن اب پراجیکٹ کے ۹ ہزار کارکن ہیں اور ہماری ذمہ داریوں میں بھی اضافہ ہو گیا ہے سرکاری کام بڑھ گیا ہے پہلے غلام اسحاق خان سے ون ٹو ون ملاقات ہو جاتی تھی ان سے ہفتہ عشرہ میں ایک دو گھنٹے ملاقات کر کے آتا تھا تو معاملات خوش اسلوبی سے چلتے تھے اب تو ہمیں کئی کئی افسران سے رابطہ قائم کرنا پڑتا ہے۔ حکومت سے جی ایچ کیو سمیت متعدد جگہوں پر بات چیت ہوتی ہے۔ سماجی تقریبات میں بھی جانا پڑتا ہے۔ قائداعظمؒ یونیورسٹی اور ہمدرد سمیت مختلف اداروں سے بھی رابطہ رہتا ہے کے آر ایل میں کام کرنے والے ملازمین کافی سینئر ہو گئے ہیں وہ خود بھی مسائل حل کر لیتے ہیں۔ میں گھوم پھر کر پلانٹ کا معائنہ کرتا تھا اگر کہیں کوئی پرابلم ہو تو میں اسے حل کرتا تھا اب تو ہر چیز ٹھیک طور پر چل رہی ہے۔

س: امریکہ کی طرف سے پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو رول بیک کرنے یا فریز کرنے کے لئے دباؤ ڈالا جاتا رہا اب سی ٹی بی ٹی پر دستخط کرنے کے لئے دباؤ ڈالا جا رہا ہے اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج: حکومت نے ایٹمی پروگرام پر کبھی کمپرومائز نہیں کیا سی ٹی بی ٹی پر حکومت نے مختلف سطحوں پر کمیٹیاں بنائی ہیں ان میں کام ہوتا رہتا ہے حکومت تمام تر صورتحال سے پوری طرح آگاہ ہے حکومت سی ٹی بی ٹی کے بارے میں جو بھی فیصلہ کرے گی وہ ملک وقوم کے مفاد میں ہوگا جب ہم پر ایٹمی دھماکے نہ کرنے کا پریشر ڈالا گیا تو وزیراعظم نے دباؤ قبول نہ کیا۔ ہم نے تو وزیراعظم کو اپنی رائے سے آگاہ کر دیا بعض باتیں کاغذ پر ٹھیک ٹھاک نظر آتی ہیں لیکن عملاً اس کے بدلے کچھ لینا اور کچھ دینا پڑتا ہے ایک سادہ کاغذ پر دستخط کرنے سے بات ختم نہیں ہوتی حکومت اس معاملہ پر غور کر رہی ہے جونہی کسی نتیجہ پر پہنچے گی اپنے فیصلے کا اعلان کر دے گی۔

س: حکومت نیوکلیئر ٹیکنالوجی کی برآمد پر پابندی لگانے کے لئے قانون سازی کر رہی ہے آخر اس کی کیوں ضرورت پیش آئی ہے؟

ج: پچھلے ۲۲، ۲۳ سال میں کہوٹہ پلانٹ سے ایک چیز بھی باہر نہیں گئی ہمارا ڈسپلن بہت سخت ہے اور جانچ پڑتال کا نظام بھی صحیح ہے ہر بلڈنگ میں سکیورٹی کے لوگ بیٹھے ہیں وہاں سے باہر نکلنے والی ہر چیز کا اندراج ہوتا ہے اگر مجھے ایک گرام یورینیم کی ضرورت ہو تو بھی اس کا اندراج ہوگا یہ کئی ہاتھوں سے نکل کر مجھ تک پہنچے گی۔ پھر مجھے یہ بتانا ہوگا کہ وہ یورینیم کہاں استعمال ہوئی"۔

س: کم و بیش ۱۰ سال پہلے بھارتی صحافی کلدیپ نیر نے وفاقی وزیر اطلاعات و فروغ ابلاغ مشاہد حسین کے ہمراہ آپ سے ملاقات کی تھی اس ملاقات کے حوالے سے ایک انٹرویو شائع ہوا آخر اس انٹرویو کی کیا حقیقت تھی؟ کیا آپ نے بین السطور میں بھارت کو یہ پیغام پہنچایا تھا کہ اگر اس نے پاکستان پر حملہ کیا تو پاکستان ایٹمی قوت استعمال کرنے سے گریز نہیں کرے گا"؟

ج: کلدیپ نیر سے میری ملاقات مشاہد حسین سید کی وساطت سے ہوئی تھی یہ ملاقات محض ملاقات تھی اسے انٹرویو نہیں کہا جا سکتا کلدیپ نیر کی مشاہد حسین سید سے دوستی تھی وہ ان کی شادی کی تقریب میں شرکت کے لئے آئے تھے مشاہد حسین سید نے مجھے فون کر کے کہا کہ ان کے ایک صحافی دوست بھارت سے آ رہے ہیں آپ سے ملنا چاہتے ہیں میں نے ان سے کہا کہ آپ کے دوست ہمارے دوست۔ مشاہد حسین سید کے ہمراہ کلدیپ نیر آئے

ہم نے ان کی چائے سے خاطر تواضع کی۔ کلدیپ نیر نے کہا کہ حالات کی کتنی بدقسمتی ہے کہ میں سیالکوٹ کا ہوں لیکن بھارت میں بیٹھا ہوں آپ کا تعلق بھوپال سے ہے اور آپ پاکستان میں ہیں۔ میں نے ان سے کہا اگر مہاتما گاندھی اور جواہر لعل نہرو میں ذرا سی بھی برداشت ہوتی تو شاید پاکستان نہ بنتا لیکن ہندوؤں کی تنگ نظری نے پاکستان بنایا ہے۔ کلدیپ نیر نے کہا کہ دونوں ملکوں میں نیوکلیئر ہتھیار تیار کرنے کی دوڑ لگی ہوئی ہے بھارت بڑا ملک ہے پاکستان ایک ایٹم بم بنائے گا تو بھارت ۱۰ ایٹم بم بنائے گا آپ ۱۰ ایٹم بم بنائیں گے تو وہ ۱۰۰ ایٹم بم بنائے گا میں نے ان سے کہا کہ ہمیں اتنے زیادہ ایٹم بم بنانے کی ضرورت نہیں ۴، ۵ ایٹم بم بنا لیں تو یہی کافی ہیں۔ ہم تو اپنے دشمن کو تباہ و برباد کر سکتے ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ مجھے بھارت کے ایٹمی قوت ہونے کے بارے میں کوئی شک و شبہ نہیں بھارت کو بھی ہماری ایٹمی قوت کے بارے میں کسی قسم کے شک و شبہ کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے کہا کہ بھارت بھول جائے اب کبھی سانحہ مشرقی پاکستان جیسی صورتحال پیدا ہوگی۔ نہ ہی ہم یہاں سے افغانستان اور ایران جا سکتے ہیں۔ اور ہم کراچی کی طرف جا کر سمندر میں بھی کود نہیں سکتے لہٰذا ہم اپنے وطن کے دفاع کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیں گے۔ اگر ہم تباہ ہوں گے تو بھارت بھی نہیں بچے گا۔

بشکریہ...... نواز رضا، بشارت علی سید، سہیل عبدالناصر اسلام آباد

یہ انٹرویو ہفت روزہ فیملی میگزین میں 30 مئی 1999ء کے شمارے میں شائع ہوا۔

امریکہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے تعاقب میں؟

11 ستمبر 2001ء کے روز امریکہ میں دہشت گردی کا ایک المناک حادثہ ہوا جس میں دہشت گردوں نے ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پنٹا گون سے جہاز ٹکرا کر سینکڑوں افراد کو ہلاک کر دیا۔ اس واقعہ نے صرف امریکہ ہی کو نہیں بلکہ پوری دنیا کو تہہ بالا کر دیا۔

امریکہ نے اس کا الزام اسامہ بن لادن، اسکی تحریک القاعدہ اور طالبان پر لگایا اور افغانستان پر حملہ کر کے وہاں حامد کرزئی کی حکومت قائم کر دی۔ امریکہ نے افغانستان کو مانیٹر کرنے کے لئے اپنی افواج، سی آئی اے اور ایف بی آئی کی ایک کثیر فوج پاکستان میں بھی اتار دی۔ یہ وہی حالات تھے جن کا ذکر اس کتاب کے محرکات میں نمایاں تھا کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو کہوٹہ کے منظر سے ہٹانا امریکی دباؤ کا نتیجہ تھا۔ لیکن امریکہ کس مقصد کی خاطر یہ کام کر رہا تھا، 11 ستمبر کے واقعہ کے بعد وہ کھل کر سامنے آ گیا اور پھر ستمبر 2001ء سے مارچ 2003 تک امریکہ نے پاکستان، عراق، کوریا اور دیگر ایٹمی صلاحیت رکھنے والے ملکوں کا جو حشر کیا وہ سامنے آ گیا۔

کہوٹہ کے خالق محسن پاکستان کو بے توقیر کرنے کی سازشیں بھی دراصل اسی وسیع عالمی تغیر و تبدل کا نتیجہ نظر آتا ہے۔ کیونکہ 11 ستمبر سے پہلے ہی پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے خلاف پراپیگنڈہ تحریک شروع ہو گئی تھی تا کہ یہ باور کرایا جا سکے کہ پاکستان کا ایٹمی پروگرام خطرناک اور شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ پاکستان اپنی ٹیکنالوجی انتہا پسند اور امریکہ کے مخالف ملکوں کو فراہم کر سکتا ہے۔

پاکستان کے ایٹمی پروگرام پر دباؤ کے باعث عالمی قوتیں پاکستان کو بلیک میل کر سکتی تھیں۔ ایسے حالات میں پاکستان نے لامحالہ اپنے اسٹریٹیجک ایسٹ کی حفاظت پر توجہ مرکوز کر دی۔ 11 ستمبر 2001ء کے روز ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پنٹا گون کی تباہی کی اصل منصوبہ بندی کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ امریکہ نے اپنے اخبارات کو جو مہم سونپی تھی اس کی تکمیل کا مرحلہ شروع ہو گیا۔ امریکی میڈیا زیادہ تر ایف بی آئی اور سی آئی اے کے ایجنٹوں پر مشتمل ہے جو اپنی کسی بھی منصوبہ بندی سے قبل میڈیا وار شروع کر دیتے ہیں تا کہ عالمی رائے عامہ ہموار کر کے اپنے راستے صاف کئے جا سکیں۔ امریکی اخبار وال اسٹریٹ یہودی اور امریکی ایجنسیوں کا اخبار ہے جس کے کارکن صحافیوں کے بھیس میں دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ڈینیل پرل بھی اخبار سے وابستہ تھا۔

11 ستمبر 2001ء سے چند ماہ قبل ہی وال اسٹریٹ نے پاکستان کے ایٹمی پروگرام اور ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے خلاف گمراہ کن پراپیگنڈہ شروع کر دیا۔ 11 ستمبر کے وقوعہ سے ایک ماہ قبل وال اسٹریٹ نے پاکستان کے ایٹمی پروگرام اور ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا عالمی محاسبہ کرنے کے لئے خبریں لگانی شروع کر دیں کہ پاکستان نے ایران، عراق اور لیبیا کو ایٹمی ٹیکنالوجی فراہم کی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ یہ بھی الزام لگایا کہ پاکستان کے مرد آہن اور ایٹمی پروگرام کے خالق ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے خفیہ طور پر ایران کی ایٹمی لیبارٹریوں کا دورہ کر کے انہیں معلومات فراہم کی ہیں۔ وال اسٹریٹ کی ان خبروں کو بھارتی میڈیا نے خوب مرچ مسالا لگا کر اچھالا اور عالمی برادری سے مطالبہ کیا کہ پاکستان پر اقتصادی پابندیاں عائد کر دی جائیں۔

وال اسٹریٹ نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ عراق کے چینی ساختہ ایٹم بم کے لئے حساس ٹیکنالوجی پاکستان نے فراہم کی تھی۔ پاکستان عنقریب پلوٹونیم بم بنانے میں کامیاب ہو جائے گا اور اسکے میزائیلوں پر ایٹمی وار ہیڈ موجود ہیں جن کا رخ بھارت کی طرف ہے۔ ان خبروں کی اشاعت کے بعد جب راقم نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان سے رابطہ کیا تو انہوں نے ہنستے ہوئے کہا کہ یہ جھوٹی خبریں اس مقصد کے لئے شائع کی جاتی ہیں کہ پاکستان گھبرا جائے لیکن ان میں صداقت نہیں ہے۔ میں آج تک ایران نہیں گیا۔

محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان سے راقم کی جتنی ملاقاتیں ہوئی ہیں ان کے بعد یہ کہہ سکتا ہوں کہ ڈاکٹر عبدالقدیر جیسا فرض شناس انسان غیر اصولی بات نہیں کر سکتا۔ وہ کبھی ایسی حرکت نہیں کر سکتے جس سے پاکستان کی نیک نامی پر حرف آتا ہو۔

11 ستمبر کے بعد جہاں سارا عالمی منظر بدل گیا وہاں دنیا کی نظریں پاکستان پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ امریکہ نے افغانستان پر قبضہ کر لیا اور پھر پاکستان میں اپنی افواج تعینات کرنے کے بعد اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ایف بی آئی اور سی آئی اے کے ایجنٹوں نے ہمارے حساس اداروں کے ساتھ مل کر القاعدہ کے کارکنوں کو گرفتار کرنا شروع کر دیا اور پاکستان پر واضح کر دیا گیا کہ اگر کسی قسم کے تعاون سے گریز کرے گا تو نقصان اٹھائے گا۔

امریکہ کے ان عزائم کو امریکی اخبارات واضح کرتے رہے ہیں۔ انہی دنوں ایک سازش بے نقاب ہو گئی۔ 14 اور 15 ستمبر کی درمیانی شب بھارت اسرائیل کے ساتھ مل کر پاکستان کے ایٹمی پلانٹ پر حملہ کرنے والا تھا۔ لیکن پاکستان کی مستعدی کے باعث ایسا نہ ہو سکا۔ اس پر امریکی اور بھارتی اخبارات نے شور مچانا شروع کر دیا کہ پاکستان کا ایٹمی پروگرام ان بنیاد پرستوں کے ہاتھ میں ہے۔ جن کے طالبان سے گہرے رابطے ہیں۔

دراصل اس کا اشارہ بھی ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی ذات کی طرف تھا کہ ایک ایسا سائنسدان جس نے اب تک اٹھارہ کے قریب حج کئے ہوں جو نماز روزہ کا پکا اور جہاد کے فلسفہ کو تسلیم کرتا ہو ان کی کہوٹہ کے معاملات میں دخل اندازی کی وجہ سے فائدہ طالبان اٹھا سکتے ہیں اس پراپیگنڈے پر ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے واضح کیا کہ پاکستان کا ایٹمی پروگرام محفوظ ہاتھوں میں ہے لیکن اس سے مراد بنیاد پرست نہیں لینی چاہیئے۔ لیکن ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی اس یقین دہانی کے باوجود ہمارے حکام (جنہیں امریکہ نے یرغمال بنا رکھا ہے) نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو منظر سے ہٹانے کے لئے گھٹیا حرکتیں شروع کر دیں۔ انہیں کہوٹہ کے معاملات حتیٰ کہ کہوٹہ کے اندر ہونے والی تقریبات میں بھی شریک کرنے سے گریز کیا گیا۔ اس ماحول کا فائدہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی مخالف لابی نے بھی اٹھایا۔ انہوں نے امریکی دباؤ کی آڑ لیکر ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی شناخت ختم کرنے کا آغاز کر دیا اور اعلیٰ حکام کو تجاویز دینے لگے کہ کہوٹہ لیبارٹری کی پیشانی سے ڈاکٹر عبدالقدیر کا نام کھرچ دیا جائے اور لیبارٹری کا پرانا نام بحال کر دیا جائے تا کہ سلامتی کونسل کے انسپکٹروں اور امریکی خفیہ اداروں کو کہوٹہ کے اندر آنے سے روکا جا سکے۔ امریکہ سے زیادہ پاکستان میں سرگرم ایک مخصوص لابی ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے پیچھے پڑ گئی تھی جس نے اے کیو خان لیبارٹریز کا نام ختم کروا کر اسے انسٹی ٹیوٹ آف انڈسٹریل کنٹرول ICCS کرنے کی مہم تیز کر دی۔ اسوقت وہ تمام دوست احباب موقع پرست بن گئے جو محسن پاکستان کا "جوٹھا" کھاتے تھے وہ انکے خلاف زبان درازی کرنے لگے۔ اور حکومت کی خوش نودی کی خاطر ایسی تقریبات میں جانے سے گریز کرنے لگے جہاں محسن پاکستان موجود ہوتے، ان میں ایسے ایسے لوگ بھی شامل تھے جن کے شاندار کیریئر ڈاکٹر خان کے احسانات سے چمکے تھے۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو فوجی انتظامیہ "کھڈے لائن" لگانے میں کامیاب ہو گئی۔ مگر امریکی دباؤ میں پھر بھی کمی نہ ہوئی۔ ستمبر 2001ء کے آخری ہفتے میں امریکہ کے فوجی اور انٹیلی جنس افسروں کی اعلیٰ سطحی ٹیم نے امریکی فضائیہ کے بریگیڈر جنرل کیوبن چلٹن کی سربراہی میں اسلام آباد کا دورہ کیا اور پاکستان کے ایٹمی پلانٹس اور ایٹمی گوداموں کی سکیورٹی پر تشویش ظاہر کی۔ تین روزہ دورے میں امریکہ نے پاکستان کے ایٹمی پروگرام کی سکیورٹی کو مزید جدید بنانے کے لئے تجاویز دینے کی بجائے پنٹا گون اور وائٹ ہاؤس کے احکامات سے حکومت کو آگاہ کیا۔

ان حالات میں امریکہ کے انسٹی ٹیوٹ فار سائنس اینڈ انٹرنیشنل سکیورٹی تھنک ٹینک کے ڈیوڈ البرائیٹ نے امریکہ کے "اعلیٰ دماغوں" کی تشویش ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ امریکہ کبھی اس بات کا رسک نہیں لے سکتا کہ پاکستان کا سکیورٹی پروگرام بنیاد پرستوں اور نرم ہاتھوں میں ہو کیونکہ پاکستان کی ایٹمی پروگرام کی انتظامیہ میں طالبان کے ہمدرد ہیں۔

البرائیٹ نے جنرل پرویز مشرف کی بطور حکمران تعیناتی پر تشویش ظاہر کی اور کہا کہ اگر ان کی جگہ کوئی "بنیاد پرست" آ گیا تو دنیا کو شدید خطرات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ البرائیٹ نے پاکستان کے ایٹمی پروگرام پر ان نقاط کو واضح کر دیا کہ:-

☆ بھارت کے لئے اس سے بہتر وقت نہیں کہ وہ پاکستان پر حملہ کر دے۔

مگر امریکہ نہیں چاہتا کہ ایسا ہو ویسے بھارت کو اس سے زیادہ مناسب وقت نہیں مل سکتا کیونکہ اس کے بعد بھارت کو ایک مظبوط بنیاد پرست پاکستان کا سامنا کرنا پڑے گا۔

☆ پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو بھارت سے کوئی خطرہ نہیں تاہم اندرونی محاذ پر یہ انتہائی غیر موزوں ہاتھوں میں ہے۔

☆ اگر مستقبل میں امریکہ پاکستان کی ایٹمی تنصیبات کو تباہ کرنے کا ارادہ کرے گا تو امریکی فوج کو اس میں کامیابی نہیں ملے گی کیونکہ ایٹمی اسلحہ حملے سے قبل ہی محفوظ ہاتھوں میں پہنچ جائے گا۔

امریکی تھنک ٹینک اور امریکہ کے حساس اداروں کے خدشات کے پیش نظر پاکستان کے جوہری پروگرام سے وابستہ سائنسدانوں کی گرفتاری کا عمل اس بنا پر شروع کر دیا گیا کہ طالبان سے رابطے رکھنے والے سائنسدانوں سے تحقیقات کرنا ناگزیر ہے۔ اس ضمن میں پہلا نام ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا لیا گیا مگر عوام کے دباؤ اور جنرل پرویز مشرف کے خلاف شدید مذہبی ردعمل کے خیال سے ڈاکٹر عبدالقدیر ہاتھ تو نہ ڈالا گیا تاہم انہیں منظر عام سے ہٹانے کے لئے ان پر دباؤ جاری رہا۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان پر واضح کر دیا گیا کہ اس وقت اگر پاکستان نے امریکہ کا ساتھ نہ دیا بلکہ تعاون نہ کیا گیا تو پاکستان کے ایٹمی اثاثوں کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔

امریکی عزائم اور منصوبوں کی ایک جھلک اس صورت میں دکھائی گئی کہ کہوٹہ پراجیکٹ کے پہلے ڈائریکٹر سلطان بشیر الدین محمود کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان کے بعد ایٹمی توانائی کے کمیشن کے چوہدری عبدالمجید کو گرفتار کر لیا گیا۔ دونوں سائنسدانوں کو حکومت نے ستارہ امتیاز عطا کیا تھا۔ انہیں اس الزام کے تحت گرفتار کیا گیا کہ انہوں نے افغانستان

میں طالبان کے لئے تعمیراتی خدمات انجام دی تھیں جبکہ القاعدہ کو نیوکلیئر ہتھیار بنانے کے لئے مواد بھی فراہم کیا۔

پاکستانی سائنسدانوں کے القاعدہ سے رابطے ،حقیقت کیا تھی؟

امریکی اخبارات نے پاکستانی سائنسدانوں کو القاعدہ کے ایٹم بم کا موجد ثابت کرنے کی کوشش کی تو پاکستان کے دفتر خارجہ نے امریکہ کو باور کرانے کی کوششوں کی انتہا کر دی کہ پاکستانی سائنسدانوں کا القاعدہ یا اسامہ بن لادن حتی کہ طالبان سے کسی قسم کا تعلق یا رابطہ نہیں رہا۔لیکن دوسری جانب امریکی اخبارات نے یہ لکھنا شروع کر دیا کہ وہ سائنسدان جو پاکستان کے جوہری پروگرام سے وابستہ رہ چکے ہیں وہ ریٹائرمنٹ کے بعد طالبان کی مدد کرتے رہے ہیں ۔بالخصوص سلطان بشیر الدین اور چوہدری عبدالمجید کا نام سرفہرست ہے ۔ان دنوں برطانوی اخبار ٹائمز نے اپنی انٹیلی جنس رپورٹ میں الزام لگایا کہ اسامہ بن لادن نے ایٹمی مواد غیر قانونی طور پر پاکستان سے خریدا تھا ۔اس اطلاع کے مطابق ہی برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیئر خبر دار کرتے رہے ہیں کہ اسامہ بن لادن مغربی ممالک کے خلاف بدترین کاروائی کر سکتے ہیں۔

اخبارات نے یہ الزام بھی لگایا کہ اسامہ بن لادن کے ایجنٹ کئی سال سے ایٹمی سسٹم خریدنے، چرانے یا سمگل کرنے کی کوشش میں مصروف رہے ہیں تاکہ مغرب پر حملہ کیا جا سکے۔ٹائمز نے دعویٰ کیا ہے۔کہ اسامہ "گندے بم" کے لئے ریڈیو ایکٹو میٹریل حاصل کر لیا تھا۔جسے تھوڑے سے ایٹمی ہتھیاروں میں استعمال کرنے کے علاوہ اس مواد سے تھوڑے سے علاقہ میں بکھیر کر شہری آبادی میں تابکاری ہلاکتیں کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ 1993ء میں اسامہ بن لادن کے سینئر ساتھی جلال الفادی سوڈانی ملٹری کمانڈو سے خرطوم میں ملے اور جنوبی افریقہ سے افزودہ یورینیم کا ایک سلنڈر خریدنے کے لئے بلیک مارکیٹ میں ایک کروڑ بیس لاکھ ڈالر کی ڈیل کی۔القاعدہ نے روسی مافیا سے بھی ایٹمی مواد خریدنے کی کوشش کی مگر یہ کوشش "پراگ" میں اس وقت ناکام ہوگئی جب کئی کلوگرام افزودہ یورینیم پکڑی گئی۔اس تناظر میں ٹائمز نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ پاکستان کے سائنسدان سلطان بشیر الدین محمود، چوہدری عبدالمجید کا تعلق طالبان سے تھا۔چونکہ دونوں سائنسدان پاکستان کے جوہری پروگرام سے وابستہ تھے لہذا جہاں اپنی تنظیم اور تعمیر نو کے ذریعے فلاحی کام کرتے تھے وہاں اسکی آڑ میں ایٹمی صلاحیت بھی منتقل کرتے تھے۔

اکتوبر 2001ء میں امریکی اخبار نیویارکر نے ایک شوشہ چھوڑا کہ پاکستان کے ایٹمی اثاثوں کو طالبان اور القاعدہ کے ہمنوا انتہاپسندوں سے بچانے کے لئے امریکہ اور اسرائیل نے منصوبہ بنایا ہے اور اسرائیل کا ایک خصوصی یونٹ 262 یا سیارت متکل نے امریکہ میں کمانڈوز مشقیں شروع کر دی ہیں کیونکہ طالبان کے حامی آئی ایس آئی کے ارکان اپنے ہمنوا سائنسدانوں کی مدد سے 24 ایٹمی وارہیڈز اپنے قبضہ میں لے سکتے ہیں ۔ دراصل اس پراپیگنڈے کا مقصد پاکستان کو پریشر میں لانا تھا۔

نیویارکر نے بعد ازاں یہ پراپیگنڈہ بھی کیا کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان ایک انتہاپسند سائنسدان ہیں انہوں نے ایران کو ایٹمی ٹیکنالوجی کے بارے میں نہ صرف مشورے دیئے ہیں بلکہ خفیہ طور پر ایران کی ایٹمی لیبارٹریوں کا دورہ بھی کیا ہے۔

کہوٹہ اور ڈیزی کٹر بم

حقیقت تو یہ نظر آتی ہے کہ 11 ستمبر کے بعد پاکستان کے ایٹمی اثاثوں پر قبضہ کیلئے امریکی خواہشوں کے لئے راہ ہموار کرنے کے لئے امریکی اخبارات نے شرمناک کردار ادا کیا جس کے نتیجہ میں پاکستانی عوام اور سیاستدان کو نفسیاتی طور پر ان سانحات کے لئے تیار کیا جانے لگا جو کسی بھی وقت رونما ہو سکتے ہیں۔پہلے سے طے شدہ منصوبہ بندی پر درجہ بہ درجہ عمل ہوتا رہا اور پاکستان کے اہم ترین اور حساس منصوبوں سے وابستہ اہم افراد اور عوام کو باور کروا دیا گیا کہ اگر پاکستان نے امریکی معاونت سے سرگردانی کی تو ہمارے تحفظ اور فخر کی جولان گاہ "کہوٹہ" امریکہ کے ڈیزی کٹر بموں کی تجربہ گاہ بن جائے گا اور پاکستان نہتا افلاس زدہ اور غلام بن کر رہ جائے گا۔ظاہری اور خفیہ نفسیاتی جنگ کے نتیجہ میں ان لبوں کو سی دیا گیا جو کبھی کہوٹہ کے فاخر اور موجد تھے۔اس دوران یہ شوشہ بھی چھوڑا گیا کہ امریکہ گرفتار سائنسدانوں کو امریکہ لے جائے گا اور وہاں اپنے طریقہ کار کے مطابق تفتیش کرے گا۔ یہ ایسا واضح اشارہ تھا جس کی وضاحت کی ضرورت نہیں سمجھی گئی کہ یہ اشارہ کس سائنسدان کی طرف تھا۔

ان حالات میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے بہی خواہوں نے بھی ان سے الگ ہونا شروع کر دیا اور دبی دبی زبان میں کہنے لگے کہ یہ سارا "ڈرامہ" دراصل ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو خاموش کرانے کے لئے رچایا جا رہا ہے۔ڈاکٹر خان کو یہ بھی باور کرایا جاتا رہا کہ وہ انہیں امریکہ کے قہر سے بچانا چاہتے ہیں۔لیکن یہ عجیب شرمناک اور طفلانہ تسلی تھی۔ ادھر پاکستان میں ایٹمی قوت پیدا کرنے والے معمار کو "کھڈے لائن" لگایا جا رہا تھا اور دوسری طرف دہشت گرد ملک بھارت کے ایٹمی سائنسدان کو وہاں کی انتہاپسند اور مسلمانوں کا خون پینے والی چند جماعتوں نے صدارت کے لئے نامزد کر دیا تھا۔

نومبر 2001ء میں برطانوی ٹیلی ویژن سی بی ایس نے برِاعظم ایشیاء کی خبروں کی ایک ویب سائٹ "یوریانٹ" کے حوالے سے انکشاف کر دیا کہ امریکہ نے پاکستان سے 12 ایٹمی سائنس دان مانگ لیئے ہیں۔ ان سائنسدانوں میں سلطان بشیر الدین محمود، چوہدری عبدالمجید، مرزا یوسف بیگ، سلیمان اسد، محمد علی شامل تھے۔اسی دوران نیویارک ٹائمز نے ان سائنسدانوں پر الزام لگایا کہ انہیں افغانستان میں انتھراکس پھیلانے کے جرم میں گرفتار کیا گیا ہے۔کابل کے جس مکان سے انتھراکس پھیلانے والے غبارے اور دستاویزات ملیں ان کے بارے میں کہا گیا کہ پاکستانی سائنسدان وصی اکبر خان سیکٹر کے اس گھر سے متصل تین عمارتوں میں رہتے تھے۔ پاکستان کے دفتر خارجہ کے ترجمان عزیز خان اور ڈائریکٹر جنرل آئی ایس پی آر میجر جنرل راشد قریشی نے ان حالات میں مشترکہ پریس کانفرنس کی اور کہا کہ سلطان بشیر الدین محمود اور ان کے ساتھیوں نے قواعد کی خلاف ورزی کی ہے جس کی تحقیقات کی رپورٹ امریکہ کو دے دی گئی ہے۔انہوں نے امریکی اخبارات کے پراپیگنڈہ کے جواب میں پہلی بار ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا دفاع کیا اور صورتحال واضح کرتے ہوئے بتایا کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان اپنی زندگی مین کبھی ایران نہیں گئے۔وہ ذمہ دار اور انتہائی سمجھدار انسان ہیں وہ کسی کے ساتھ ایٹمی موضوع پر بات نہیں کرتے۔

محسن پاکستان کو اگر امریکہ نے مانگ لیا

دسمبر 2001ء میں بھارت اخبار ٹریبون نے ایک افسانوی شوشہ چھوڑا کہ پاکستان کے دو اہم ترین سائنسدانوں سلیمان اسد اور محمد علی کو میانمار (برما) میں پناہ کے لئے بھیج دیا گیا ہے اور اس کے لئے صدر پرویز مشرف نے میانمار کے فوجی حکمران سے استدعا کی ہے کہ انہیں پناہ دی جائے ان حالات میں بھارت نے شدومد سے پاکستانی سائنسدانوں کے خلاف پراپیگنڈہ کو ہوا دینی شروع کر دی۔جس کے ردعمل میں حکومت پاکستان نے جوابی حملہ کرنے کی بجائے پاکستانی سائنسدانوں کو پابند کر دیا کہ وہ آئندہ پاکستان کے ایٹمی پروگرام سے متعلق بیان بازیوں سے گریز کریں ۔خاص طور پر ڈاکٹر عبدالقدیر خان پر یہ پابندی لگانے کی کوشش کی گئی کہ وہ تقریبات میں جانے سے گریز کیا کریں۔

جنوری 2002ء میں جب ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے خلاف نفسیاتی جنگ عروج پر تھی تو ایک انگریزی اخبار کے ایک بدخواہ صحافی نے الزام لگایا کہ انہوں نے خفیہ طور پر اپنی این جی او ساشے کی سرگرم رکن سے شادی کر لی ہے جس پر ان کی پہلی بیوی ہنی خان ناراض ہو کر ہالینڈ چلی گئی ہیں مغربی اخبارات تو اسلام دشمنی کی وجہ سے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے پیچھے پڑے تھے لیکن اس دوران پاکستان کے چند انگریزی اخبارات نے بھی بدترین کردار ادا کیا اور ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے خلاف چھپنے والی غلط خبروں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خان پر ہاتھ ڈالنے سے قبل جب حالات سازگار ہوتے گئے تو بالآخر 5 جنوری 2002ء کو امریکی اخبار لاس اینجلس ٹائمز نے یہ انکشاف کر دیا کہ امریکہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان میں دلچسپی لے رہا ہے۔ اخبار نے الزام لگایا کہ پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے خالق ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے شمالی کوریا، ایران اور عراق کے ایٹمی پروگراموں میں مدد کی ہے۔اخبار نے لکھا کہ اگر ایک شخص تین ملکوں کے ایٹمی پروگرام کی پشت پر ہو تو اسے صدر بش کی زبان میں برائی کا محور کہیں گے۔اخبار نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی شخصیت کا پاکستان میں مقام واضح کرتے ہوئے کہا کہ عوام انہیں دلوں اور آنکھوں میں سجائے پھرتے ہیں مگر امریکہ انہیں صرف سائنسدان ہی سمجھتا ہے۔ اگر امریکہ نے تحقیقات کے لئے پاکستان سے سائنسدان مانگے تو ڈاکٹر عبدالقدیر سرفہرست ہونگے ۔رپورٹ نے دعوٰی کیا گیا ہے کہا امریکہ کے پاس ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی سرگرمیوں کی تفصیلات موجود ہیں ۔انہوں نے شمالی کوریا کا کم از کم 13 مرتبہ دورہ کیا ہے جبکہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے عراقی صدر کو ایٹمی ہتھیار بنانے کی آفر ایک خط کے ذریعے دی تھی جو مکمل ثبوت کے ساتھ امریکہ کے پاس موجود ہے۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی سرگرمیوں کے نتیجہ پر ہی صدر پرویز مشرف امریکی دباؤ میں آ گئے اور انہیں جبری ریٹائر کر دیا گیا تھا۔اخبار نے لکھا کہ امریکہ نے یہ دعوٰی کیا ہے کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے 92ء میں شمالی کوریا کے ساتھ ایٹمی ہتھیاروں کے بارے میں مذاکرات شروع کیئے تھے ۔جس میں 10 سے 12 بلیسٹک میزائیلوں کا حصول شامل تھا جبکہ پاکستان اور ایران نے 1986ء میں ایٹمی پروگرام میں ایٹمی تعاون کے معاہدے پر دستخط کئے اور 90ء میں پاکستان نے ایران کو ایٹمی ری ایکٹر کی تیاری میں امداد دی تھی۔ان معاہدات کی تحریک ڈاکٹر خان نے دی تھی۔

جنرل پرویز مشرف' ڈاکٹر قدیر کے وکیل بن گئے

پاکستان کے صدر جنرل پرویز مشرف نے ستمبر 2004ء میں امریکہ کے دورے کے دوران اگرچہ ایک بار پھر ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے بارے اپنے مؤقف اور فیصلے سے آگاہ کر دیا ہے کہ انہیں کسی دوسرے ملک کے حوالے

نہیں کیا جائے گا، ان سے جو بھی تفتیش ہوگی پاکستانی ادارے ہی کریں گے، اگر امریکہ ان کی حوالگی کے لیے زور ڈالتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اسے ہماری صلاحیتوں پر بھروسہ نہیں ہے ......مگر صورتحال ابھی تک جوں کی توں ہے۔

صدر پرویز مشرف اس سے قبل بھی امریکہ گئے حتیٰ کہ ملک سے باہر جہاں جہاں بھی گئے انہیں ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کی وکالت کرتے ہی دیکھا گیا ہے۔ گذشتہ سال اکتوبر نومبر میں جب ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کے نہایت قریبی ساتھیوں ڈاکٹر فاروق اور پھر 2004ء کے آغاز میں انکے پرسنل سٹاف آفیسر میجر اسلام الحق اور ڈاکٹر نذیر احمد کو بھی پاکستانی ایجنسیوں نے گرفتار کرلیا تو ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کی گرفتاری کا بھی باقاعدہ امکان سامنے آ گیا تھا۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کے اعمال کا حساب ان کے رفقاء سے لینے کے بعد جب ان کے پس پردہ معاملات سامنے لانے کا پراپوگنڈہ کیا جانے لگا تو پوری دنیا کی نظریں جنرل پرویز مشرف پر ٹک کر رہ گئی تھیں کہ وہ اب ان کی تقدیر کا فیصلہ کیا کرتے ہیں۔ امریکہ سی آئی اے حتیٰ کہ ایران اور لیبیا نے بھی بعض ایسے شواہد کی نشاندہی کردی تھی جن سے یہ ثابت ہونے کا امکان تھا کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خاں نے کوریا کے علاوہ ان دو ممالک کو ایٹمی قوت بنانے کے لیے ٹیکنالوجی فروخت کی اور خفیہ دورے بھی کیے اگرچہ ان ممالک نے چند دنوں بعد تردید بھی کردی لیکن مغربی میڈیا اور امریکی اسرائیلی اور بھارتی ایجنسیوں کے علاوہ پاکستان کے اندر متحرک قوتوں نے بھی جنرل پرویز مشرف پر دباؤ بڑھانا شروع کردیا کہ اگر ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو گرفتار نہ کیا گیا اور ان سے تفتیش امریکہ کی حسب ہدایات نہ کی گئی تو دہشت گردی کے خلاف فرنٹ مین ہونے کے باوجود پاکستان اور جنرل پرویز مشرف امریکہ کی نظروں سے گر جائیں گے۔ جنرل پرویز مشرف سے فکری اختلاف کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ امریکہ کی خود ساختہ چھیڑی ہوئی ''دہشت گردی کی جنگ'' میں انہوں نے عمدہ حکمت عملی کے ساتھ پاکستان کی جغرافیائی سالمیت کو بچانے کی کوشش کی ہے۔ یہ وہی دور تھا جب مغربی میڈیا نے عراق سے کیمیائی ہتھیاروں کی عدم برآمدگی کے بعد صدر بش پر دباؤ ڈالنا شروع کردیا تھا کہ صدام کے پاس سے تو کچھ نہیں نکلا لیکن امریکہ نے عراق کو تباہ کردیا' پاکستان کے ایٹمی جرائم تو ثابت ہو گئے ہیں لہذا پاکستان پر جنگ مسلط کیوں نہیں کی جارہی ہے۔ ہمارا میڈیا اور لوگ بڑے ہی معصوم ہیں۔ انہوں نے اپنی عوام کو امریکہ کے غضب اور رجحانات کی یہ تصویر دکھائی ہی نہیں ہے کہ امریکی ایجنسیاں اور پینٹاگون میں پاکستان کے خلاف کیا فیصلے ہو چکے ہیں لیکن حکومتی سنسر یا میڈیا سے گورنمنٹ کمپرومائز کی وجہ سے امریکہ کے حقیقی عزائم سے قوم کو بے خبر رکھا گیا۔ اس امریکی دباؤ کے باوجود صدر بش نے جنرل پرویز مشرف کو کیمپ ڈیوڈ میں بلایا اور پاکستان کے بارے اپنے فیصلوں سے بھی آگاہ کیا۔ صدر پرویز مشرف کچھ رعائتیں اور وقت حاصل کرکے پاکستان واپس لوٹے۔ لیکن ان کے جانے سے قبل پاکستان کے ایٹمی جرائم کا رخ تبدیل ہو گیا تھا۔ حکومت پاکستان نے ڈاکٹر عبدالقدیر خاں سے قربانی مانگ لی۔ اور انہیں اس ساری سنگین ترین صورتحال بلکہ شواہد سے بھی آگاہ کردیا گیا جو درحقیقت حکومتی مشن سے زیادہ خود ان کے اپنے صوابدیدی اور ناجائز اختیارات کی طرف اشارات کرتے تھے۔

اس میں شبہ نہیں کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خاں نے پاکستان کو ایک ایٹمی قوت بنانے کے لیے بے تحاشا اختیارات حاصل تھے۔ اگر انہیں یہ اختیارات حاصل نہ ہوتے تو پاکستان کا ایٹمی پروگرام پی ڈبلیو ڈی کی فائلوں کی نذر ہو چکا ہوتا۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خاں نے اپنی اضافی صلاحیتوں کے بل بوتے پر اپنے ذرائع استعمال کئے اور پاکستان میں ایٹمی ٹیکنالوجی منتقل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ حکومت براہ راست اس میں شامل نہیں ہوتی تھی لیکن یہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ حکومت اور ایجنسیوں کو ان حالات کا علم نہیں تھا۔ پاکستان سنگین ترین اقتصادی اور عسکری ٹیکنالوجی کی پابندیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ ایسے حالات میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے ایک ایٹمی سائنسدان کے ساتھ ساتھ کسی تجربہ کار جرنیل کی طرح ہر محاذ پر خود کفالتی کی جنگ لڑ کر جیت لی۔ پاکستان ایٹمی قوت بن گیا اور پھر جب امریکہ نے افغانستان کے راستے روس سے آزاد ریاستوں کے وسائل پر قبضہ کے لیے یہاں آنے کا فیصلہ کرلیا تو پاکستان کو خطے میں ایک اہم ملک بنانے کے بعد اسکی جغرافیائی سیاسی اور اقتصادی تبدیلیوں پر بھی زور دینے لگ گیا۔ اس دباؤ کے لیے امریکہ نے پاکستان کی سالمیت کے طاقتور ترین اور کمزور ترین پہلو پر اپنا سارا بوجھ ڈالنے کی کوشش کی اور دنیا بھر میں پاکستان کو ایک ناکام اور غیر ذمہ دار ملک ثابت کرنے لگ پڑا۔

انہی حالات میں امریکہ میں مقیم پاکستانی اور امریکی اداروں کے پروردہ بہت سے دانشور ہجرتی پرندوں کی طرح پاکستان آنے لگے اور پاکستان کو امریکہ کے عتاب اور خوفناک ارادوں سے باخبر کرنے لگے۔ اپنی نجی گفتگو کے دوران وہ بھی یہی کہتے تھے کہ امریکہ پاکستان کی ایٹمی قوت ختم کردے گا۔ کیسے ختم کرے گا؟ کب کرے گا؟ وقت اور طریقہ کار وہ خود طے کرے گا۔

اس پس منظر میں جنرل پرویز مشرف نے پاکستان کو ایک ذمہ دار ریاست ثابت کرنے کے لیے سب سے پہلے پاکستان کا نعرہ بلند کیا اور پھر اسی نعرہ کی تلوار کے زیر سایہ ڈاکٹر عبدالقدیر خاں سے قربانی مانگ لی گئی۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کے پاس کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ وہ قوم کے سامنے ٹی وی پر آئے یا لائے گئے' ان کی عزت اور ساکھ کو محفوظ بھی رکھا گیا لیکن اس وقت سب سے اہم ترین یہ نکات پیش منظر تھے کہ وہ کیا تسلیم کرنے جا رہے ہیں۔ انہوں نے قوم سے اپنے ناکردہ گناہوں کی معافی مانگی۔ قوم کی اکثریت نے اس معافی کو حکومتی جبر کہا۔ اسٹیبلشمنٹ نے تو اس معافی کو جنرل پرویز مشرف کے سامنے ڈاکٹر خان کا ''سرنڈر'' ہو جانا قرار دیا۔ کیونکہ ڈاکٹر صاحب کے قریبی حلقے 2001ء سے ہی یہ کہتے آ رہے تھے کہ جنرل پرویز مشرف اور ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کے درمیان خوشگوار تعلقات نہیں ہیں۔ ڈاکٹر خاں کسی جنرل' صدر وزیر اعظم کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے قریبی حلقوں کا یہ کہنا ہے کہ کوئی بھی شخص ڈاکٹر خاں کو انکے اظہار خیال سے نہیں روک سکتا تھا' وہ جو کہنا چاہتے کہہ دیتے اور کسی کے عہدے کا خیال رکھے بغیر کہہ دیتے تھے۔ جنرل پرویز مشرف سے ان کی نہیں بنتی تھی۔ اسلام آباد میں تو یہ تاثر اتنا مضبوط تھا کہ لوگ کہنے لگے تھے کہ ڈاکٹر صاحب اپنے دوستوں سے دور ہو گئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اور جنرل پرویز مشرف کے درمیان اگر کسی قسم کا تناؤ تھا تو وہ کبھی پریس میں نہیں آیا۔ لیکن کہا یہی جانے لگا تھا کہ جنرل پرویز مشرف کو ڈاکٹر صاحب کی گفتگو شاک گذرتی ہے اور اس کا بدلہ چکانے کا یہی وقت تھا۔ البتہ صدر پرویز مشرف نے اعلیٰ ظرفی دکھائی اور انہیں بھٹو کی مثل نہیں بننے دیا۔ انہوں نے صوابدیدی اور اعلیٰ انسانی اقدار کی خاطر نواز شریف کو بھی تختہ دار پر نہیں جانے دیا تھا...... اللہ جانے ڈاکٹر عبدالقدیر خاں سے معافی منگوانا اور دنیا بھر کے ایٹمی جرائم ڈاکٹر خاں کے کھاتے میں ڈلوا دینا کسی بدلے کا نتیجہ ہے یا حقیقتاً ڈاکٹر عبدالقدیر خاں سے ایسے جرائم سرزد ہو گئے تھے جس کے نتیجہ میں سارے طوفانوں کا رخ ان کی طرف پھیر دیا گیا تھا۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کے معافی مانگنے کے بعد جنرل پرویز مشرف نے الیکٹرانک میڈیا کے روبرو انکی معافی کے بارے واضح موقف سے آگاہ کیا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ڈاکٹر صاحب ان کے بھی ہیرو ہیں۔ لیکن ان سے غلطیاں ہوئی ہیں اور یہ سب پیسے کا کھیل تھا۔ وہ بھی آخر انسان ہیں۔ انسان سے ہوتی ہیں ایسی غلطیاں۔ لیکن ان کی کسی غلطی کی سزا پاکستان کو نہیں ملنی چاہیے۔ ہمارے لیے سب سے پہلے پاکستان کا نعرہ مقدم ہے۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خاں قوم سے معافی مانگنے کے بعد بظاہر آزاد کردیے گئے لیکن حقیقت میں وہ گھر میں نظر بند کر دیے گئے۔ ان سے ملاقاتوں پر پابندی لگا دی گئی۔ گھر کے اندر بھی سخت نگرانی ہوتی رہی۔ اخباری اطلاعات کے مطابق امریکی سی آئی اے کے سابق سربراہ جارج ٹینٹ نے بھی ڈاکٹر عبدالقدیر خاں سے تفتیش کی تھی اس کے ایک سوال پر تو ڈاکٹر خاں نے اسے شٹ اپ تک کہہ دیا تھا۔ ڈاکٹر خاں کے ساتھیوں بالخصوص ڈاکٹر نذیر احمد اور میجر (ر) اسلام الحق اور ڈاکٹر فاروق سے جس انداز میں ڈی بریفنگ کے نام پر کئی ماہ تک تفتیش جاری رہی اور اس تفتیش کی خاطر ملک بھر میں ہڑتالوں اور عدالتی احکامات تک کو بھی نظر انداز کردیا گیا تھا۔ اس دوران ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کی بھی ڈی بریفنگ کی گئی جس سے ان کی صحت گرنے لگی تو انہیں دل کی تکلیف شروع ہو گئی۔

میجر (ر) اسلام الحق کے بھائی حسام الحق کے بقول ڈاکٹر صاحب پر اسقدر دباؤ رہا کہ وہ سب اس منحوس خبر کے منتظر رہنے لگے تھے کہ نہ جانے کب کیا ہو جائے۔ انہوں نے تو اخبارات کے دفاتر اور ملک بھر کے پریس کلبوں میں اپنے خدشات کا اظہار بھی کیا اور قوم کو بتایا کہ انکے ہیرو اور محسن پاکستان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ ان کے خاموش قتل کی تیاریاں ہو چکی ہیں۔

ملک بھر میں ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کی حمایت اور انکی معافی کے باوجود امریکی میڈیا انہیں معاف نہیں کر رہا۔ پینٹاگون میں ڈاکٹر عبدالقدیر خاں اور پاکستان کا ایٹمی پروگرام القاعدہ سے بھی اہم مسئلہ ہے۔ جسے پاکستان کے صدر جنرل پرویز مشرف بھی محسوس کر چکے ہیں، اسکے باوجود وہ پاکستان کی تاریخ میں ایک نئے المناک باب کے اضافہ کو روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اللہ کرے وہ ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کی عظمت اور ملی خدمات کے معترف کے طور پر ہی تاریخ میں اپنا کردار لکھنے پر کامیاب ہو جائیں۔ ورنہ امریکہ اور پاکستان کے اندر ڈاکٹر خاں کی مخالفت لابی ہرگز انہیں سلامت نہیں دیکھنا چاہتی۔

''مجھے امریکہ کے حوالے کر دو''

ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کو 2001ء میں جس انداز میں کہوٹہ سے ہٹایا گیا اور لیبارٹری کا نام ڈاکٹر اے کیو خان تبدیل کرنے کے علاوہ حکومت نے ان کی بیگم مسز ہنی خاں کو دیے جانے والے اعلیٰ قومی اعزاز کے اعلان کو بھی واپس لے لیا تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ان پر بدعنوانیوں کے الزامات تھے۔ بظاہر تو مالی بے ضابطگیوں اور ناجائز اختیارات کو ہی آڑ بنایا گیا تھا لیکن اصل صورتحال سے ہر کوئی آگاہ تھا کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کو کہوٹہ لیبارٹریز سے بے دخل امریکہ کے کہنے پر کیا گیا تھا۔ 2001ء میں امریکہ نے افغانستان اور القاعدہ کے خلاف جنگ شروع کرنی تھی اور انہیں خدشہ تھا کہ کچھ بنیاد پرست پاکستانی سائنسدان القاعدہ اور طالبان کو ایٹمی ہتھیار فراہم کر سکتے

ہیں تو ایسے تمام امکانات کے خاتمہ کے لیے ڈاکٹر خاں اور کو کہوٹہ سے الگ کر دیا گیا تھا اس بات کا یقین ڈاکٹر عبد القدیر خاں کو بھی تھا۔ مجھ سے اسلام آباد کے گیسٹ ہاؤس اور یہاں لاہور میں بھی جب ان کے ساتھ ملاقاتیں ہوئیں تو ان کی باڈی لینگویج ان کے اندر دبی ہوئی بے چینیوں کو ظاہر کرتی تھی۔ ان کی اضطراری کیفیت یہ بتاتی تھی کہ ان کی دوربین نظریں پاکستان میں کھیلے جانے والے ایک خونی کھیل اور اسکے مضمرات کو دیکھ رہی ہیں لیکن سرکاری بندشوں کے باعث وہ زبان سے کچھ کہنے سے قاصر نظر آتے تھے۔

ان کے ساتھ گفتگو عموماً ان کی گھریلو زندگی سے متعلق ہوتی تھی لیکن جب بھی کسی سیاسی وملکی اور عالمی مسئلہ پر سوال اٹھتا تو وہ یکدم خاموش ہو جاتے۔ میں نے یہ سوال ان سے بار بار کیا "ڈاکٹر صاحب کیا آپ کو امریکہ کے دباؤ پر بنایا گیا ہے؟" تو وہ بات کا رخ بدلنے کی کوشش کرتے اور یہ بھی کہہ دیتے "ساری دنیا حقیقت جانتی ہے۔"

میرا اگلا سوال ہوتا "آپ کو امریکی دباؤ پر اگر ہٹایا گیا ہے تو اسکی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟"

ڈاکٹر خاں اس سوال کا جواب دینا چاہتے تھے لیکن کوئی ایسی بندش تھی جس کے باعث وہ کھل کر بات نہیں کرتے تھے۔

یہ ملاقاتیں امریکہ میں نائن الیون کے سانحہ سے قبل ہوئی تھیں۔ وہ لوگ جو ڈاکٹر خاں کے قریب تھے اور بے تکلف گفتگو کرتے تھے وہ پاکستان امریکہ اور ایٹمی اسکینڈل کی پس پردہ کہانیاں بھی جانتے ہوں گے۔ ڈاکٹر خاں صاحب سے میری آخری ملاقات چیف ایگزیکٹو ہاؤس میں ہوئی تھی۔ ایک گھنٹہ تک میں ان کے آفس میں رہا۔ ڈاکٹر نذیر احمد بھی موجود تھے لیکن وہ دفتری کاموں کے سلسلے میں کبھی کبھار اٹھ کر چلے جاتے تھے۔ اس ملاقات کے کچھ ہی ہفتوں بعد انکے معتمد ترین ساتھی ڈاکٹر فاروق کو غیر ملکی ایجنسیوں نے انکے گھر سے اغوا کیا تھا۔ اس ملاقات میں ڈاکٹر خاں ایک لاچار اور پژمردہ شخص کی تصویر نظر آتے تھے۔ وہ کسی کام سے خلیجی ریاست میں جانا چاہتے تھے لیکن ان کی سیٹ کنفرم نہیں کی جا رہی تھی۔ وہ برہم بھی تھے۔ گفتگو بھی چلتی رہی۔ مجھے کہنے لگے "شاہد میاں معاف کرنا میں آپ کو توجہ نہیں دے پا رہا۔ میں تو پھنس گیا ہوں"

"ڈاکٹر صاحب قوم سخت پریشان ہے آپ کی طرف سے" میں نے کہا۔

"اللہ میری قوم کو کسی مصیبت میں مبتلا نہ کرے۔"

"ڈاکٹر صاحب سنا ہے کہ امریکہ پاکستانی سائنسدانوں کے القاعدہ کے ساتھ تعلقات جوڑ رہا ہے...... آپ کے ساتھیوں کو امریکہ کے حوالے کیا جا سکتا ہے۔ اگر ایسا ہو گیا تو۔۔۔" میں نے سوال کیا۔

"بھائی میں کہتا ہوں کہ مجھے ہی امریکہ کے حوالے کر دو...... ان بے چاروں کو کیوں تنگ کرنا چاہتے ہو۔ اصل ہدف تو میں ہوں......" ڈاکٹر صاحب نے نہایت دھیمی اور بے جان مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ان کا یہ جواب ہی ایٹمی پاکستان کو درپیش مسائل کی نشاندہی کرنے کے لیے کافی تھا۔ بعد ازاں جب ڈاکٹر خاں نے قوم سے معافی مانگی تو تب بھی انہوں نے اپنے ساتھیوں کے متعلق اقرار کیا تھا کہ وہ تو ان کے احکامات اور ہدایات پر عمل کرتے تھے۔ اس میں ان بے چاروں کا کیا قصور...... لیکن سوال یہ ہے کہ ڈاکٹر خاں سے کیا قصور سرزد ہوا؟ انہیں کس جرم کی سزا دی گئی ہے؟ نیب کو مطلوب بہت سے حکومتی وزراء سے زیادہ بد دیانت تو نہیں ہیں وہ۔۔۔ سیاسی فحاشی کا حصہ اور بدعنوانیوں کے سرغنہ نہیں ہیں وہ۔ انہوں نے اپنی قوم کو بچا کھچا پاکستان مضبوط بنا کر دیا' اسے جدید ترین ٹیکنالوجی کی شاہراہ پر ڈال دیا۔ جدید تعلیمی ادارے مہیا کیے۔ اور شاید یہی ان کا جرم ہے۔ امریکہ کو ایسے لوگ ہی مطلوب ہوتے ہیں۔

اسامہ سے زیادہ خطرناک قدیر نیٹ ورک ؟

سوالات یہ ہیں کہ ایک ایسے وقت میں جب امریکہ عراق افغانستان اور القاعدہ کے خلاف جنگ لڑ رہا ہے اور دوسری طرف ایران شمالی کوریا کے ساتھ جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہے تو اتنے سنگین حالات میں ڈاکٹر عبد القدیر خان کے خلاف معاملات اچھالنے اور انہیں اسامہ کی طرح دہشت گردی کی علامت بنانے کی نوبت کیوں آئی ؟۔ اور آیا امریکہ "قدیر نیٹ ورک" کا "اسامہ نیٹ ورک" کے ساتھ کوئی تعلق جوڑنے کا اہتمام کر رہا ہے یا پھر امریکہ کو مستقبل میں پاکستان کے ساتھ اپنے معاملات کو خاص سطح پر لے جانے سے قبل ہر قسم کے خطرات کا قلع قمع کرنے کے لیے اس سے بہتر کوئی اور وقت نہیں مل رہا تھا ؟۔ بالغرض ایسی بات نکلے تو کیا ڈاکٹر عبد القدیر خان امریکہ کے لیے کسی قسم کا خطرہ بن سکتے تھے ۔؟

یہاں ایک اور سوال شدت کے ساتھ مگر معنی خیز انداز میں ابھرتا ہے کہ جب امریکہ اور پاکستان میں موجود مخصوص لابی ڈاکٹر عبد القدیر خان کو ایٹمی سائنسدان تسلیم نہیں کرتی تو پھر امریکہ کو ڈاکٹر عبد القدیر خان سے کیا خطرہ ہوسکتا ہے ۔ ایک آدمی جو ایٹم بم بنانے کی صلاحیت نہیں رکھتا تو اس سے کس قسم کا خطرہ ہوسکتا ہے ؟ کہیں یہ خطرہ محض اس نظریے کی وجہ سے تو قائم نہیں کیا جا رہا ہے کہ ڈاکٹر عبد القدیر خان بالفرض ایٹمی سائنسدان نہیں بھی ہیں تو اسکے باوجود انہوں نے اپنی صلاحیتوں کی بدولت انڈر ورلڈ سے رابطے کر کے پاکستان میں کہوٹہ پراجیکٹ کو کامیابی سے ہمکنار کر دیا تھا لہذا ایسے شخص کو جو وسائل کی کمی کے باوجود کسی ٹارگٹ کو حاصل کر سکتا ہے اس کو بہر حال ایک غیر معمولی انسان سمجھا جانا چاہیے ۔ امریکہ کے لیے پاکستان کا کوئی بھی غیر معمولی شخص ناقابل برداشت ہوتا ہے لہذا ڈاکٹر عبد القدیر خان کو معتوب قرار دیا جانا وقت کا تقاضا تھا ۔ ڈاکٹر عبد القدیر خان کو ایٹمی سائنسدان سے زیادہ اب زیر زمین ایٹمی مواد اور آلات فروخت کرنے والوں میں ایک اہم کردار کے طور پر سامنے لایا جا رہا ہے لیکن یہ کتنی عجیب بات ہے کہ امریکہ روس اور دنیا کے تمام بڑے ملکوں میں پہلے سے اس زیر زمین ایٹمی کلب کے لیے کام کرنے والے تمام بنیادی کردار یورپین اور امریکی ہیں مگر ڈاکٹر عبد القدیر خان کو ان میں سے اہم ترین کردار کے طور پر چن کر دیوار میں چننے کی کوششیں کی جا رہی ہیں تو اس کی وجوہات مختلف ہوسکتی ہیں

اول تو یہ کہ ...... یہ حقیقت ہے کہ ڈاکٹر عبد القدیر خان ہی وہ انسان ہیں جو ایٹمی ٹیکنالوجی پر دسترس رکھتے اور ایٹمی سائنسدان کی حیثیت میں کہوٹہ پراجیکٹ کو کامیابی سے ہمکنار کر چکے ہیں ۔ انکی بطور ایٹمی سائنسدان قابلیت کو ٹھکرانا بغض معاویہ کے سوا کچھ نہیں ہے ۔

دوئم :- ڈاکٹر عبد القدیر خان نے پاکستان کو سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی کی معراج پر پہنچا دیا اور یہاں بہت سے تعلیمی سائنسی ادارے قائم کئے ۔ اگر وہ یہ کام نہ کرتے تو پاکستان مزید ٹوٹ پھوٹ چکا ہوتا یا بھارت اس پر قبضہ کر چکا ہوتا ۔

سوئم :- تاریخ یہی بتاتی ہے ڈاکٹر عبد القدیر خان کو چونکہ مکمل آزادی دیکر کہوٹہ پراجیکٹ مکمل کرایا گیا تھا لہذا ان کی ان تمام صلاحیتوں کو جو ایک عام سائنسدان، حکومتوں یا اداروں کے پاس نہیں ہوتیں وہ صرف ایک شخص کی ذات میں جمع تھیں لہذا ڈاکٹر عبد القدیر خان کو پکڑ کر دنیا بھر میں پھیلے "ایٹمی نیٹ ورک" کو ختم کر دیا جائے ۔ کیونکہ یہ نیٹ ورک القاعدہ نیٹ ورک سے زیادہ خطرناک ثابت ہوسکتا ہے ۔

ڈاکٹر عبد القدیر خان کے خلاف امریکہ کے معاندانہ عزائم اور موجودہ حالات کی سنگینی کے اسباب جاننے کے لیے یہ سمجھ لینا کافی ہے کہ امریکہ نے عالم اسلام کو مکمل طور پر اپنا غلام بنانے کے لیے ایک ایسے شخص کو پکڑا ہے جو 1998ء کے بعد ان کی امیدوں کا مرکز بن گیا تھا ۔ پاکستان عالم اسلام میں واحد طاقتور اور ایٹمی قوت کا حامل ملک ہے لہذا جب پاکستان امریکہ کے سامنے "سرنڈر" کر جاتا ہے تو کسی دوسرے اسلامی ملک میں امریکہ کے سامنے نظر اٹھانے یا حق کے دفاع کی جرات نہیں رہتی ۔

امریکہ سمیت سبھی یورپی ممالک یہ حقیقت تسلیم کرتے ہیں کہ پاکستان کا ایٹمی اسکینڈل محض نظریہ ضرورت کے تحت پیدا کیا گیا ہے ورنہ اس اسکینڈل کے اصل کردار تو خود یورپ اور امریکہ میں بیٹھے ہیں ۔ پاکستان کی ایٹمی ٹیکنالوجی کی تاریخ کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ بظاہر تو امریکہ پاکستان کے تعاقب میں دوڑتا ہوا نظر آتا ہے مگر پاکستان کو ایٹمی الات پہنچانے کے لئے اس نے امریکی کمپنیوں کو تعاون کے لئے آگے بڑھا دیا ۔ اس حقیقت کا اندازہ معروف صحافی [illegible] اسمتھ کی شائع ہونے والی اسٹوری سے بھی لگایا جا سکتا ہے جس میں اس نے انکشاف کیا ہے کہ پاکستانی سائنسدان ڈاکٹر عبد القدیر خان نے اگرچہ ایٹمی راز اور آلات دنیا بھر میں فروخت کر کے مغرب کو پریشان کر دیا ہے لیکن ایٹمی آلات اور سامان کی تجارت اسلام آباد سے نہیں یورپ سے شروع ہوئی تھی جس کی تصدیق ایٹمی پھیلاؤ کی نگرانی کرنے والے ماہرین کے موقف اور عدالتی دستاویزات سے بھی ہوتی ہے اس عدالتی ریکارڈ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایٹمی صنعت سے وابستہ سائنسدان اور مغربی خفیہ ادارے کئی دہائیوں سے آگاہ تھے کہ ایٹمی ٹیکنالوجی تحفظات کے باوجود یورپ سے باہر نکالی جا رہی ہے پاکستان کے ایٹمی پروگرام سمیت ایٹمی قوت بننے کی خواہشمند دیگر اقوام کو ایٹمی آلات مواد اور معلومات فراہم کرنے والے سپلائرز اور مڈل مین کی فہرستوں سے نکالے گئے متعدد نام ایسے بھی ہیں جو یورپ کی یورینیم افزودگی کرنے والی صنعت میں اہم کھلاڑی رہے ہیں ان میں سے بعض قبل ازیں غیر قانونی برآمد کے الزام میں سزا یافتہ بھی رہے ہیں ۔ امریکی ذرائع ابلاغ کا بھی یہ الزام ہے کہ مغرب کے خفیہ اداروں نے خبردار بھی کیا تھا کہ پاکستان پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کے باوجود بعض یورپی حکومتیں پاکستان کے ایٹمی پروگرام میں مدد کرتی رہیں ۔ امریکی ذرائع ابلاغ ایٹمی اسکینڈل کے اس اہم پہلو کو اٹھانے سے گریزاں ہیں ۔ پاکستان کے ایٹمی پروگرام یا ڈاکٹر عبد القدیر خان کی مدد کرنے والے یورپی ممالک اور افراد کو کیوں مورد الزام نہیں ٹھہرایا گیا اور ان کے خلاف کارروائی سے کیوں گریز کیا گیا ۔ ڈاکٹر عبد القدیر خان کے خلاف عالمی تحقیقات میں ایک نام ارس ٹیز کا بھی ابھرتا ہے جو کہ سوئس انجینئر تھا ۔ اس نے ملائشیا میں ایک فیکٹری کے اندر Centrifuges parts کی تیاری کی نگرانی کی اس انجینئر کے والد فریڈرچ ٹیسز بھی انجینئر تھے ۔ ملائشیا کی فیکٹری میں تیار ہونے والے پارٹس درحقیقت لیبیا کیلئے تھے ارس ٹیز کے والد بھی 1970ء میں امریکی محکمہ دفاع اور بعد ازاں سوئس ایکسپورٹ کنٹرول اتھارٹی اور انٹرنیشنل اٹامک انرجی ایجنسی کی جانچ پڑتال کی زد میں رہے ہیں کیونکہ عالمی قوتوں کو شبہ تھا کہ یہ انجینئر یورینیم کو کشید کرنے کیلئے استعمال ہونے والی ٹیکنالوجی پاکستان اور عراق کو برآمد کرنے میں ملوث تھے تاہم یہ انجینئر کبھی بھی یورینیم شکنی کا مرتکب نہیں پایا گیا ۔ کہا جاتا ہے کہ اصل مسئلہ اس وقت شروع ہوا جب امریکہ سے ایٹمی آزادی کی خواہش میں برطانیہ جرمنی اور ہالینڈ نے 1970 میں المیلو پلانٹ میں سینٹری فوج کی تیاری پر رضامندی ظاہر کی تاکہ امریکہ سے آزاد تیل کے ذرائع کے مقابل ایٹمی طاقت کی صنعت کو تیار کیا جا سکے اس حوالے سے یورینیم انرچمنٹ کمپنی قائم ہوئی جس میں معاہدے میں شامل ممالک نے سینٹری فوج کی تیاری کیلئے ٹھیکیداروں پر انحصار کیا اس طرح انتہائی حساس دستاویزات ٹھیکہ حاصل کرنے والی کمپنیوں کے ہاتھوں میں چلی گئیں ۔ ڈاکٹر عبد القدیر خان بھی URENCO کی شریک ٹھیکدار کمپنی فزکس ڈائنمک ریسرچ لیبارٹری کیلئے کام کرتے تھے جنہیں پاکستانی ہونے کے باوجود انتہائی جدید نمونوں تک رسائی فراہم کر دی گئی اس طرح ڈاکٹر عبد القدیر خان نے 1972ء میں المیلو فیکٹری کا بھی دورہ کیا ۔

ڈاکٹر قدیر پر الزام ہے کہ وہ 1975ء کے آخری دنوں میں یورینیم کو افزودہ کرنے والے Centrifuges کیلئے سپلائرز کی فہرست اور بلو پرنٹس لے کر پاکستان آگئے تھے اس وقت امریکی خفیہ اداروں نے پیشن گوئی کر دی تھی کہ ڈاکٹر قدیر جلد ہی پاکستانی ایٹم بم کیلئے Centrifuges کی تیاری کیلئے ضروری آئٹمز کی خریداری شروع کریں گے ۔ اس کے فوری بعد امریکی خفیہ اداروں نے یورپ سے پاکستان ایٹمی آلات کی منتقلی کے دھارے کا پتہ لگا لیا کیونکہ ڈاکٹر عبد القدیر نے اس معاملے میں اپنے اسکول کے سابقہ ساتھیوں اور دوستوں کو بطور ایجنٹ استعمال کیا تھا ۔ ان میں ایک نام ڈاکٹر عبد القدیر کے دوست سید ابو طاہر کا بھی آتا ہے جو کہ سری لنکا سے تعلق رکھنے والا معروف بزنس مین ہے ۔ اس نے ملائشیا کی پولیس کو آگاہ کیا کہ کس طرح ڈاکٹر عبد القدیر نے ایران اور لیبیا کو ان کے ایٹمی ہتھیاروں کے پروگرام کیلئے آلات جہاز کے ذریعے منتقل کئے اور اس عوض ایران سے 3 ملین ڈالرز سے بھرے دو بریف کیس وصول کئے ۔ اس بزنس مین کا الزام ہے کہ ڈاکٹر عبد القدیر خان نے اس سے کہا تھا کہ دوبئی سے استعمال شدہ Centrifuges ایران بھیجو ۔ اس کے عوض ایرانی رابطوں کے ذریعے درہم سے بھرے دو بریف کیس فراہم کئے گئے جو دوبئی میں واقع ڈاکٹر عبد القدیر خان کے گیسٹ ہاؤس میں پہنچائے گئے ۔ واضح رہے کہ یہ وہی طاہر ہے جسے صدر بش نے اپنی تقریر میں ایٹمی نیٹ ورک کا سربراہ اور منی لانڈر قرار دیا تھا تاہم ملائشیا کی پولیس کا کہنا ہے کہ طاہر زیر نگرانی ہے لیکن وہ تحویل میں نہیں ہے اور نہ ہی اس پر کوئی مقدمہ قائم کیا گیا ہے ۔ ملائشین پولیس کی رپورٹ کے مطابق طاہر نے انکشاف کیا تھا کہ دیگر مڈل مین کا تعلق جرمنی ترکی سوئزلینڈ اور برطانیہ سے ہے جو کہ طویل عرصے سے ڈاکٹر عبد القدیر کو جانتے ہیں ۔ یہاں سوال یہ ہے کہ طاہر سمیت دیگر مڈل مین کے خلاف امریکہ نے کارروائی کیلئے کیوں شور نہیں مچایا اور امریکی سی آئی کے دلائل اور دعوؤں سے بھی یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جوہری ہتھیاروں کی تیاری کیلئے استعمال ہونے والے آلات اور ساز و سامان سمیت مکمل ٹیکنالوجی کی خرید و فروخت میں ملوث انڈر ورلڈ کا تعلق یورپ سے ہے جبکہ یورپ اور امریکہ کی بعض کمپنیاں بھی جوہری ہتھیاروں کے پھیلاؤ میں ملوث ہیں ۔

پال گریفن ایک برطانوی تاجر ہے یہ بڑے صنعتی ممالک سے پرانی مشینری خریدتا اور پھر اسے غریب اور پسماندہ ممالک کے ہاتھوں بیچ دیتا ہے ۔ اس نے دو برس قبل ملائشیا سے دودھ خشک کرنے کا ایک پرانا پلانٹ خریدا اور اسے "بی بی سی چائنا" نامی ایک بحری جہاز میں لاد کر لیبیا لے جانے لگا ۔ یہ پلانٹ چالیس چالیس فٹ لمبے 10

کنٹینروں میں بند تھا۔ بی بی سی چائنا جب نہر سویز میں داخل ہوا تو اسے اٹلی اور جرمنی کی بحری فوج نے روک لیا' جہاز کی تلاشی لی گئی' پال گریفن کے کنٹینر کھولے گئے تو اس میں پرانی مشینری کی جگہ جدید سینٹری فیوج سسٹم کے پرزے ملے۔ تحقیقات شروع ہوئیں تو معلوم ہوا پال گریفن نے یہ پرزے سری لنکا کے ایک تاجر بی ایس اے طاہر سے خریدے تھے' طاہر دوبئی میں کمپیوٹر کا کاروبار کرتا تھا' دوبئی میں اس کی "ایس ایم بی کمپیوٹرز" نام کی ایک فرم تھی' وہ بظاہر کمپیوٹر کے فاضل پرزے درآمد کرتا اور پھر انہیں تیسری دنیا کے ممالک میں بیچتا تھا...... لیکن باطن میں اس کا کاروبار جوہری پلانٹ کے آلات بیچنا تھا' یہ جوہری آلات اور مشینیں بنتی تھیں' یہ مشینیں پال گریفن خریدتا تھا اور پھر انہیں لیبیا کو فراہم کرتا تھا۔

پال گریفن کا تعلق ان ہزاروں کارندوں سے ہے جو اس وقت جوہری توانائی کی انڈر ورلڈ سے وابستہ ہیں۔ یہ لوگ بڑی بڑی کمپنیوں سے منسلک ہیں' کمپنیاں دنیا کے مختلف ممالک میں پرزے اور آلات بنواتی ہیں' انہیں ٹکڑوں کی شکل میں مختلف ذرائع سے متعلق ممالک تک پہنچاتی ہیں اور پھر انہی کمپنیوں کے سائنسدان' نقشہ نویس اور ڈیزائنر ان تمام پرزوں اور آلات کو جوڑ کر جوہری پلانٹ بنا دیتے ہیں۔ یہ کمپنیاں جوہری پلانٹ کسی ایک جگہ تیار نہیں کرتیں' اس کی وجہ سیکورٹی اور رازداری ہے کیونکہ اگر یہ لوگ کسی ایک جگہ پورا پلانٹ بنائیں تو چند ہی ماہ میں بین الاقوامی اداروں کی نظروں میں آ جائیں گے۔ چنانچہ یہ لوگ مختلف قسم کے پرزے' مختلف ملکوں میں تیار کرتے ہیں اور پھر انہیں وقفے وقفے سے متعلقہ جگہ پہنچاتے ہیں۔

صدر بش نے 11 فروری ۲۰۰۴ء کو امریکا کی نیشنل ڈیفنس یونیورسٹی میں خطاب کیا۔ اس خطاب کے دوران بش نے تسلیم کیا کہ یورپ اور امریکہ کی بعض فرمیں دنیا میں جوہری ہتھیار پھیلا رہی ہیں۔ صدر مشرف بھی مسلسل انڈر ورلڈ کے نعرے لگا رہے ہیں' بھارت کا بھی یہی فرمان ہے۔ رہ گئے "مجرم" ایران' لیبیا اور شمالی کوریا تو ان کا تو فرمانا ہی یہ ہے کہ ہم نے جو کچھ حاصل کیا وہ انڈر ورلڈ کا مرہون منت ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ انڈر ورلڈ ہے کیا بلا؟ یہ کس چڑیا کا نام ہے؟ نیوکلیئر کی انڈر ورلڈ اس وقت 158 کمپنیوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے اب تک صرف 78 کمپنیاں سامنے آئی ہیں جبکہ بین الاقوامی ادارے باقی 80 کمپنیوں تک ابھی نہیں پہنچ پائے۔ ان 78 کمپنیوں میں سے 24 کا تعلق امریکا' 3 کا چین' 8 کا فرانس' 17 کا برطانیہ' 6 کا روس' 5 کا جاپان' 3 کا ہالینڈ' 7 بیلجیئم' 3 کا اسپین اور 2 کا سویڈن سے ہے۔ ان 78 کمپنیوں میں سے کسی کمپنی کا تعلق کسی ملک سے نہیں' یہ ساری کمپنیاں ان ممالک میں رجسٹر ہیں اور انہیں ممالک میں کام کر رہی ہیں جو اس وقت جوہری پھیلاؤ کے خلاف ہیں۔ امریکہ میں سر فہرست ...... کمپنی وینی ویل (Woney Well) دنیا میزائل اور دوسرے مہلک ہتھیاروں کے پرزے بیچ رہی ہے۔ اسپیکٹر افزکس (Spectra Physices) ہی میٹکس (Semetex) ٹی آئی کوٹنگ (T.I.Coating) یونیس (Unisys)' سپری کارپوریشن (Sperry Corporation) ٹیکٹارنکس (Tektonix)' روک ویل (Rock Well) لی بولڈ ویکیوم سسٹم (Ley Bold Vacuam Sys)' فنی گن میٹ (Finniganmat)' ہیولٹ پیکارڈ (Hewleet Packard)' ڈوپانٹ (Dupont)' ایسٹ مین کوڈک۔ (Eastmankodac)' امریکن ٹائپ کلچر کولیکشن (Amrican Type Culture Collection) الکولک انٹرنیشنل (Alcolac International)' کنسارس (Carberus)' الیکٹرانک ایسوی ایٹس (Electronic Associates)' انٹرنیشنل کمپیوٹر سسٹم (International Computer System)' بیکٹل (Bechtel)' ازلاجک ڈیٹا سسٹم (Eziogic Data System)' کینبرہ انڈسٹریز انٹرنیشنل (Canbarra Industries International) اور ایکسل الیکٹرانکس (Axle Electronics) وہ کمپنیاں ہیں جو انڈر ورلڈ کے ذریعے پوری دنیا میں جوہری' حیاتی' کیمیائی ہتھیار اور ان کے پرزے بیچ رہی ہیں ...... لیکن امریکا ان پر پابندی نہیں لگا رہا۔ ان کمپنیوں کے دفتر روز کھلتے ہیں' امریکا بھر میں ان کے بینک اکاؤنٹس بھی موجود ہیں' ان کا سارا کاروبار کھلے عام ہوتا ہے لیکن امریکا کا کوئی ادارہ کوئی ایجنسی ان کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے نہیں دیکھتی۔ اب آپ چین کی طرف آیئے' چین کی تین کمپنیاں اس کاروبار میں ملوث ہیں۔ ان تینوں کے نام یہ ہیں۔ چائنا وان باؤ انجینئرنگ کمپنی (China Wanbao Eagineering Company) ہوائی ٹیکنالوجیز کارپوریشن (Huawei Technologies Co) اور چائنا اسٹیٹ میزائل کمپنی (China State Missile Company) یہ تینوں کمپنیاں تیسری دنیا کو ایٹمی پرزے' حیاتیاتی اور کیمیائی ہتھیار بنانے کے فارمولے اور غیر رواتی ہتھیار بیچ رہی ہیں۔ فرانس کی 8 کمپنیاں اس کاروبار میں ملوث ہیں۔ کمسریت انرجی اٹامک (Commissariat Energy Atomic)' ساکے (Seiaky)' تھامس سی ایس ایف (Thomson Cfs)' ایرو اسپیشل اینڈ میٹرا اسپیس (Aero Spatiale & Matra Espace) سربیگ (Cerbag)' پروٹیک ایس اے (Protec Sa) تھالز گروپ (Thales Group) اور سوسائٹی جنرل پورلیس ٹیکنیک نوویلس (Socity Ganeral Poules techniques nouvells) اس کالے دھندے میں شامل ہیں۔ برطانیہ کی 17 کمپنیاں اس کاروبار میں شریک ہیں' ان 17 کمپنیوں میں یورومیک لمیٹڈ (Euromacltd)' سی پلاتھ نیوکلیئر (C-Plath-marketing)' اینڈ شائر ایکسپورٹ مارکیٹنگ (And shire export marketing) انٹرنیشنل کمپیوٹر (Internationa computer system) میڈیا انٹرنیشنل (Meed International)' والٹر سمرز لمیٹڈ (Walter SomersLtd)' انٹرنیشنل کمپیوٹر لمیٹڈ (International ComputerLtd)' میٹرکس چرچل کارپوریشن (Matrix Churchill Corp) علی اشور ڈاگر (Ali Ashore Daghir)' انٹرنیشنل ملٹری سروس (International Military Service)' شی فیلڈ فورگی ماسٹرز (Shefiled Forge Master) ٹیکنالوجی ڈیولپمنٹ گروپ (Tecnology Devaelopment Group) انٹرنیشنل سگنل اینڈ کنٹرول (International Signal & Control)' ٹیرکس کارپوریشن (Terex Corporation)' ان واکو (Inwako)' ٹی ایم جی انجینئرنگ (TMG Engineering) اور ایکس وائے وائے آپریشن (XYYoptions) شامل ہیں۔ یہ تمام کمپنیاں حیاتیاتی' کیمیائی اور جوہری ہتھیاروں کے پرزے بناتی ہیں اور بیچتی ہیں۔ روس کی 6 کمپنیاں اس کاروبار میں ملوث ہیں: ان میں سوویت اسٹیٹ میزائل کارپوریشن (Soviet State Missile Co) نیکرم (Niikaism)' مارس روٹر (Mars Rotor)' لیون ویسٹ (Livin Vest)' رشیا ایوئیشن ٹریڈن ہاؤس (Russia Aviatin Trading House) اور امسر ٹریڈنگ (Amsar Trading) جیسی بڑی کمپنیاں شامل ہیں' جاپان کی پانچ کمپنیوں کے نام اس دھندے میں آتے ہیں۔ یہ پانچ کمپنیاں یہ ہیں فانک (Fanuc)' ہماما فوٹونکس (Hammamats Photoics) ہالینڈ کی 3 کمپنیاں ہیں۔ میل کیمڈ بی وی (Melchamic B.V)' کے بی ایس ہالینڈ بی وی (KBS Holland B.V) اور ڈیلیف انسٹرومنٹس این اوی (Delef Instruments N.V) بیلجیئم کی 7 کمپنیاں ہیں۔ بوہلر ایڈلستھل (Boehler Eedlstall) اینب یو کرافٹ مرکنٹائل کارپوریشن (N.V Kraft Mercont Corporarion)' او آئی پی انسٹروبل (olp instrubel) پوڈریز ریونیس بلجیجی ایس اے (Poudries Reunies Belge)' سپاٹرا (Sepatra) اور اسپین ریسرچ کارپوریشن (Space Ressearch Corporation)' اسپین کی تین کمپنیاں ہیں' ڈونابٹ (Donabat)' ٹری بام (Treblam) اور زایر (Zayer) سویڈن کی دو کمپنیاں ہیں: اے بی بی (ABB) اور سب سیانیا (Saab Scanil) یہ 10 بڑے ممالک کی وہ 78 کمپنیاں ہیں جو پوری دنیا میں کیمیائی حیاتیاتی اور جوہری ہتھیار پھیلا رہی ہیں۔ اس فہرست میں جرمن کمپنیاں شامل نہیں ہیں۔ ایف بی آئی سی آئی اے اور آئی اے ای اے کے جاسوسوں کا خیال ہے کہ دنیا میں جوہری دھندے میں ملوث کمپنیوں میں سب سے زیادہ تعداد جرمنوں کی ہے۔ جرمن لوہے کی مصنوعات بنانے میں مشہور رہیں۔ ان کا کہنا ہے جرمن کا لوہا ٹیڑھا ہوتا ہے نہ گلتا ہے اور نہ ہی اسے زنگ لگتا ہے۔

جرمن ہی وہ پہلے لوگ تھے جنہوں نے امریکا' برطانیہ اور اسرائیل کی یونیورسٹیوں میں اپنے طالب علموں کو فزکس کی تعلیم دلوائی' انہیں نیوکلیئر لیبارٹریوں میں تربیت دلوائی جب یہ لوگ جوہری سسٹم کو سمجھ گئے تو پھر انہوں نے تیسری دنیا کے سائنسدانوں کو ان سے "ٹیوشن" پڑھوانا شروع کر دی۔ ان کے یہ "ایکسپرٹ" زیر زمین دنیا جسے صدر پرویز مشرف "انڈر ورلڈ" کہتے ہیں' کے آئن اسٹائن تھے۔ یہ نیوکلیئر ایکسپرٹ نہ صرف تیسری دنیا کے ممالک کو جوہری پلانٹ لگانے پر ابھارتے تھے بلکہ انہیں تکنیکی معاونت بھی دیتے تھے۔ اے ای آئی اے کے بعض ذرائع دعویٰ کرتے ہیں کہ جرمنی 80 بڑی کمپنیاں اس دھندے میں ملوث ہیں تاہم انہوں نے ابھی تک ان کمپنیوں کے نام ظاہر نہیں کئے ان کا کہنا ہے کیونکہ ابھی تفتیش جاری ہے لہذا اس مرحلے میں ان کمپنیوں کے نام ظاہر کرنا نقصان دہ ہوگا۔

اب آتے ہیں ہم اس شخصیت یا ملک کی طرف جس نے سب سے پہلے ان کمپنیوں کے نام ظاہر کئے۔ ان کمپنیوں کے نام پہلی بار فراہم کرنے کے لیے صدر صدام حسین رضا مند ہو گئے تو انہوں نے 12000 صفحات پر مشتمل ایک دستاویزات سلامتی کونسل اور "اے ای آئی اے" کے حوالے کی' اس وقت سلامتی کونسل کی سربراہی کولمبیا کے پاس تھی' سلامتی کونسل کا سربراہ سلامتی کونسل کے آئین کے مطابق یہ فہرست پانچ مستقل ارکان امریکا' برطانیہ' فرانس' روس اور چین تک پہنچانے کا پابند تھا امریکا کو جب اس دستاویز کا علم ہوا تو اس نے سلامتی کونسل کے سربراہ کو ڈرا دھمکا کر یہ دستاویز حاصل کر لیں۔ اس کا مطالعہ کیا اور اس میں سے امریکی کمپنیوں کے نام خارج کر کے یہ واپس کر دی۔ سلامتی کونسل کے سربراہ نے "ڈی بریفنگ شدہ" یہ دستاویز آگے چاروں ممالک کو دے دی۔ پھر یہ

فہرست کسی ذریعے سے باہر نکلی تو دو ریڈیو چینل' ایک ٹیلی ویژن اور برلن کے ایک اخبار نے اسے شائع کیا لیکن اس کے بعد چند نادیدہ ہاتھوں نے اسے امریکی اخبارات تک پہنچنے نہ دیا۔

ایٹمی پھیلاؤ کے "ملزمان"؟؟؟؟؟؟

ڈاکٹر نذیر احمد

ڈاکٹر نذیر احمد ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے معتمد ترین ساتھی ہیں۔ 1998ء میں ستارہ امتیاز حاصل کرنے والے اور 2001ء میں ہلال امتیاز کیلئے نامزد ہونے والے ڈاکٹر نذیر پاکستان کی طرف سے بلیک مارکیٹ میں ایٹمی ٹیکنالوجی فروخت کرنے کے الزامات کے تحت تفتیش کیلئے حکومتی حراست میں رہ چکے ہیں۔

ڈاکٹر نذیر احمد سے میری پہلی ملاقات جولائی 2001ء میں لاہور آفس میں ہوئی۔ یہ ملاقات درحقیقت ڈاکٹر عبد القدیر خان سے میری خواہش پر کرائی گئی۔ ڈاکٹر خان سے ملاقات سے پہلے ڈاکٹر نذیر احمد مجھے ملنے نیچے آئے تو ڈاکٹر فاروق بھی ان کے ہمراہ تھے۔ ڈاکٹر فاروق مجھے دیکھ کر بے ساختہ بولے۔

"بھئی آپ تو تصویر سے بہت مختلف ہیں۔ لگتا ہے مارکیٹ کے لیے کتاب پر جوانی کی تصویر لگادی ہے"۔ ڈاکٹر فاروق کی سادگی اور شگفتگی دیکھ کر میں مسکرا دیا اور کہا" جی درست فرمایا۔ یہ تصویر میری شادی کے موقع پر بنی تھی۔ اب تو چار سال پرانا ہو گیا ہوں"۔

ڈاکٹر نذیر احمد مجھے اپنی راہنمائی میں ڈاکٹر خان کے کمرہ میں لے گئے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میری نظر ڈاکٹر خان پر پڑی جو بیقراری سے کمرے میں شیر کی مانند ٹہلتے دکھائی دے رہے تھے۔ ڈاکٹر خان سے ملاقات کے دوران ڈاکٹر نذیر احمد ہمارے پاس خاموش بیٹھے رہے۔ میں نے اپنی کتاب "ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور ایٹمی پاکستان" کا اولین نسخہ انہیں پیش کیا اور گذارش کی کہ اگر مجھے آپ کچھ وقت عنایت کر دیں تو میں اس کتاب کے نئے ایڈیشن میں اضافے کرنا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے نہایت دوستانہ انداز میں ڈاکٹر نذیر احمد سے مشورہ کیا اور مجھ سے دریافت کیا کہ میں کب اسلام آباد آ سکتا ہوں۔ میں نے اگلی اتوار کو اسلام آباد آنے کی خواہش ظاہر کی اور پھر میں جب اسلام آباد پہنچا تو سب سے پہلے میری ڈاکٹر نذیر احمد سے ہی ملاقات ہوئی۔ یہ ان سے دوسری ملاقات تھی۔ نہایت سنجیدہ، شائستہ مزاج انسان ثابت ہوئے۔ ڈاکٹر خان سے یہ ملاقات کم و بیش دو گھنٹے تک رہی۔ اسکے بعد ڈاکٹر نذیر احمد کے ساتھ میری دلی قربت بڑھ گئی۔ ان کی عظمت اور شرافت دیکھ کر مجھے قطعی گمان نہیں ہو رہا تھا کہ میں ایک کوہ گراں انسان کے ہمزاد سے مل رہا ہوں۔ ڈاکٹر خان کی شخصیت کو جاننے اور پرکھنے کے لیے میں نے ڈاکٹر نذیر احمد سے طویل گفتگو کی۔ واپسی پر جب میں نے کتاب کے اضافی ابواب لکھے تو ڈاکٹر نذیر احمد سے کی گئی "گفتگو عکس قدیر" کے باب میں شامل کر دی۔

ڈاکٹر نذیر احمد جب بھی لاہور آتے یا میں اسلام آباد گیا ان سے آدھی اور پوری ملاقات ہوتی رہی۔ یہ 2004ء کے آغاز کی بات ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد سے فون پر میری بات ہوئی تو میں نے بے ساختہ کہہ دیا"۔ ڈاکٹر صاحب! آپ کی باری لگ چکی ہے"۔

"شاہد! میری بات یاد رکھنا۔ ہمارے سائنسدانوں نے کبھی کوئی ایسا کام نہیں کیا جس سے پاکستان کی عزت اور دفاع پر حرف آتا ہو"۔

میں نے کہا" ڈاکٹر صاحب! حکومت ڈاکٹر خان کو قربانی کا بکرا بنا رہی ہے گی۔ آپ کیا سمجھتے ھیں آپ لوگ بچ جائیں گے۔ آپ تو دن رات ان کے ساتھ رہے ہیں"۔

اس پر ڈاکٹر صاحب خاموش ہو گئے اور باتوں کا رخ بدل دیا۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ اسلام آباد کی فضاؤں کا رخ بدل چکا ہے۔ وہ ہوائیں جو کبھی ان کے در و دیوار پر ممتا کی طرح بوسے دیتی تھیں وہ قہر آلود ہو چکی ہیں۔

ان دنوں ڈاکٹر فاروق گرفتار ہو چکے تھے۔ کسی اخبار نویس کو ان کی گرفتاری کی خبر شائع کرنے کی جرات نہ ہوئی لیکن چند محب وطن صحافیوں نے بے خوف ہو کر ڈاکٹر فاروق کی گرفتاری کی خبر شائع کر دی اور پھر پوری قوم کے سامنے یہ عقدہ کھل گیا کہ ڈاکٹر فاروق جنہیں غیر ملکی ایجنسیوں نے ان کے گھر سے اغوا کیا تھا بعد ازاں وہ پاکستانی ایجنسیوں کی تحویل میں دے گئے تھے۔ اس اضطراب و کرب کے دور میں تمام سائنسدانوں پر قیامت گذر رہی تھی۔ ڈاکٹر نذیر احمد بہر حال نہایت حوصلہ مند دکھائی دیتے رہے۔ فون پر بات ہوتی تو ہمیشہ کہتے کہ اللہ پر بھروسہ رکھیں۔ انشاء اللہ یہ سائنسدان سرخرو ہو کر نکلیں گے۔

ڈاکٹر نذیر احمد اور پھر میجر اسلام الحق کی گرفتاری نے تو ساری صورتحال کو کلیئر کر دیا کہ اب ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے گرد شکنجہ مضبوط کر دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد ڈاکٹر فاروق اور میجر اسلام الحق کی گرفتاری سے پورے ملک میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ احتجاجات شروع ہوئے عدلیہ کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ مگر کسی سائنسدان کو آزاد نہیں کیا گیا۔

ڈاکٹر نذیر احمد نے 1947ء میں ایک متوسط گھرانے میں جنم لیا۔ چار بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ بچپن سے ان کو جاننے والے انہیں "بے انتہا ذہین و فطین" کہتے ہیں۔ بچپن میں وہ شام کے کھانے کے بعد پڑھائی کیلئے آدھی رات تک کسی سٹریٹ لائٹ کی تلاش کرتے تھے کیونکہ ان کے گھر بجلی نہیں تھی۔ دن میں بیشتر وقت گھر کی چھت پر یا نزدیکی پارک میں پڑھائی کرتے ہوئے گزرتا۔ اپنے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کیلئے نذیر احمد کو کالج کے بعد کام بھی کرنا پڑا۔ ان کی محنت رنگ لائی اور انہوں نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کر کے یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کے میٹلرجیکل ڈیپارٹمنٹ میں داخلہ لے لیا جہاں سے 1969ء میں ڈگری کے حصول کے بعد انہیں لاہور فیکٹری میں بطور انجینئر نوکری مل گئی۔ 1971ء میں وہ ٹریننگ کیلئے جرمنی چلے گئے۔ اپنا کورس مکمل کر کے واپس آ تو گئے لیکن دل میں کسی مغربی یونیورسٹی سے پوسٹ گریجویٹ ڈگری کی خواہش زور پکڑ گئی۔

انتھک لگن کے باعث قسمت نے ساتھ دیا اور انہیں برمنگھم یونیورسٹی سے میٹلرجی میں پی ایچ ڈی کرنے کیلئے فل سکالرشپ مل گیا۔ 1979ء میں فزیکل میٹلرجی میں ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد وہ امریکہ چلے گئے جہاں انہیں ایک پرکشش نوکری مل گئی۔ چار سال بعد واپس وطن آئے تو اس وقت پاکستان کا ایٹمی پروگرام ڈاکٹر قدیر خان کی زیر نگرانی تجرباتی مراحل میں تھا۔ ڈاکٹر قدیر خان کی پیشکش پر انہوں نے 1983ء میں کے آر ایل میں پرنسپل انجینئر کی حیثیت سے کام شروع کر دیا۔ اپنے اس اقدام کو وہ حب الوطنی پر مبنی فیصلے سے تعبیر کرتے تھے کیونکہ انہیں پرکشش تنخواہ اور بے پناہ مراعات سے محروم ہونا پڑا۔

کے آر ایل کی 21 سالہ نوکری میں انہوں نے 16 سال ڈاکٹر قدیر خان کے معاون کے طور پر گزارے۔ 1988ء میں ڈاکٹر نذیر کو اپنی صلاحیتیں اجاگر کرنے کا موقع اس وقت ملا جب انہیں ایڈوانسڈ میٹریلز پر بین الاقوامی سمپوزیم منعقد کرنے کیلئے کہا گیا۔ اس سمپوزیم کی شاندار کامیابی ڈاکٹر قدیر خان کے ساتھ ڈاکٹر نذیر کے قریبی تعلق کی بنیاد بنی۔ 1990ء میں انہیں ڈپٹی ڈائریکٹر کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ انہیں 1998ء میں ستارہ امتیاز پیش کیا گیا اور اسی سال پاکستان نے ایٹمی دھماکے کر کے اپنا نام ایٹمی طاقت کی حیثیت سے رقم کروا لیا۔ 2001ء میں انہیں 21ویں گریڈ میں ترقی دی گئی اور ہلال امتیاز کیلئے نامزد کیا گیا۔ اسی سال ڈاکٹر قدیر خان کو ریٹائر کر کے صدر کا مشیر مقرر کیا گیا اور ڈاکٹر نذیر کو میٹلرجی ڈیپارٹمنٹ میں چیف انجینئر کے طور پر ٹرانسفر کر دیا گیا۔

اپنے خاندان اور دوستوں میں انہیں ایک ایسا خوددار انسان سمجھا جاتا ہے جس نے حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہو کر کے آر ایل کے لئے کام کرتے ہوئے روحانی تسکین محسوس کی۔ ان کے ماتحت' ہمسائے اور ملازمین انہیں دیانتدار' عاجز اور خوش اخلاق انسان قرار دیتے ہیں اور انہیں ایک مذہبی آدمی سمجھتے ہیں۔ ان کی اہلیہ اور بیٹیاں بھی ان کے دفتری معاملات اور بیرونی دوروں کی نوعیت سے بے خبر رہیں ان کی اہلیہ طاہرہ کہتی ہیں "ڈاکٹر صاحب ہمیشہ مجھے یہی کہتے تھے کہ کراچی جا رہا ہوں اور میں اس پر یقین کر لیتی تھی"۔ ڈاکٹر نذیر اسلام آباد میں F-10-/3 کے ایک گھر میں رہتے ہیں جس کا ایک پورشن کرائے پر دیا گیا ہے کیونکہ بچوں کے تعلیمی اخراجات تنخواہ میں پورے کرنا مشکل تھے۔ انہیں اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کو لاہور انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ سائنسز کے بجائے ایک مقامی ادارے میں داخل کرانا پڑا کیونکہ اس کے لئے ان کے پاس معاشی وسائل نہیں تھے۔ سالوں میں کمائی گئی عزت اپنی جگہ لیکن ان کا ایک فخر یہ بھی ہے کہ وہ اندرون لاہور کے پسماندہ ترین علاقے سے تعلق رکھنے کے باوجود ترقی کی اعلیٰ ترین منازل تک پہنچے۔

ڈاکٹر نذیر احمد کی ساری زندگی جدوجہد اور قوت ایمانی سے عبارت ہے۔ میں جن دنوں ڈاکٹر عبدالقدیر خان سے ملاقات کے لیے گیا تھا تو ڈاکٹر نذیر احمد مجھے اڈے پر ڈراپ کرنے گئے۔ ان سے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ اس دوران وہ مختلف دکانوں پر رک رک کر پھل سبزی اور گھریلو سامان خریدتے رہے۔ یہ چھٹی کا دن تھا۔ ڈاکٹر صاحب کہنے لگے کہ میں گھر کا سارا کام خود کرتا ہوں۔

آج میں سوچتا ہوں ایک ایسا شخص جو اپنے گھر کے لیے سبزی خرید کر خود لاتا ہے اسے نوکر چاکر کی سہولت نہیں ہے وہ پاکستان کے ایٹمی اسکینڈل میں کیسے ملوث ہو سکتا ہے۔ ان کے ہاں تو اب بھی غربت ہے۔ بقول صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف گرفتار سائنسدانوں نے پیسے کے لالچ انڈر ورلڈ کے لیے کام کیا ہے' ذہن یہ بات قبول نہیں کرتا

۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔

اسلام آباد میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان صاحب سے ملاقات کے دوران ان کے بنی گالہ کے گھر کے بارے باتیں ہو رہی تھیں کہ ڈاکٹر خان بولے۔

"نذیر تم بنی گالہ میں ایک دو کنال کا پلاٹ کیوں نہیں لے لیتے۔ کافی سستی جگہ ہے۔ آٹھ لاکھ میں کنال مل جائے گا"۔

اسلام آباد کے پہلو میں راول جھیل کے کنارے بنی گالہ ایک پوش آبادی ہے۔ وہاں ایک سستا پلاٹ خریدنا ہر ایک صاحب حیثیت انسان کا خواب ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد ڈاکٹر عبد القدیر خان کی بات سن کر پھیکے سے انداز میں مسکرائے اور کہا۔

"ڈاکٹر صاحب! میرے پاس تو پانچ مرلے کا پلاٹ خریدنے کے لیے پیسے نہیں ہیں"۔ ڈاکٹر نذیر احمد حقیقتاً ایک درویش منش اور محب وطن انسان ہیں۔ انہوں نے اپنا سارا کیریر ڈاکٹر عبد القدیر خان پر نچھاور کر دیا ہے انہیں ڈاکٹر خان سے الگ کرنے کے لیے بہت سی ترغیبات دی جاتی تھیں۔ اگر وہ ابن الوقت ہوتے تو یقیناً آج کہوٹہ کے سب سے اونچے عہدے پر متمکن ہوتے کیونکہ وہ سب سے سینئر ہیں لیکن محسن پاکستان کو جب کہوٹہ کے معاملات حتیٰ کہ ان سے تمام اعزازات چھیننے کے درپے لوگوں نے ان سے بے وفائی کی تو ڈاکٹر نذیر احمد ان وفا شعار لوگوں میں سب سے نمایاں تھے جو ڈاکٹر خان کے ساتھ ساتھ رہے۔

ڈاکٹر نذیر احمد کی گرفتاری کے کچھ دنوں ان کی صاحبزادی صائمہ عادل نے مجھے فون کیا تو میں نے کہا "پیاری بہنا جو لوگ اپنا خون پسینہ ملک کی ترقی کے لیے نچھاور کرتے ہیں انہیں اس ترقی کو قائم رکھنے کے لیے مزید قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ انشاء اللہ آپ کے ابو سرخرو ہو کر واپس آئیں گے۔ ہم ہی نہیں پوری قوم ڈاکٹر نذیر احمد جیسے سپوتوں کو سلام کرتی ہے"۔

نسیم الدین (ڈائریکٹر جنرل پروڈکشن اینڈ کوالٹی کنٹرول)

59 سالہ نسیم الدین تکنیکی طور پر برطانیہ اور جاپان کے جدید ترین مراکز سے تربیت یافتہ مکینیکل انجینئر ہیں جو گزشتہ 24 سال سے کے آر ایل کیلئے خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ 1999ء میں انہیں صدر رفیق تارڑ نے صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی پیش کیا۔ اگلے سال انہیں ملک کیلئے خدمات کے پیش نظر ڈاکٹر عبد القدیر خان میڈل بھی دیا گیا۔

ڈاکٹر محمد فاروق

ڈاکٹر محمد فاروق 1975ء میں کے آر ایل کے قیام کے وقت سے اس میں کام کر رہے ہیں اور اس کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے ایم ایس بارڈنگ برطانیہ سے انڈسٹریل آٹو میشن اور ماس پروڈکشن میں سپیشلائزیشن کی اور پھر برٹش یونیورسٹی سے مکینکل میں پی ایچ ڈی کی۔ "انجینئرنگ میٹریل اینڈ ایکوپمنٹ ڈویژن" کے ڈائریکٹر جنرل کی حیثیت سے وہ پورے پلانٹ کے نظام کو برقرار رکھنے کے ذمہ دار تھے۔ انتہائی جدید ترین نیوکلیئر ٹیکنالوجی اور انتہائی پیچیدہ مشینوں اور پرزہ جات کی تیاری میں ان کی بے پناہ مہارت نے کے آر ایل کے منصوبوں کی تکمیل میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کی قابل قدر خدمات کے اعتراف کے طور پر انہیں ملک کے دو اعلیٰ ترین اعزازات یعنی 1997 میں ستارہ امتیاز اور 2001ء میں ہلال امتیاز پیش کیے گئے۔ ان کی ریٹائرمنٹ سے دو روز قبل کے آر ایل کے چیئرمین ڈاکٹر عبد القدیر خان نے ایک تعریفی خط میں لکھا "وہ میرے نہایت قریبی ساتھی تھے اور میں نے انہیں نہایت فرض شناس، پرعزم اور محنتی پایا ہے"۔ ڈاکٹر قدیر نے یہ بھی اعتراف کیا کہ "ڈاکٹر فاروق نے اپنے ذاتی مفادات اور نجی زندگی کو کہوٹہ پراجیکٹ کی تیز رفتار اور کامیاب تکمیل پر قربان کر دیا ہے"۔

12 مارچ 1949 کو پیدا ہونے والے ڈاکٹر فاروق ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ابتدائی تعلیم انہوں نے ایبٹ آباد میں واقع اپنے آبائی قصبے سے حاصل کی۔ یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی پشاور سے انہوں نے مکینیکل انجینئرنگ میں تیسری پوزیشن لی۔ ڈاکٹر فاروق کے آر ایل کے سینئر ترین ڈائریکٹر جنرل ہیں اور موجودہ چیئرمین کے ساتھ 2006ء میں ریٹائر ہونے کے بعد اس عہدے کے مضبوط ترین امیدوار تھے وہ اپنے دو بھائیوں سمیت راولپنڈی کے ایک گنجان آباد علاقے میں 5 کمروں کے ایک گھر میں رہتے ہیں۔ بیرون ملک چھٹیاں گزارنے کا ذکر ہی کیا ان کے خاندان نے کبھی ملک کے اندر بھی سفر نہیں کیا۔ ان کے سب سے بڑے بیٹے 25 سالہ عاصم نے صرف ایک بار لاہور دیکھا ہے۔ 27 نومبر 2003ء کو انہیں انکے گھر سے گرفتار کیا گیا تھا جبکہ ان کے ساتھ کہوٹہ کے ڈائریکٹر یاسین چوہان ایٹمی سائنسدان محمد زبیر اور سعید وغیرہ سمیت 6 اہم افراد کو گرفتار کیا گیا تھا۔ مجھے ڈاکٹر فاروق کی گرفتاری کا علم دسمبر کے آغاز میں ہی ہو گیا تھا پہلے ڈاکٹر فاروق کی والدہ انتقال کر گئی تھیں والدہ کی تدفین کے بعد وہ جونہی راولپنڈی آئے ایجنسیوں نے انہیں گرفتار کر لیا۔ اس وقت یہ بات سامنے آئی تھی کہ انہیں FBI کے دو انگریز افسروں نے اغوا کیا تھا جو بلٹ جیکٹس پہنے ہوئے تھے۔ اس وقت ڈاکٹر فاروق کی سیکیورٹی پر مامور افراد غائب ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر فاروق کی گرفتاری کے بعد ایٹمی سائنسدانوں کے خاندانوں پر قیامت گزر گئی۔ ڈاکٹر فاروق چونکہ روز اوّل سے کہوٹہ سے وابستہ ہیں۔ اسکی تعمیر سے لیکر اسکے حساس ترین پراجیکٹ میں ان کی شرکت تھی لہذا انہیں گرفتار کر کے ڈاکٹر عبد القدیر خان کے خلاف جرائم کی فہرست" تیار

اسلام آباد کے پہلو میں راول جھیل کے کنارے بنی گالہ ایک پوش آبادی ہے۔ وہاں ایک سستا پلاٹ خریدنا ہر ایک صاحب حیثیت انسان کا خواب ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد ڈاکٹر عبد القدیر خان کی بات سن کر پھیکے سے انداز میں مسکرائے اور کہا۔

"ڈاکٹر صاحب! میرے پاس تو پانچ مرلے کا پلاٹ خریدنے کے لیے پیسے نہیں ہیں"۔ ڈاکٹر نذیر احمد حقیقتاً ایک درویش منش اور محب وطن انسان ہیں۔ انہوں نے اپنا سارا کیریر ڈاکٹر عبد القدیر خان پر نچھاور کر دیا ہے انہیں ڈاکٹر خان سے الگ کرنے کے لیے بہت سی ترغیبات دی جاتی تھیں۔ اگر وہ ابن الوقت ہوتے تو یقیناً آج کہوٹہ کے سب سے اونچے عہدے پر متمکن ہوتے کیونکہ وہ سب سے سینئر ہیں لیکن محسن پاکستان کو جب کہوٹہ کے معاملات حتیٰ کہ ان سے تمام اعزازات چھیننے کے درپے لوگوں نے ان سے بے وفائی کی تو ڈاکٹر نذیر احمد ان وفا شعار لوگوں میں سب سے نمایاں تھے جو ڈاکٹر خان کے ساتھ ساتھ رہے۔

ڈاکٹر نذیر احمد کی گرفتاری کے کچھ دنوں ان کی صاحبزادی صائمہ عادل نے مجھے فون کیا تو میں نے کہا "پیاری بہنا جو لوگ اپنا خون پسینہ ملک کی ترقی کے لیے نچھاور کرتے ہیں انہیں اس ترقی کو قائم رکھنے کے لیے مزید قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ انشاء اللہ آپ کے ابو سرخرو ہو کر واپس آئیں گے۔ ہم ہی نہیں پوری قوم ڈاکٹر نذیر احمد جیسے سپوتوں کو سلام کرتی ہے"۔

نسیم الدین (ڈائریکٹر جنرل پروڈکشن اینڈ کوالٹی کنٹرول)

59 سالہ نسیم الدین تکنیکی طور پر برطانیہ اور جاپان کے جدید ترین مراکز سے تربیت یافتہ مکینیکل انجینئر ہیں جو گزشتہ 24 سال سے کے آر ایل کیلئے خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ 1999ء میں انہیں صدر رفیق تارڑ نے صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی پیش کیا۔ اگلے سال انہیں ملک کیلئے خدمات کے پیش نظر ڈاکٹر عبد القدیر خان میڈل بھی دیا گیا۔

ڈاکٹر محمد فاروق

ڈاکٹر محمد فاروق 1975ء میں کے آر ایل کے قیام کے وقت سے اس میں کام کر رہے ہیں اور اس کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے ایم ایس بارڈنگ برطانیہ سے انڈسٹریل آٹو میشن اور ماس پروڈکشن میں سپیشلائزیشن کی اور پھر برٹش یونیورسٹی سے مکینکل میں پی ایچ ڈی کی۔ "انجینئرنگ میٹریل اینڈ ایکوپمنٹ ڈویژن" کے ڈائریکٹر جنرل کی حیثیت سے وہ پورے پلانٹ کے نظام کو برقرار رکھنے کے ذمہ دار تھے۔ انتہائی جدید ترین نیوکلیئر ٹیکنالوجی اور انتہائی پیچیدہ مشینوں اور پرزہ جات کی تیاری میں ان کی بے پناہ مہارت نے کے آر ایل کے منصوبوں کی تکمیل میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کی قابل قدر خدمات کے اعتراف کے طور پر انہیں ملک کے دو اعلیٰ ترین اعزازات یعنی 1997 میں ستارہ امتیاز اور 2001ء میں ہلال امتیاز پیش کیے گئے۔ ان کی ریٹائرمنٹ سے دو روز قبل کے آر ایل کے چیئرمین ڈاکٹر عبد القدیر خان نے ایک تعریفی خط میں لکھا "وہ میرے نہایت قریبی ساتھی تھے اور میں نے انہیں نہایت فرض شناس، پرعزم اور محنتی پایا ہے"۔ ڈاکٹر قدیر نے یہ بھی اعتراف کیا کہ "ڈاکٹر فاروق نے اپنے ذاتی مفادات اور نجی زندگی کو کہوٹہ پراجیکٹ کی تیز رفتار اور کامیاب تکمیل پر قربان کر دیا ہے"۔

12 مارچ 1949 کو پیدا ہونے والے ڈاکٹر فاروق ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ابتدائی تعلیم انہوں نے ایبٹ آباد میں واقع اپنے آبائی قصبے سے حاصل کی۔ یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی پشاور سے انہوں نے مکینیکل انجینئرنگ میں تیسری پوزیشن لی۔ ڈاکٹر فاروق کے آر ایل کے سینئر ترین ڈائریکٹر جنرل ہیں اور موجودہ چیئرمین کے ساتھ 2006ء میں ریٹائر ہونے کے بعد اس عہدے کے مضبوط ترین امیدوار تھے وہ اپنے دو بھائیوں سمیت راولپنڈی کے ایک گنجان آباد علاقے میں 5 کمروں کے ایک گھر میں رہتے ہیں۔ بیرون ملک چھٹیاں گزارنے کا ذکر ہی کیا ان کے خاندان نے کبھی ملک کے اندر بھی سفر نہیں کیا۔ ان کے سب سے بڑے بیٹے 25 سالہ عاصم نے صرف ایک بار لاہور دیکھا ہے۔ 27 نومبر 2003ء کو انہیں انکے گھر سے گرفتار کیا گیا تھا جبکہ ان کے ساتھ کہوٹہ کے ڈائریکٹر یاسین چوہان ایٹمی سائنسدان محمد زبیر اور سعید وغیرہ سمیت 6 اہم افراد کو گرفتار کیا گیا تھا۔ مجھے ڈاکٹر فاروق کی گرفتاری کا علم دسمبر کے آغاز میں ہی ہو گیا تھا پہلے ڈاکٹر فاروق کی والدہ انتقال کر گئی تھیں والدہ کی تدفین کے بعد وہ جونہی راولپنڈی آئے ایجنسیوں نے انہیں گرفتار کر لیا۔ اس وقت یہ بات سامنے آئی تھی کہ انہیں FBI کے دو انگریز افسروں نے اغوا کیا تھا جو بلٹ جیکٹس پہنے ہوئے تھے۔ اس وقت ڈاکٹر فاروق کی سیکیورٹی پر مامور افراد غائب ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر فاروق کی گرفتاری کے بعد ایٹمی سائنسدانوں کے خاندانوں پر قیامت گزر گئی۔ ڈاکٹر فاروق چونکہ روز اوّل سے کہوٹہ سے وابستہ ہیں۔ اسکی تعمیر سے لیکر اسکے حساس ترین پراجیکٹ میں ان کی شرکت تھی لہذا انہیں گرفتار کر کے ڈاکٹر عبد القدیر خان کے خلاف جرائم کی فہرست" تیار

کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ ڈاکٹر فاروق وہی عظیم سائنسدان ہیں جو چھتیس چھتیس گھنٹے بغیر آنکھ جھپکے ڈاکٹر عبد القدیر خان کے ساتھ کہوٹہ لیبارٹری کی تعمیر میں مصروف تھے اور ان کے پاؤں میں ''چنڈیاں'' پڑ گئی تھیں۔ ڈاکٹر فاروق دین دار اور سادہ مزاج انسان ہیں۔ ان سے یہ توقع رکھنا کہ انہوں نے پیسے کے لالچ میں ایٹمی راز فروخت کرنے میں معاونت کی ہوگی محض الزام تراشی ہے۔

بریگیڈئر (ر) سجاول خان ڈی جی مینٹیننس اینڈ کنسٹرکشن

اگست 1937ء کو کلر کہار کے ایک اعزازی کپتان کے گھر پیدا ہوئے۔ وہیں سے 1954ء میں میٹرک کرنے کے بعد گارڈن کالج راولپنڈی سے پری انجینئرنگ میں ایف ایس سی کی۔ انہوں نے سول انجینئرنگ کی ڈگری لی۔ بریگیڈیئر سجاول نے کشمیر کے محاذ پر جھڑپوں کے علاوہ رن آف کچھ 1965ء اور 1971ء کی جنگوں میں بھی شرکت کی۔

بریگیڈیئر سجاول ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے کے آر ایل کو اس مقام تک پہنچانے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ ستمبر 1976ء میں جب وہ لیفٹیننٹ کرنل تھے تو انہیں کہوٹہ میں اس لیبارٹری میں تعینات کیا گیا۔ اس وقت وہ بریگیڈیئر زاہد علی اکبر کے زیر کمان سپیشل ورکس آرگنائزیشن کا حصہ تھے جو بعد میں کور کمانڈر اور واپڈا کے چیئرمین بنے۔ 1981ء میں سجاول خان کو اوکاڑہ چھاؤنی میں بھیج دیا گیا لیکن 1982ء میں وہ واپس لیبارٹری آ گئے۔ 1983ء میں جنرل ضیاء نے لیبارٹری کا دورہ کیا اور اسے اس کے بانی عبد القدیر خان کے نام منسوب کر دیا گیا۔ ان کی ریٹائرمنٹ سے صرف 5 ماہ قبل 1991ء میں ستارہ امتیاز ملٹری دیا گیا۔ اس کے بعد انہیں ڈائریکٹر جنرل مینٹیننس بنایا گیا جہاں سے وہ MII یعنی سرکاری ملازمت کے اعلیٰ ترین گریڈ تک پہنچے۔ انہیں 1991ء میں ہلال امتیاز کیلئے نامزد کیا گیا۔ وہ کے آر ایل سے 2001ء میں ریٹائر ہوئے۔

میجر اسلام الحق

میجر اسلام الحق کو آرمی سے ریٹائر ہونے کے 10 سال بعد محسن پاکستان کا پرنسپل سٹاف آفیسر رکھا گیا اور 17 جنوری کو انہیں ڈاکٹر قدیر خان کی رہائش گاہ پر سے اٹھا لیا گیا۔ 5 جنوری 1948ء کو متوسط گھرانے میں پیدا ہونے والے اسلام الحق نے سینٹ میری کالج، کیڈٹ کالج حسن ابدال میں تعلیم کے بعد فوج میں کمیشن حاصل کیا۔ اگرچہ وہ میجر کے عہدے سے آگے ترقی نہ پا سکے لیکن ان کی اے سی آر میں انہیں (Above average) قرار دیا گیا۔ 1976ء میں کیپٹن اسلام ٹیکنیشنز کی ایک ٹیم کے ساتھ تعینات ہوئے تاکہ انہیں فضائی سیکورٹی کے پہلوؤں سے آگاہ رکھیں۔ اس وقت حکومت ملک کی خفیہ ترین لیبارٹری کیلئے جگہ کی تلاش میں تھی۔ اسلام الحق اس وقت 1971ء کی جنگ میں قید کے بعد رہا ہو کر آئے تھے اور انہیں ڈھاکہ ایئر پورٹ کی حفاظت پر ستارہ جرات دیا گیا تھا۔ فوج میں ان کے کولیگز انہیں ایک پیشہ ور سپاہی اور سچا محب وطن قرار دیتے ہیں۔ ترقی کے کم امکانات کو دیکھتے ہوئے 1987ء میں انہوں نے قبل از وقت ریٹائرمنٹ کی درخواست کر دی اور راولپنڈی میں ایک فارماسیوٹیکل کمپنی چلانا شروع کر دی۔ انہیں اکتوبر 2000ء میں کے آر ایل کیلئے خدمات کے اعتراف میں ڈاکٹر اے کیو خان گولڈ میڈل بھی دیا گیا۔

بریگیڈئر (ر) اقبال تاجور سینئر ڈائریکٹر جنرل

بریگیڈیئر کے عہدے سے ریٹائر ہونے والے اقبال تاجور کا ملٹری کیریئر انتہائی شاندار ہے۔ ملٹری انٹیلی جنس کے ماہر ترین جاسوس ہونے کے ناطے وہ ملک کے حساس ترین ادارے کی سیکورٹی کے انچارج رہے۔ بریگیڈیئر (ر) تاجور کے آر ایل کے ابتدائی سالوں سے ہی اس ادارے سے وابستہ ہیں۔ ان کو فوج کی طرف سے آخری کام یہ دیا گیا کہ وہ اس ادارے کے سیکورٹی نگران بن جائیں۔ آرمی سے ریٹائر ہونے کے بعد بریگیڈیئر تاجور نے کے آر ایل میں ڈائریکٹر جنرل ایڈمنسٹریشن کے طور پر ملازمت اختیار کر لی۔ انہیں 17 جنوری کو خفیہ اداروں سے اٹھا لیا تھا۔ ان کے تینوں بیٹے فوج میں ہیں۔